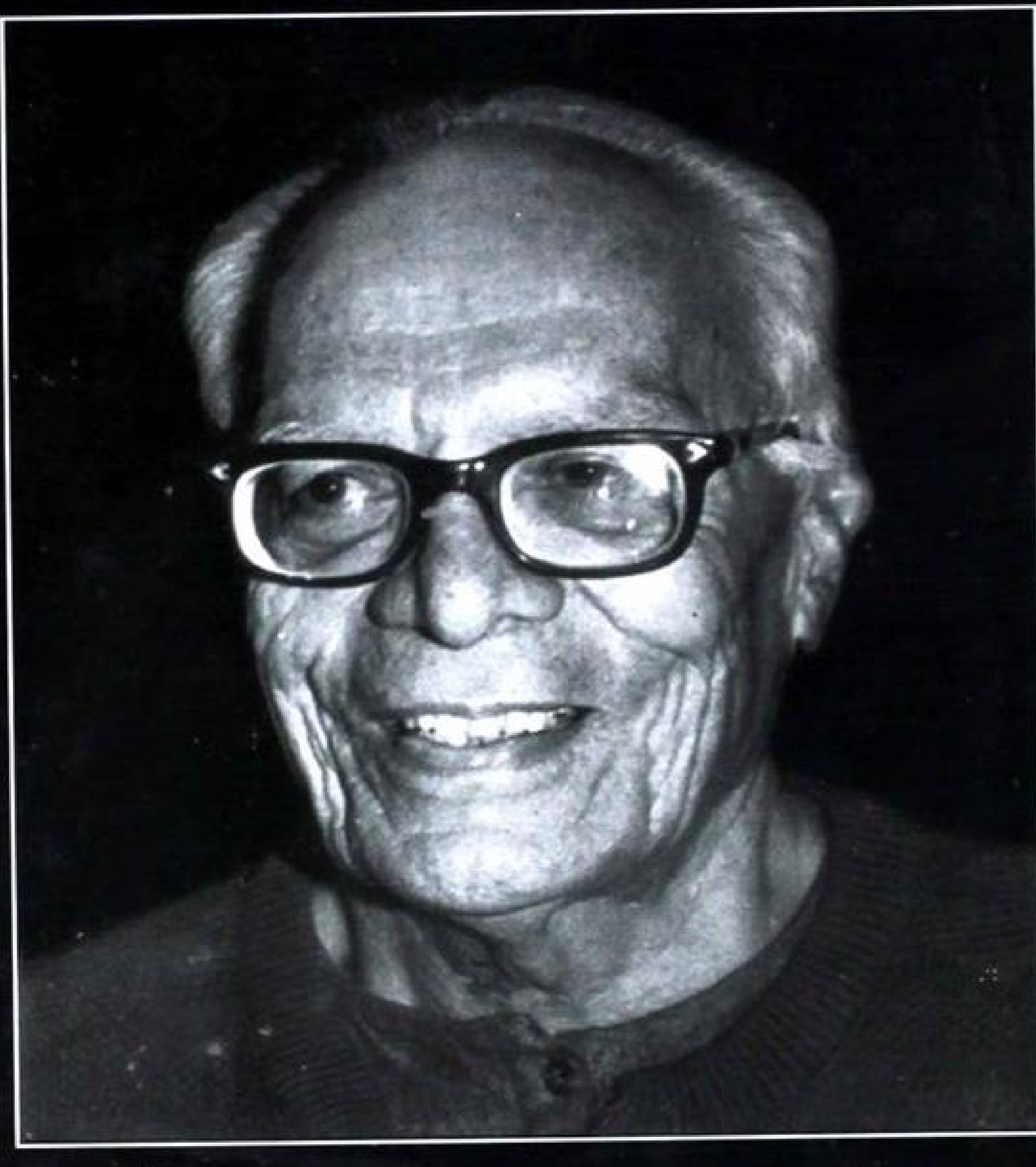
اختر حمید خاں

کومیلا سے اورنگی تک

مشاہدات و تاثرات



اختر حمید خاں

کومیلا سے اونگی تک

مشاہدات و تاثرات

اختر حمید خاں

کومیلا سے اورنگی تک

مشاہدات و تاثرات

ISBN 969-8380-13-2

اردو ترجمہ (مضامین): اختر حامد خاں

اردو ترجمہ (تعارف): ارم سلطانہ

پہلا ایڈیشن: ۱۹۹۸

سٹی پریس

اے 16، سفاری ہائٹس، بلاک 15، گلستانِ جوہر، کراچی 75290

فون: 3474 811 (92-21)

ای میل: aaj@digicom.net.pk

سیریز ایڈیٹر: اجمل کمال

کوآرڈینیٹر: ذی شان ساحل

طباعت: فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، ٹمپل روڈ، اردو بازار، کراچی

ملنے کا پتا:

سٹی پریس بک شاپ

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

ترتیب

انتساب

اپنی بیوی شفیق اور بیٹی عائشہ کے نام
جنھوں نے میرے بڑھاپے کو مسرور اور کار آمد بنایا

تعارف

عارف حسن

اختر حمید خاں کو دنیا بھر میں ہمارے زمانے کے نمایاں ترین سماجی سائنس دانوں میں سے ایک کے طور پر جانا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ ان دو کمیونٹی ڈویلپمنٹ کے منصوبوں کے خالق کی حیثیت سے معروف ہیں جنھیں بین الاقوامی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے کے دوران وہ مشرقی پاکستان میں، جو اَب بنگلہ دیش ہے، کومیلا منصوبے کے ڈائرکٹر تھے۔ ۱۹۸۰ء سے لے کر اب تک وہ کراچی کے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے ڈائرکٹر رہے ہیں۔ اورنگی اس شہر کی سب سے بڑی کچی آبادی ہے۔ یہ دونوں منصوبے مختلف حالات اور پس منظر رکھتے ہیں۔ کومیلا پروجیکٹ سرکاری شعبے میں قائم کیا گیا ایک دیہی ترقیاتی منصوبہ تھا اور اسے کئی دوفریقی اداروں کی مالی اعانت میسر تھی۔ اس کے برعکس اورنگی پائلٹ پروجیکٹ ایک شہری منصوبہ ہے جس کے لیے مالی وسائل ایک غیر سرکاری تنظیم یا این جی او نے فراہم کیے ہیں۔ اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے قیام کے کئی برس بعد ان دونوں منصوبوں کا موازنہ کرتے ہوئے اختر حمید خاں نے یہ تبصرہ کیا تھا: ''اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کومیلا اکیڈمی سے بڑی حد تک مختلف تھا۔ او پی پی ایک غیر سرکاری ادارہ تھی جو اپنے قلیل اور محدود بجٹ کے لیے ایک اَور غیر سرکاری ادارے پر انحصار کرتی تھی۔ یہ حکومت کے کثیر وسائل اور تعاون، بارورڈ سے آئے ہوئے مشیروں، اور مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی اور فورڈ فاؤنڈیشن کی اعانت سے محروم تھی۔ او پی پی کے پاس کوئی حاکمانہ اختیار نہ تھا۔ یہ مشاہدہ اور تحقیق کر سکتی تھی لیکن اس کی بنیاد پر صرف مشورہ دے سکتی تھی، کوئی چیز نافذ نہ کر سکتی تھی۔'' (۱) تاہم، ان دونوں منصوبوں میں دو اہم مماثلتیں بھی تھیں۔ ایک تو یہ کہ دونوں میں تحقیق اور توسیع کے اسی طریقے پر عمل کیا گیا جس کی وضاحت اس تعارف میں آگے چل کر کی گئی ہے؛ اور دوسرے یہ کہ اختر حمید خاں، اپنے کثیر علم اور دانش کے ساتھ، ان دونوں کے سربراہ تھے۔

کومیلا پروجیکٹ کے بارے میں اختر حمید خاں کی تحریریں بنگلہ دیش کی اکیڈمی برائے دیہی ترقی کی جانب سے آٹھ جلدوں میں مرتب کی گئی ہیں۔ تاہم، زیر نظر کتاب اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے موضوع پر ان کے مضامین اور مقالات کو ایک جلد میں جمع کرنے کی پہلی کوشش ہے۔ ان میں سے کئی مضامین ایسے موضوعات پر بھی ہیں جن کا تعلق ان کی شخصی نشوونما اور پاکستانی معاشرے کے بعض موجودہ رجحانات سے ہے جن کو انھوں نے اورنگی کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ یہ مضامین اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کی ابتدا، ترقی اور کامیابیوں کو بیان کرتے ہیں، لیکن کئی ایسے اہم معاملات ہیں جن کا تذکرہ ان مضامین میں نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر ان میں اس بات کا ذکر موجود نہیں ہے کہ اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے ادارتی کلچر پر اختر حمید خاں کی شخصیت، پرورش اور ان کی زندگی بھر کی سچائی کی تلاش کا گہرا اثر پڑا ہے۔ ان مضامین میں اُس طرزِ فکر کی صراحت نہیں کی گئی (اگرچہ بعض مضامین میں اس کا ذکر کیا گیا ہے) جو اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے عملی طریقِ کار کی بنیاد ہے؛ ان میں انسانی وسائل کی نشوونما کے اُس عمل کا ذکر نہیں ہے جس کے باعث پاکستان کے کئی شہری علاقوں تک پروجیکٹ کا پھیلاؤ ممکن ہوا؛ اور اُس اثر کا بھی تذکرہ نہیں ہے جو اورنگی پائلٹ پروجیکٹ نے پاکستان کی این جی اوز، مقامی تنظیموں اور دوفریقی اور کثیر فریقی امدادی اداروں کے طرزِ فکر پر ڈالا ہے۔ یہ مقالات اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے مستقبل کو زیرِ بحث نہیں لاتے اور نہ ہی اُن سمتوں کا ذکر کرتے ہیں جنھیں پروجیکٹ نے حال میں اختیار کیا ہے۔ اس تعارفی مضمون کا مقصد ان میں سے بعض خالی جگہوں کو پُر کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

کمیونٹی ڈویلپمنٹ کے ماہر کے طور پر اختر حمید خاں کی شہرت نے اس حقیقت کو مکمل طور پر نظروں سے اوجھل کر دیا ہے کہ وہ تاریخ کے ایک مشتاق طالب علم ہیں اور حالیہ سماجی، اقتصادی اور سیاسی معاملات کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیتے اور ان پر تبصرہ کرتے ہیں۔ اس مشاہدے اور تجزیے میں انھیں اس امر سے بہت مدد ملی ہے کہ وہ فارسی، عربی اور پالی زبانوں سے واقف ہیں اور اسلامی اور بودھ کلاسیکی تحریروں کا اصل زبان میں عمیق مطالعہ کر چکے ہیں۔ چناں چہ ان کو ہند مسلم کلچر اور تاریخ کے ماخذوں تک، کسی درمیانی واسطے کے بغیر، براہِ راست رسائی حاصل ہے۔ اس قدرت کا اظہار ان کے اندازِ تحریر سے ہوتا ہے، خواہ یہ تحریریں انگریزی ہی میں کیوں نہ ہوں، اور یہ ان کی حسِ مزاح میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے اس پس منظر کو دیکھتے ہوئے یہ بات تعجب خیز معلوم نہیں ہوتی کہ اختر حمید خاں ۱۸۵۷ء کے بعد کی حالی اور آزاد کی روایت کے ایک قابلِ لحاظ اہمیت کے شاعر بھی ہیں۔ علاوہ ازیں ان

کو معاصر دنیا کا گہرا فہم بھی حاصل ہے، اور اس فہم کی بنیاد ان کی یوروپی تاریخ، ادب اور فلسفے سے واقفیت، اور ان قومی اور بین الاقوامی اخبارات کے مطالعے پر ہے جن کا حوالہ ان کی تحریروں میں اکثر آتا ہے۔ ان کو مغرب کا قریبی اور براہِ راست مشاہدہ کرنے کا بھی موقع ملا ہے، پہلی بار ۱۹۳۰ء کی دہائی کے وسط میں کیمبرج یونیورسٹی کے طالب علم کے طور پر، پھر ۵۹-۱۹۵۸ء میں مشیگن یونیورسٹی کے طالب علم اور ۷۹-۱۹۷۳ء میں اسی یونیورسٹی کے پروفیسر کے طور پر، اور اس کے بعد یورپ اور امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں استاد کے طور پر۔ تاریخ اور حالاتِ حاضرہ کا یہ وسیع علم اختر حمید خاں کے ترقیاتی کام کو قوت فراہم کرتا ہے، اور وہ خود اپنے اس کام کو قومی اور عالمی سطح پر ہونے والے تغیر اور ارتقا کے وسیع عمل کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ یہ پس منظر اس بات کا ایک بڑا سبب ہے کہ اختر حمید خاں کی نگرانی میں چلنے والے پروجیکٹ انھی اغراض و مقاصد کے تحت چلائے جانے والے دوسرے منصوبوں سے مختلف ہوتے ہیں۔

اختر حمید خاں کی عام شہرت کے باعث ایک اور بات بھی توجہ سے محروم رہ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان کے شخصی پس منظر اور تربیت کا اُن اقدار سے گہرا تعلق ہے جن کو ان کا ترقیاتی کام ترویج اور تقویت دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اختر حمید خاں ہندوستان کے مسلم شرفا کی اُس پیڑھی سے تعلق رکھتے ہیں جو سر سید احمد خاں کے فوراً بعد سامنے آئی۔ انھوں نے اپنے بچپن اور تربیت کو اس کتاب میں شامل دو مضامین "تبدیلی کی ذاتی یادیں" اور "میری ماں کا طرزِ زندگی" میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "میرے والد ایک پولیس انسپکٹر تھے جنھوں نے کبھی رشوت نہیں لی۔ وہ اپنے وقت کی جنسی عیاشی سے بہت دور تھے، اپنے افسروں کی خوشامد نہیں کرتے تھے اور دفتر کو یا روزانہ کی چار میل کی سیر کو کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے۔ سر سید کے سچے شاگرد کے طور پر انھوں نے اپنے لیڈر کی طرح مسلم زُہد اور وکٹورین جنٹلمین کی خوداحتسابی کو اپنے اندر سمو لیا تھا، اور یہ دونوں عمدہ اصول شکر اور دودھ کی طرح گھل مل گئے تھے۔ میں نے اپنے والد سے ایمان داری کی قدر و قیمت سیکھی: خوف اور پریشانی سے نجات۔" (۲)

اپنی والدہ کا ذکر کرتے ہوئے اختر حمید خاں لکھتے ہیں: "میری والدہ ایک فرض شناس بیوی اور ماں کے اُس تصور کی پابند تھیں جس کی تفصیل بہشتی زیور میں بیان کی گئی ہے۔ وہ ایثار پسند اور ہمدرد خاتون تھیں۔ ان کو کتابوں اور خیالات سے عشق تھا۔ وہ مجھے، اپنے بڑے بیٹے کو، کتابیں پڑھ کر سناتی تھیں: حالی اور اقبال کی نظمیں، شبلی اور شرر کے تاریخی رزم نامے، محمد علی جوہر کی تقریریں اور ابوالکلام آزاد

کے مذہبی مکالمے۔ انھوں نے مجھے کتابوں سے محبت کرنا سکھایا اور سادگی اور بلند خیالی کا درس دیا۔" (۳)

آج کل کے مسلمان لڑکوں کی طرح اختر حمید خاں کو بھی بچپن میں "حضرت خالد بن ولید کو پسند کرنا سکھایا گیا تھا، جن کی وجہ سے بڑی بڑی کافر افواج شکست کھا گئیں یا کم عمر جنرل محمد بن قاسم کی فتوحات، جن میں دیبل فتح ہوا، راجا داہر مارا گیا اور اس کی بیٹی خلیفہ کے حرم میں داخل ہوئی، یا سلطان محمود غزنوی کے کارنامے، جس نے ہندوستان کے شہروں اور مندروں کو تیس سال میں سترہ بار لوٹا اور آخر میں سومناتھ کے بڑے بُت کو توڑ ڈالا۔" (۴) اس کے ساتھ ساتھ اختر حمید خاں تصوف کے فلسفے سے بھی متعارف ہوئے جو ان کے الفاظ میں "آگرہ اور دہلی کے شرفا کا ورثہ" تھا۔ (۵) وہ لڑکپن ہی میں "صوفیہ کے ہمہ گیر آفاقی فلسفے سے مولانا روم کی مثنوی کے ذریعے "واقف ہو گئے تھے۔ (۶) لیکن فوجی فتوحات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساس برتری اور صوفیا کی رائج کردہ ضبط، ترک اور ہم دردی کی اقدار کے مابین بہت فرق ہے۔ اس تضاد اور اس کی تحلیل کے عمل کا ذکر اختر حمید خاں نے اپنے مضمون "مجھے نطشے پسند تھا" میں کیا ہے۔

اپنے والد اور والدہ، اور اپنے بچپن اور تربیت کے حالات کو بیان کرتے ہوئے اختر حمید خاں نے دراصل ہندوستان کے مسلم شرفا کی تہذیب اور اس کی اقدار کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "میرا لڑکپن کا گھر بہت سے دوسرے شرفا کے گھروں کی طرح سر سید کی اصلاح کا ثمر تھا۔ ان گھرانوں کا عقلی اور اخلاقی ماحول قدیم شریف گھرانوں سے مختلف تھا: نہ کئی بیویاں، نہ باندیاں، نہ ناچنے والیاں؛ نئے خیالات، نئی توقعات، نئے طور طریق اور نئے شب و روز۔" (۷) اس کے باوجود آج ہمارے معاشرے میں اختر حمید خاں جیسے افراد قریب قریب نایاب ہیں اور سر سید احمد خاں کے لائے ہوئے انقلاب نے، اپنے اندرونی تضادات کے باوجود، جن مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کو رائج کیا تھا، انھیں اختر حمید خاں کی نسل سے تعلق رکھنے والے شرفا نے ترک کر دیا۔ وہ لکھتے ہیں: "وہ شرفا جو ان [سر سید] کے اصولوں کے پابند تھے، نیک، محنتی، جزرس، نرم خو اور مخیر ہوتے تھے۔ وہ حقوق اللہ، حقوق العباد، اپنے اور خاندان کے حقوق ادا کرتے تھے۔ میں نے اپنے لڑکپن میں بہت سے ایسے بزرگ دیکھے، لیکن افسوس، وقت کے ساتھ ساتھ ہر دس سال بعد ان کی تعداد کم ہوتی گئی۔ ہو سکتا ہے مجھ پر بڑھاپے کے تعصب کا غلبہ ہو گیا ہو۔ لیکن میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ۱۹۳۸ء میں جب میں پہلی دفعہ بنگال گیا تو اس وقت وہاں سترہ آئی سی ایس افسر تھے۔ وہ تمام بے داغ شہرت رکھتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں جب میں دوبارہ مشرقی پاکستان گیا تو

میرے یہ ساتھی بڑے بڑے عہدوں پر متمکن تھے۔ میں نے افسوس کے ساتھ دیکھا کہ ایک ایک کر کے وہ سب، زر، زن اور زمین کی ترغیبوں کا شکار ہو گئے۔ سترہ میں سے صرف تین بے داغ رہے۔ اور یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ اس کے بعد اوسط اور خراب ہوا ہے۔ اگر سید احمد آج آجائیں تو وہ یہ دیکھ کر دل شکستہ ہوں گے کہ ان کے روحانی شاگرد اسلامی سادگی اور وکٹورین نظم وضبط تج کر لارڈ کار نوالس سے پہلے کے کمپنی کلرکوں کی عادت اپنا چکے ہیں جو اپنے سرکاری اثر سے لوٹ مار کر کے چوری اور رشوت کے ذریعے نواب بن جاتے تھے۔" (۸) اختر حمید خاں ان ترغیبوں کا شکار نہیں ہوئے اور انھوں نے ان معاشرتی اور اخلاقی اقدار کو ترک نہیں کیا جو بچپن میں ان کی تربیت کی بنیاد رہی تھیں۔ بلکہ انھوں نے زندگی میں جو بھی کام کیا اس کے ذریعے ان اقدار کو متواتر پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ یہ جاننا بہت اہم ہے کہ اختر حمید خاں اپنے معاصروں سے کیوں اور کس طرح مختلف ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا، ان کے مختلف ہونے کا اثر ان کے کیے ہوئے ترقیاتی کاموں کی نوعیت اور معیار پر پڑا ہے۔

اختر حمید خاں ہمیشہ ایک ذہین طالب علم رہے اور ہمیشہ امتیازی کامیابیاں حاصل کرتے رہے، جن کے باعث وہ، خود اپنے الفاظ میں، "ایک انانیت پسند نوجوان" (۹) بن گئے۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ قدرت نے انھیں غوروفکر کرنے والا مزاج دیا تھا اور ان کا دماغ مابعدالطبیعیاتی قیاسات کو قبول کرتا تھا۔ ان کی ابتدائی عملی زندگی پر نظر ڈالنے سے اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ غوروفکر کرنے والے مزاج نے اس غرور اور انانیت پسندی پر فتح پائی جو ان کی ذات میں رہی ہوگی۔ ۱۹۳۶ء میں وہ انڈین سول سروس (ICS) میں شامل ہوئے جس کو برطانوی ہند کی سب سے معزز اور پسندیدہ ملازمت سمجھا جاتا تھا۔ نو برس بعد، ۱۹۴۵ء میں، انھوں نے آئی سی ایس سے استعفیٰ دے دیا اور یوں خود کو اس تمام اقتدار اور مادی فائدے سے محروم کر لیا جو اس ملازمت کی بدولت انھیں حاصل تھا۔

اختر حمید خاں نے اس ملازمت کو ترک کرنے کے جو اسباب بارہا بیان کیے ہیں، وہ ہمیں ان کی شخصیت کے بارے میں بہت کچھ بتاتے ہیں اور اس بارے میں بھی کہ وہ خود کو تاریخ کے وسیع عمل کے ایک جز کے طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "نو سال بعد میں نے سلطنت کی ملازمت ترک کر دی۔ برطانوی استادوں سے سیکھنے کو اب کچھ باقی نہ بچا تھا۔ اب مجھے کسی دوسری قسم کی شاگردی درکار تھی۔" (۱۰) اکتیس برس کی عمر میں بھی اختر حمید خاں علم اور سمت کی تلاش میں تھے۔ اس تعارف کے مصنف سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کئی بار کہا ہے کہ ان کے آئی سی ایس چھوڑنے کا سبب یہ تھا

کہ پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد ہندوستان میں برطانوی راج اور اس کے قائم کیے ہوئے اداروں کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ وہ ایک مرتے ہوئے نظام کا حصہ بنے رہنے کو تیار نہ تھے جو اپنی قوتِ حیات اور عملیت سے محروم ہو چکا تھا۔ ایک اور بات جس کا ان کے ذہن پر غلبہ تھا یہ احساس تھا کہ آئی سی ایس افسر کی حیثیت سے وہ عوام کے وسیع مسائل کو حل نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ یہ مسائل معاشرتی اور اقتصادی نوعیت کے تھے اور انتظامی اقدامات سے حل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان میں ان مسائل کے اسباب جاننے اور ان لوگوں کی زندگیوں کو سمجھنے کی خواہش بڑھتی گئی جو آئی سی ایس افسر کی حیثیت میں ان کے سامنے مختلف معاملات کی بابت عرضیاں پیش کیا کرتے تھے۔

آئی سی ایس کی ملازمت کے زمانے میں اختر حمید خاں علامہ مشرقی کے پیروکار بن گئے۔ وہ لکھتے ہیں: "علامہ مشرقی نے قرآن مجید کا تجزیہ کیا اور اس میں سے دس نکات پر مشتمل بقاےاصلح کا نسخہ دریافت کیا۔ قرونِ اولیٰ کی مسلم فوجی فتوحات کو اس نسخے کی سچائی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اس نسخے میں حکومت کا حصول، یعنی تمکّن فی الارض اور غلبہ، بنیادی نکتہ ہے۔ اس نظریے کے تحت ہندی مسلمانوں کو ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ ہندوستان پر غلبہ حاصل کریں، اور جنرل محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کے نام کو دوبارہ روشن کریں۔" (۱۱) مزید لکھتے ہیں: "پہلے استاد، علامہ اقبال نے گو کسرِ نفسی اور انکساری کو رد کیا تھا، تاہم اُن کے دل میں صوفیا کے لیے ایک نرم گوشہ تھا۔ لیکن میرے دوسرے اُستاد علامہ مشرقی صوفیا کو حقیر سمجھتے تھے۔ وہ اُن کی امن پسندی، تسلیم و رضا اور صلحِ کل ہونے کو نفرت سے دیکھتے تھے۔ وہ صوفیا کو مسلم مملکت کے زوال اور خاتمے کا ذمے دار ٹھہراتے تھے کیوں کہ ان کے خیال میں انھوں نے مسلمانوں کو قوت کے حصول اور تمکّن اور غلبے سے دور کر دیا۔ ۱۹۳۰ کی دہائی میں میرے دوسرے اُستاد کے خیال میں ہٹلر اور اس کی پارٹی بقاےاصلح کے اصول پر عمل پیرا تھے، اس لیے ان کا غلبہ یقینی تھا۔" (۱۲)

آئی سی ایس کی ملازمت کے دوران اختر حمید خاں اپنے دو نطشائی استادوں کے فلسفے سے برگشتہ ہو گئے۔ وہ لکھتے ہیں: "میں نے قوت اور حکومت کا مزہ چکھا، لیکن یہ بھی دریافت کیا کہ خدا نے مجھے نطشے کے سانچے میں نہیں ڈھالا تھا، یعنی ایک مردِ کامل، ہم دردی سے عاری، فنکار حکمراں کے سانچے میں۔ مجھے خوشی نہیں ہوتی تھی جب غریب میرے پاؤں پڑتے تھے بلکہ شرمندگی ہوتی تھی اور جب میں اُن کی مفلسی دیکھتا، جیسے قحط کے زمانے میں، تو میں اپنی نوابانہ بےاعتنائی قائم نہ رکھ پاتا بلکہ بےحد افسردہ ہو

جاتا- میں اس بے رحمانہ نظام سے بھی آنکھیں بند نہ رکھ پاتا جس کے استحکام کی خاطر مجھ کو بطورِ انعام دولت اور قوت ملتی تھی- جب جنگ کے دوران میں حکومت کی ممانعت کی پالیسی کے تحت غریبوں کی کشتیاں اور گاڑیاں چھینتا، اور اس طرح انھیں قحط سے دوچار کر دیتا، اور جب میں قوم پرست باغیوں کو گرفتار کرتا تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا- میں نے محسوس کیا کہ میرا مردِ کامل ہونے کا وہم فریب ہے اور میں نے اُس سے پیچھا چھڑا لیا-"(۱۳)

طاقت اور فتوحات کی تحسین اور صوفیانہ اقدار کا تضاد، جو اختر حمید خاں کی تربیت اور تعلیم کا جزرہا تھا، اس طرح حل ہوا- وہ لکھتے ہیں: "میری ایک ذاتی لگن تھی؛ میں ایک ایسی زندگی گزارنا چاہتا تھا جس میں خوف اور پریشانی نہ ہو، ایک مطمئن اور پُرسکون زندگی، جس میں فتنہ فساد نہ ہو- میں نے دریافت کیا کہ جب میں نطشے کے مشورے پر عمل کر کے ایک طاقتور آقا، مغرور فوق البشر، بننا چاہتا ہوں تو میرا غرور اور غصہ میری پریشانی اور خوف میں اضافہ کرتے ہیں، اور طرح طرح کے جھگڑوں میں اُلجھاتے ہیں- اس کے برخلاف اگر میں صوفیا اور عارفوں کے مشورے پر عمل کرتا ہوں اور اپنے لالچ، غرور اور غصے کو کم کرتا ہوں تو خوف پریشانی اور جھگڑے گھٹ جاتے ہیں-"(۱۴) اختر حمید خاں بعض دوسرے اخلاقی تضادات کی بھی نشان دہی کی ہے جو ان کی تربیت میں مضمر رہے تھے- "عارفوں کے اقوال سے روشن خیالی حاصل کر کے جب میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا تو مجھے پتا چلا کہ فتح کے دو رُخ ہیں- یہ فوق البشر فاتح کے لیے تو بلند نامی ہے لیکن مفتوح کے لیے سخت تکلیف دہ- بچپن سے میرے اندر قبائلی تعصب کو رچایا گیا- مجھے سکھایا گیا کہ میں محمود کے ترک سپاہیوں کی فتوحات کی پھیلائی ہوئی تباہی پر خوشی مناؤں، لیکن ہلاکو کی تباہ کاری پر افسوس کروں؛ بہمنی فوج کے ہاتھوں وجے نگر کی تباہی پر ہنسوں، اور سرنگاپٹم کی شکست پر، جو انگریزوں کے ہاتھوں ہوئی، آنسو بہاؤں- لیکن ایک رحم دل اشوک نے کالنگا میں مفتوحین کے قتل عام پر رنج کیا تھا- اور معرّی نے، جو سلطان محمود کا ہم عصر تھا، اس بات پر ماتم کیا تھا کہ اُن کی خواہشات کی منزل کے راستے تمھارے سینوں کو بھالوں سے چیر کر جاتے ہیں-"(۱۵)

آئی سی ایس چھوڑنے کے بعد اختر حمید خاں نے علی گڑھ میں تالے بنانے والے ایک مزدور کی حیثیت سے کام کیا- اس انتخاب کی وجہ ظاہر ہے- وہ مزدور طبقے کے طرزِ زندگی اور مزاج سے براہِ راست واقف ہونا چاہتے تھے- اس کے بعد انھوں نے جامعہ ملیہ، دہلی، میں پڑھایا، پھر کومیلا کے وکٹوریہ کالج کے پرنسپل ہوئے اور آخر مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) کے کومیلا پروجیکٹ کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے- اس

آخرالذکر حیثیت سے انھوں نے ٹھوس ترقیاتی کام کا آغاز کیا۔ یہ کام ان کے مزاج سے مطابقت رکھتا تھا کیوں کہ مسائل کے ساتھ محض نظری سطح پر نبرد آزما ہونے سے ان کی تسکین نہیں ہوتی۔

کومیلا میں انھیں امریکی اور وسیع مطالعے کے ذریعے چینی استاد میسر آئے۔ اپنی مخصوص ذہنی دیانت داری سے کام لیتے ہوئے انھوں نے اپنے ان نئے استادوں کی تعلیم کو عملی شکل دینا شروع کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ان تجربات کو تحریر میں لا کر ان کا تنقیدی تجزیہ کرنا بھی جاری رکھا۔ انھوں نے اپنے ان استادوں سے اپنی ممنونیت کا اظہار کیا ہے، اگرچہ ان کی بعض باتوں پر وہ تنقید بھی کرتے ہیں۔

اس امر پر نگاہ ڈالنا کار آمد ہو گا کہ اختر حمید خاں کی تربیت اور تعلیم، تاریخ اور حالاتِ حاضرہ کی بابت ان کے علم اور سچ کے لیے اور تبدیلیوں کے اس دور میں اپنے بامعنی کردار کے لیے ان کی تلاش نے، جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، کس طرح ان کے شروع کیے ہوئے یا ان کے زیرِاہتمام چلائے جانے والے منصوبوں کے عملی طریقِ کار اور اداراتی کلچر کو متاثر کیا۔

پروجیکٹ کے دفتر اور پروگراموں کا انتظام نہایت کفایت شعاری اور جزرسی کے ساتھ چلایا جاتا ہے۔ یہ خصوصیات اختر حمید خاں کے طرزِ زندگی میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں، چناں چہ کوئی شخص ان منصوبوں کے سربراہ پر منافقت یا دوعملی کا الزام نہیں لگا سکتا جیسا کہ کفایت شعاری کے ساتھ چلائے جانے والے دوسرے منصوبوں کے سلسلے میں اکثر دیکھا گیا ہے۔ اس علاوہ اختر حمید خاں نے ہند مسلم کلچر کی بنیادی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی روایات کو ترک نہیں کیا ہے اور یہ روایات ان غریب بستیوں کے باشندوں کے تہذیبی اور ذہنی پس منظر کا لازمی جز ہوتی ہیں جن کے ساتھ ان منصوبوں کے کارکنوں کو کام کرنا ہوتا ہے۔ ان روایات پر انھوں نے اپنے مضمون "اورنگی میں روایت اور تبدیلی" میں روشنی ڈالی ہے۔ انھی وجوہ سے اختر حمید خاں کو مزدورپیشہ طبقے کے افراد سے معاملہ کرنے میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آتی اور وہ بھی، ان کے دوسرے "طبقے" سے تعلق رکھنے کے باوجود، ان سے یگانگت پیدا کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے۔ اختر حمید خاں اور یہ باشندے مشترک تصورات سے تعلق رکھتے ہیں، ایک ہی زبان استعمال کرتے ہیں اور ایک سی اقدار (یا ایک سی اقدار کا احترام) رکھتے ہیں۔ اختر حمید خاں ان افراد کے ذہنوں، ان کے باہمی رشتوں اور ان کی شخصیت کے پس منظر میں موجود تہذیبی عمل سے بخوبی واقف ہیں۔ علاوہ ازیں وہ معاصر دنیا سے ان لوگوں کے تعلق کو بھی سمجھتے ہیں کیوں کہ معاصر دنیا کا گہرا فہم رکھتے ہیں۔ اختر حمید خاں کے کام کے ایک اور پہلو سے ان کے اس خیال کا اظہار ہوتا ہے کہ ہم

تبدیلیوں کے دور میں زندہ ہیں اور جو عمل اور افراد معاشرتی اور اقتصادی میدانوں میں تبدیلی پیدا کر رہے ہیں ان کا ساتھ دینا چاہیے اور ایسے ادارے قائم کرنے چاہییں جو نہ صرف تبدیلی کے عمل کو قائم رکھنے میں مدد دیں بلکہ اسے مضبوط بھی بنائیں۔

اختر حمید خاں نے آمدن اور خرچ کا تفصیلی حساب کتاب رکھنے کی اہمیت پر ہمیشہ زور دیا ہے۔ یہ کام وہ خود بھی بہت عرق ریزی کے ساتھ کرتے ہیں اور بڑے فخر سے ملاقاتیوں کو دکھاتے ہیں۔ ان کے کھنے کے مطابق حسابات نہ صرف جواب دہی کے عمل کو قائم کرتے ہیں بلکہ پروجیکٹ کو بیان کرنے کے لیے بھی کسی اور قسم کی دستاویزات سے زیادہ کارآمد ہیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ انھوں نے تفصیلی حساب رکھنے کی اہمیت اپنے انگریز استادوں سے سیکھی ہے۔ تاہم، ان کی والدہ بھی، مشرقی روایت کے مطابق، گھر کے خرچ کا "پائی پائی کا حساب" ضرور رکھتی ہوں گی، اور شاید یہ شوق بھی ان میں تربیت کے ابتدائی برسوں سے موجود رہا ہے۔

مشرقی پاکستان کے بحران کے بعد، جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش وجود میں آیا، اختر حمید خاں مغربی پاکستان، یا ملک کے نئے صدر ذوالفقار علی بھٹو کے الفاظ میں "نئے پاکستان"، چلے آئے۔ اُس دن سے لے کر ۱۹۸۰ء میں اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے ڈائرکٹر کا عہدہ قبول کرنے تک کی اپنی زندگی پر وہ یوں تبصرہ کرتے ہیں: "ہاں، تقدیر ایوب خان، ہارورڈ کے مشیروں اور مشرقی پاکستان کو بہا کر لے گئی اور مجھے، بلاشبہ میرے گناہوں کی پاداش میں، دوبارہ اجڑنے والا مہاجر، پناہ گیر بنا کر یہاں لے آئی۔ ابتدا میں، میں نے اس فریب کو دل میں جگہ دی کہ میں کومیلا اکادمی کے دیہات سدھار پروگرام کو پشاور اکادمی میں جاری رکھ سکوں گا، جہاں میرے دوست شعیب سلطان ڈائریکٹر تھے۔ لیکن تین سال کے اندر ہم دونوں کو اکادمی سے الگ کر دیا گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ کومیلا کے پروگرام، دیہی ترقی کے کام، تھانے مراکز اور کسانوں کے کوآپریٹو جیسے تصورات کو نئے پاکستان میں فرسودہ مال خیال کیا جاتا ہے۔ میں اب ساٹھ سال کا ہو گیا تھا، لہذا اس بات کا حق دار تھا کہ گھورے پر پھینک دیا جاؤں، جہاں سے اٹھا کر میری تیسری مادر درس گاہ، مشگن اسٹیٹ یونیورسٹی، نے مجھے دوبارہ دیہی ترقی کے معلم کی حیثیت سے کارآمد بنایا۔ غیر ملک میں پانچ سال پُرسکون زندگی گزارنے کے بعد اور بیرونی ملکوں کے طلبہ کو پڑھا کر میں واپس کراچی آ گیا، مہاجروں کی پناہ گاہ میں، ایسی ماں کی گود میں جو تمام اطراف سے آنے والے پناہ گزینوں کی ماں ہے۔ یہاں میں اپنے ساتھ اپنے صوفی مرشدوں کی، عارفوں اور روشن ضمیر استادوں،

دانشمندوں، فلسفیوں، پسندیدہ شاعروں اور ناول نویسوں کی کتابیں لایا۔ میں اُن کی پُرسکون صحبت میں اپنے آخری ایام آرام سے غور و فکر میں گزارنے کی اُمید رکھتا تھا تاکہ اُن کے مشورے سے اس پریشان کن دنیا سے رخصت کی تیاری کر سکوں، لیکن ۱۹۸۰ء میں بی سی سی آئی کے آغا حسن عابدی اور ابنِ حسن برنی نے مجھے اس بات پر راضی کیا کہ میں اپنا آدھا وقت موت کی تیاری کو اور آدھا وقت او پی پی، اورنگی آزمائشی منصوبے کو دوں۔" (۱۶)

اورنگی ٹاؤن شپ، جو پچھلے پندرہ برس سے اختر حمید خاں کی سرگرمیوں کا مرکز رہی ہے، زیادہ تر کچی آبادیوں پر مشتمل ہے۔ یہ آٹھ ہزار ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کے تقریباً دس لاکھ باشندے ۹۴۱۲۲ مکانوں میں رہتے ہیں۔ یہ ملی جلی آبادی ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجروں، بنگلہ دیش سے آئے ہوئے بہاریوں، پاکستان کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے پنجابیوں اور پٹھانوں، اور مقامی سندھی اور بلوچی باشندوں پر مشتمل ہے۔ اس آبادی کا بیشتر حصہ مزدور طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ سب دہاڑی پر کام کرنے والے، ہنرمند مزدور، کاریگر، چھوٹے دکان دار، خوانچہ فروش اور کم آمدنی والے دفتری کارکن ہیں۔

یہ آبادی ۱۹۶۵ء میں قائم ہوئی تھی۔ زمین کو رہائش کے قابل بنانا، مکان تعمیر کرنا، آمدنی فراہم کرنے والی سرگرمیاں شروع کرنا، یہ سب کام یہاں کے باشندوں نے غیر رسمی سیکٹر کی مدد سے، اور سرکاری اداروں کی جانب سے کسی قسم کی امداد کے بغیر، سرانجام دیے۔ اورنگی کے باشندوں کی توانائی اور مستعدی کا ذکر کرتے ہوئے اختر حمید خاں کہتے ہیں: "اورنگی سے واقف ہونے پر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ کولمبو یا گوجرانوالہ سے بڑی اس آبادی کو سرکاری اداروں سے حاصل ہونے والی خدمات بہت کم میسر ہیں۔ اورنگی کے باشندے بنیادی طور پر غیر رسمی ذرائع پر انحصار کرتے ہیں۔ زمین دلالوں کی وساطت سے خریدی جاتی ہے؛ مکان بنانے کے لیے قرض، خام مال اور تکنیکی مشورہ ٹھلے والا فراہم کرتا ہے۔ بچے امدادِ باہمی کی بنیاد پر چلائے جانے والے اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ جسمانی اور روحانی بیماریوں کا علاج عطائی کرتے ہیں۔ تجارت کی سہولتیں، رفاہی خدمات اور چیرہ دستیوں سے تحفظ کے سلسلے میں انھیں ہمیشہ بلیک مارکیٹ یا رشوت کے بازار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ امر کہ یہ غیر رسمی سیکٹر اور اس کی بلیک مارکیٹ سرکاری سیکٹر سے کئی گنا بڑی ہے، اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ غریبوں کے لیے کی جانے والی سرکاری منصوبہ بندی کس قدر کمزور ہے۔ اس کے علاوہ اس امر سے غریب طبقے

کے افراد کی توانائی اور جینے کے ہنر میں ان کی مہارت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی یہ توانائی ان انجمنوں کے وجود سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو جابجا قائم ہیں اور شہری سہولتیں حاصل کرنے کے لیے سرکاری محکموں پر متواتر دباؤ ڈالتی، دعوے پیش کرتی اور حاصل شدہ سہولتوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ اس کا مزید اظہار، خصوصاً نوجوانوں میں، اپنی ووٹ کی قوت اور سڑکوں کی طاقت کے بڑھتے ہوئے شعور سے بھی ہوتا ہے۔" (۱۷) تاہم، یہ غیررسمی سیکٹر، اپنی توانائی اور تحرک کے باوجود، ان تکنیکی اور انتظامی مشکلات پر موثر انداز سے قابو نہیں پاسکتا جو ترقیاتی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے عمل کے دوران لازماً پیش آتی ہیں؛ اس کا سبب یہ ہے کہ غیررسمی سیکٹر کو متعلقہ ریسرچ یا پیشہ ورانہ علم تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔

اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کو جو سمت اختیار کرنی تھی اس کی تفصیل اختر حمید خاں نے اپنے مضمون "فلاحی کام پر ایک نوٹ" (فروری ۱۹۸۰ء) میں بیان کی ہے۔ ایک طرح سے یہ نوٹ تحقیق اور توسیع کے طریقے کی تعریف متعین کرتا ہے۔ اس میں اختر حمید خاں کہتے ہیں: "یوں تو ہم سب معاشرتی انتشار کے دور سے گزر رہے ہیں لیکن ان لوگوں کے لیے یہ مسئلہ اور زیادہ اہم ہے جو اپنے مانوس ماحول سے بچھڑ گئے ہیں۔ اُن کو ایک نئی جگہ محلّہ داری، باہمی امداد اور مل جل کر کام کرنے کا جذبہ دوبارہ زندہ کرنا ہوگا۔ یہ کام کئی طرح کے معاشرتی اور معاشی اداروں کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔ ایسی تنظیموں کے بغیر نراج اور انتشار کا دور دورہ رہے گا لیکن اگر معاشرتی اور معاشی ادارے فروغ پائیں اور جڑ پکڑ لیں تو خدمت اور مادی ترقی کے مواقع جیسے سینی ٹیشن، اسکولوں، دواخانوں، تربیت کے مراکز اور روزگار میں اضافہ ہوگا۔" وہ آگے چل کر مزید کہتے ہیں: "اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ امداد کا کوئی تیار نقشہ فوری نفاذ کے لیے موجود نہیں ہے، گو بہت سے قابلِ تقلید نمونے دوسرے ممالک میں موجود ہیں۔ اُن لوگوں کے لیے جو عام مروجہ طریقوں سے آگے جانا چاہتے ہیں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ مستقل مزاجی سے تخلیقی طریقہ اپنائیں، اور مقامی لوگوں سے مشورہ کر کے تجربے اور تجزیے کا راستا اختیار کریں۔" اور یہ بھی کہ "ایک معاشی اور معاشرتی ادارے کا قیام جلدی میں نہیں ہو سکتا۔ تیز ترقی کی کوشش ایسے کام میں نقصان دہ ہوتی ہے۔ لوگوں کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے، ان کے مزاج سے آشنا ہونے اور ان کے اداروں کا تجزیہ کرنے میں کافی وقت اور توجہ درکار ہوتی ہے۔ اس کے لیے ایک نامکمل نظامِ اوقات یہ ہے: کئی ماہ کی ابتدائی تحقیق (تین سے چھ ماہ) جس کے بعد ایک سال کا آزمائشی منصوبہ تیار کیا جائے گا جس کا ایک سال بعد اعداد و شمار کے ساتھ باقاعدہ تجزیہ ہوگا۔ یہ طریقہ بار بار اپنایا جائے گا، یہاں تک کہ

ایک کامیاب قابلِ عمل نقشہ وجود میں آ جائے۔" نوٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سلسلے میں دو بنیادی اصولوں کی پابندی کرنا ضروری ہے: پہلا، ہر قسم کے سیاسی یا فرقہ وارانہ تعصب سے پرہیز، اور دوسرا، مفادِ عامہ کا خیال، یعنی اس بات کو ترجیح دینا کہ عام آدمی کی ضروریات اہم ہیں۔

اختر حمید خاں اور آغا حسن عابدی کے درمیان ہونے والی افہام و تفہیم، جس کی بنیاد پر اختر حمید خاں نے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے سربراہ کی ذمے داری سنبھالی تھی، اسی فکر اور طریق کار کی آئینہ دار تھی جس کی تفصیل "فلاحی کام پر ایک نوٹ" میں بیان کی گئی ہے۔ اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے سامنے کوئی متعینہ ہدف یا نظام الاوقات نہیں تھا، اور اختر حمید خاں اس کے سلسلے میں کسی کو جواب دہ نہیں تھے۔ تاہم، انھیں پروجیکٹ کے مالی حساب کتاب کی تفصیل، سہ ماہی رپورٹوں کے ساتھ، بی سی سی آئی فاؤنڈیشن کو پیش کرنی تھی۔ اس کے علاوہ پروجیکٹ کو تحقیق اور توسیع کے طریقے پر عمل کرنا تھا، یعنی او پی پی کو پہلے اورنگی کے مسائل اور ان کے عوامی حلوں کا تجزیہ کرنا تھا اور پھر معاشرتی اور تکنیکی تحقیق کے ذریعے ایک بہتر مشاورتی پیکیج تیار کر کے اورنگی کے باشندوں کو پیش کرنا تھا۔ دونوں فریق ان بنیادی اصولوں پر کاربند رہے۔

اس طرح اورنگی پائلٹ پروجیکٹ نے ابتدا ہی سے خود کو ایک تحقیقی ادارہ خیال کیا جس کا مقصد اورنگی کے بڑے مسائل کا تجزیہ کرنا اور پھر طویل عملی تحقیق اور توسیع کی تربیت کے ذریعے ان مسائل کے قابلِ عمل حل تلاش کرنا تھا۔ او پی پی ترقیاتی کام اپنے ذمے نہیں لیتا بلکہ کمیونٹی کی تنظیموں اور اجتماعی ترقیاتی عمل کی حوصلہ افزائی کرتا اور ایسے عمل کو تکنیکی معاونت فراہم کرتا ہے۔ اس عمل کے دوران یہ اُن رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے جو سرکاری محکموں کو کم آمدنی والی کچی آبادیوں کو بہتر بنانے کے سلسلے میں پیش آتی ہیں۔

اختر حمید خاں کا خیال ہے کہ کسی این جی او یا پائلٹ پروجیکٹ کا منصب یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایسے طریقِ عمل وضع کرے جنھیں حکومت کے منصوبہ بندی کے نظام میں شامل کیا جا سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسائل کی وسعت اس قدر زیادہ ہے کہ انھیں حکومت کی موثر شرکت کے بغیر حل نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم، کسی این جی او یا پائلٹ پروجیکٹ کے وضع کیے ہوے طریقِ عمل کی سرکاری منصوبہ بندی میں شمولیت تین شرائط کو پورا کرنے کا تقاضا کرتی ہے: (۱) جو ماڈل تیار کیے جائیں وہ ان رکاوٹوں کو دور کرنے میں کامیاب ہو سکیں جن کا سامنا سرکاری محکموں کو کچی آبادیوں کی بہتری (یا کسی اور ترقیاتی

پروگرام) کے سلسلے میں ہوتا ہے، اور رکاوٹوں کو دور کرنے کے اس عمل میں سرکاری محکموں کی ساخت میں بڑی تبدیلیاں کرنا یا انقلابی نوعیت کے قوانین وضع یا نافذ کرنا ضروری نہ ہو۔ (۲) عملے کی تنخواہیں، اوپری اخراجات اور دوسرے خرچ سرکاری نمونوں اور ضابطوں کے مطابق رہیں۔ (۳) ماڈل تیار کرنے کے عمل کی پوری تفصیلات تحریر میں لائی جائیں، مشاہدے کا علاقہ وجود میں لایا جائے اور موثر تربیتی مواد تیار کیا جائے جس کے بغیر دوسرے مقامات پر اس ماڈل کی پیروی کرنا ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ہوگا۔

او پی پی نے ان تینوں شرائط کی احتیاط کے ساتھ پابندی کی ہے، جس کے نتیجے میں اس کا پورا کام ۶۵ سہ ماہی رپورٹوں کی شکل میں محفوظ ہے جنھیں کہانیوں کی کتابوں کی طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ ان رپورٹوں کے علاوہ سیکڑوں کیس اسٹڈیز، مونوگراف، توسیعی پمفلٹ اور پوسٹر، اور علاقے کے کارکنوں اور گلیوں کے منتظموں کے خاکے بھی تیار کیے گئے ہیں۔ پروجیکٹ کے بارے میں بڑی تعداد میں کتابیں شائع ہوئی ہیں اور او پی پی کے کام کے دوران میں متعلقہ علاقوں کے بارے میں ہزاروں تکنیکی رپورٹیں، نقشے اور زمین کے استعمال کے پلان وجود میں آئے ہیں۔

یہاں ایک اور بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے، اور وہ یہ کہ اختر حمید خاں کی راے میں تیسری دنیا میں غریبوں کے لیے تیار کیے جانے والے بیشتر پروگرام ناکام ہو جاتے ہیں کیوں کہ ان کے تیار کرنے والے پیشہ ور ماہرین بالائی طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور انھیں غریب آبادیوں کے سماجی اور معاشی حالات اور ان کے کلچر سے مناسب واقفیت نہیں ہوتی اور نہ وہ ان حالات کے اسباب کے بارے میں باخبر ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس غیررسمی سیکٹر، جو تیسری دنیا کے ملکوں میں شہروں کے غریب باشندوں کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کر رہا ہے، اور غریب باشندے خود بھی، اس تکنیکی ریسرچ اور تعلیم یافتہ پیشہ ور ماہروں کی تکنیکی رہنمائی تک رسائی نہیں رکھتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب باشندوں اور غیررسمی سیکٹر کے ہاتھوں انجام پانے والا ترقیاتی کام ناقص معیار کا ہوتا ہے اور فعال کارکنوں اور آبادیوں کے تمام ممکنات کو بروے کار لانے سے قاصر رہتا ہے۔ چناں چہ اس بات کا انتظام کرنا اور اس کے لحاظ سے مناسب ادارے قائم کرنا ضروری ہے کہ تعلیم یافتہ پیشہ وروں اور تحقیقی اداروں کا غیررسمی سیکٹر اور غریب آبادیوں سے موثر ربط قائم ہو سکے۔ اختر حمید خاں بجا طور پر محسوس کرتے ہیں کہ وہ او پی پی کی صورت میں ایک ایسا ادارہ قائم کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

او پی پی نے اپنے کام کو مکمل کرنے سے پہلے اس کی تشہیر کرنے یا اخباروں کو ہینڈآؤٹس فراہم

کرنے سے پرہیز کیا۔ یہ بات اسے ان بیشتر پروجیکٹوں سے ممتاز کر دیتی ہے جنھیں این جی اوز کی مدد اور بین الاقوامی مخیر اداروں کے پیسے سے چلایا جاتا ہے۔ "فلاحی کام پر ایک نوٹ" میں اختر حمید خاں لکھتے ہیں: "ابتدا میں ہر قسم کی تشہیر سے پرہیز کرنا چاہیے۔ وقت سے پہلے دھوم دھام اور اشتہار بازی سے وہی نقصان ہو سکتا ہے جو عجلت میں کی گئی بہت بڑی منصوبہ بندی سے۔ جیسے جیسے منصوبہ ترقی کرے گا، آزاد تجزیہ نگار پبلک کو دستاویزی شواہد اور رپورٹوں کی مدد سے ترقی کی رفتار سے آگاہ کریں گے۔"

مذکورہ بالا اصولوں اور طریق کار پر کاربند رہتے ہوئے او پی پی نے اپنے متعدد پروگرام چلائے ہیں۔ ان پروگراموں میں لوگوں کا اپنے خرچ پر اور اپنی نگرانی میں قائم کیا ہوا کم لاگت کا نکاسیِ آب کا پروگرام، مکانوں کی تعمیر کا پروگرام، بنیادی صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام، چھوٹے گھریلو کاروباری یونٹوں کو قرض فراہم کرنے کا پروگرام، تعلیمی پروگرام اور کراچی کے آس پاس کے گوٹھوں کے لیے دیہی ترقی کا پروگرام شامل ہیں۔ ان پروگراموں کی تفصیل اختر حمید خاں نے ان مضامین میں بیان کی ہے جنھیں اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے۔

تاہم، یہ سب کچھ بغیر دشواریوں کے ممکن نہیں ہوا۔ اختر حمید خاں نے او پی پی میں تحقیق اور توسیع کا جو طریق کار اختیار کیا وہ اس سے پہلے صرف دیہی ترقی کے کام میں استعمال کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں پاکستان کے شہری علاقوں میں سرگرم این جی اوز اور دوفریقی اور کثیر فریقی امدادی ادارے اس طریق کار کو شک، تضحیک یا باقاعدہ مخاصمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ روایتی شہری منصوبہ سازی اور اختر حمید خاں کے تحقیق اور توسیع کے طریق کار کے درمیان پہلا بڑا تنازعہ خود او پی پی کے اندر پیش آیا۔ اس تنازعے کی تفصیل بیان کرنا کارآمد ہوگا کیوں کہ اس کے ذریعے ان ناموزوں اور غیر حقیقت پسندانہ مفروضوں کی نشان دہی کی جا سکے گی جن پر روایتی شہری منصوبہ سازی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

۱۹۸۲ء میں اقوام متحدہ کے انسانی آبادیوں کے مرکز (UNCHS) نے بی سی سی آئی فاؤنڈیشن کو پیش کش کی کہ وہ او پی پی کو مزید ترقی دینے کے عمل میں حصہ لینے کے لیے تیار ہے۔ بی سی سی آئی نے یہ پیش کش قبول کر لی جس کے نتیجے میں ۱۹۸۲ء میں حکومت پاکستان، یو این سی ایچ ایس اور بی سی سی آئی کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس تین سالہ معاہدے کے مطابق بی سی سی آئی کو تین ملین ڈالر کی رقم فراہم کرنی تھی اور اس میں سے ایک ملین ڈالر کی رقم یو این سی ایچ ایس کو دی جانی

تھی تاکہ وہ نکاسیِ آب، پانی کے کنوؤں اور صحت عامہ میں بہتری، ان پروگراموں کی نگرانی اور متعلقہ سرگرمیوں کے سلسلے میں ماہروں کی خدمات فراہم کرے۔ علاوہ ازیں، آبادیوں کے ایک تجربہ کار منصوبہ ساز کو جوائنٹ ڈائرکٹر کے طور پر متعین کیا جانا تھا۔ اس عرصے کی پروگریس رپورٹ میں اختر حمید خاں نے لکھا: "ہمیں امید کرنی چاہیے کہ اقوام متحدہ کے ایک ادارے کی بھاری خرچ پر حاصل کی گئی اعانت او پی پی کی تکنیکی مہارت میں اضافے اور ہمارے ملکی سرکاری اداروں کے ساتھ تعاون کے امکانات میں بہتری کا سبب بنے گی۔ اب ہمیں محلوں کی سطح پر ایسی تنظیمیں قائم کرنے کی کوششیں تیز کر دینی چاہییں جو اس تکنیکی اور معاشرتی رہنمائی کو مناسب طور سے استعمال کر سکیں۔"

یو این ایچ سی ایس کے تعینات کیے ہوئے جوائنٹ ڈائرکٹر یا، جیسا کہ ان کے عہدے کا باضابطہ نام تھا، چیف ٹیکنیکل ایڈوائزر، ستمبر ۱۹۸۲ء میں اورنگی پہنچے۔ انھیں اس پروجیکٹ کی ہر بات غلط معلوم ہوئی۔ او پی پی کے پاس نہ تو باقاعدہ متعین کیے ہوئے ہدف تھے اور نہ "موزوں" جغرافیائی، معاشرتی اور نسلی جائزے۔ اس کے پاس کوئی ماسٹر پلان بھی نہ تھا۔ اس کا کوئی ورک پروگرام بھی نہ تھا۔ اس کا دفتر ایک خستہ عمارت میں تھا جو آبادی کے ایک تنگ اور پُرشور علاقے میں واقع تھی اور وہاں سکون سے کوئی منصوبہ سازی کرنا ممکن نہ تھا۔ اور آخری بات یہ کہ نکاسیِ آب کے سلسلے میں (جو اُس وقت او پی پی کا سب سے بڑا پروگرام تھا) اس نے جو ٹیکنالوجی اور جو تعمیری طریقے اختیار کیے تھے وہ تباہ کن نوعیت کے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ او پی پی کی اختیار کردہ ٹیکنالوجی کو عمل میں لانے کے لیے انجنیئروں اور معماروں کی اعلیٰ مہارت درکار ہو گی۔ ان کا خیال تھا کہ تکنیکی مہارت کا یہ نظام بلدیاتی اداروں، منتخب کونسلروں اور پیشہ ور ٹھیکے داروں کے تعاون سے ہی وضع کیا جا سکتا ہے۔ کمیونٹی کی تنظیمیں، محض پیشہ ور ماہروں، تکنیکی کارکنوں اور سماجی تنظیم کاروں کی امداد کے سہارے، اس ٹیکنالوجی کا انتظام نہیں سنبھال سکیں گی۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اورنگی کے محلوں سے جن سماجی تنظیم کاروں کو منتخب کیا گیا ہے ان کی حیثیت محلے کے بدمعاشوں سے زیادہ نہیں ہے۔

اورنگی میں چار ماہ گزارنے کے بعد یو این سی ایچ ایس کے چیف ٹیکنیکل ایڈوائزر نے او پی پی کے اختیار کردہ طریق کار کا ایک تجزیہ پیش کیا اور بی سی سی آئی سے درخواست کی کہ اورنگی میں ایک پروجیکٹ او پی پی سے الگ قائم کرے۔ اپنے اس تجزیے میں ایڈوائزر نے لکھا: "یہ بات واضح ہے کہ کام کے سلسلے میں دو متضاد طریق کار موجود ہیں جن کے درمیان کوئی سمجھوتا بظاہر ناممکن ہے۔ ایک، تلاش اور جستجو پر

مبنی جس میں معاشرتی خصوصیات پر زور دیا جاتا ہے اور وقت اور خرچ کی کوئی قید نہیں ہے۔ اور دوسرا، ہدف کے مطابق اور باقاعدہ، جس میں تکنیک اور مہارت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور وقت اور خرچ کا تعین ہوتا ہے۔" علاوہ ازیں، ایڈوائزر نے کہا کہ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ "یو این سی ایچ ایس کے پاس وہ تمام ماہرانہ وسائل ہیں جو کسی ایسے بڑے منصوبے کے لیے ضروری ہیں جو کم آمدنی والے شہری علاقے میں کام کرے۔" (۱۸)

اختر حمید خاں نے چیف ٹیکنیکل ایڈوائزر کے اس تجزیے کا جواب دیا۔ بی سی سی آئی کے صدر کے نام بھیجے گئے اپنے تبصرے میں انھوں نے لکھا: "متعین ہدف والا، مربوط، شہری آبادکاری کا تجربہ کسی سرکاری ادارے، مثلاً کے ڈی اے یا کے ایم سی، کے لیے موزوں ہو سکتا ہے، حالاں کہ کچی آبادیوں میں ان خطوط پر کی جانے والی پچھلی تمام کوششیں ناکام ہوئی ہیں۔ اس قسم کے منصوبوں کے لیے بہت زیادہ رقم کی ضرورت ہوتی ہے (صرف ۲۰ لاکھ ڈالر نہیں بلکہ کروڑوں ڈالر)، اور اس کے علاوہ قوتِ نافذہ بھی درکار ہوتی ہے، اور یہ دونوں باتیں کسی غیر سرکاری تنظیم کی استطاعت سے باہر ہیں۔" اپنے تبصرے کے آخری پیراگراف میں انھوں نے لکھا: "اگر یو این سی ایچ ایس کے بھیجے ہوئے ماہر عمومی، متعینہ اور عام طور پر ناکام ہونے والی روایتی تکنیکوں سے پوری طرح مسحور ہیں، اگر وہ تبدیلی لانے والی اختراعی تحقیق اور توسیع کو اپنی کم سمجھی کی وجہ سے سمجھنے سے قاصر ہیں، اگر انھوں نے جان بوجھ کر مقامی ترقیاتی صورت حال سے آنکھیں چرا رکھی ہیں، اور اس سب کے باوجود اُن کو انتظام پر قبضہ جمانے کا بھی شوق ہے، تو پھر میرا خیال ہے کہ اورنگی کے لوگوں کو ان سے بہت کم فائدہ ہوگا اور بی سی سی آئی کو اپنے دس لاکھ ڈالر کا بہت تھوڑا اور ناکافی بدل ملے گا۔" (۱۹)

بہرحال، ہوا یہ کہ چیف ٹیکنیکل ایڈوائزر کی خواہش کے مطابق اورنگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ایک نیا پروجیکٹ، کمیونٹی ڈویلپمنٹ پروجیکٹ (CDC) کے نام سے قائم کر دیا گیا جس کا انتظامی کنٹرول اور تکنیکی رہنمائی کا کام یو این سی ایچ ایس کے ہاتھ میں تھا۔ اپنی ۱۳ویں پروگریس رپورٹ میں اختر حمید خاں نے اس تقسیم کا تذکرہ یوں کیا: "اب اورنگی میں بی سی سی آئی کے زیرِاہتمام دو پروجیکٹ چلائے جائیں گے۔ تین برس پرانا او پی پی اپنے طریق کار پر قائم رہے گا، اور نئے پروجیکٹ کا انتظام یو این سی ایچ ایس کے ہاتھ میں ہوگا۔ نئے پروجیکٹ کو تین برس کے عرصے میں بی سی سی آئی کی جانب سے ۲۰ لاکھ ڈالر کی رقم ملے گی، جب کہ او پی پی مقامی سکّے میں ایک معمولی سالانہ امداد وصول کرتا

رہے گا۔ اوپی پی ایک خالص پاکستانی منصوبہ ہوگا جو کفایت شعاری کی مقامی خصوصیت برقرار رکھے گا اور پاکستانی ماہرین اس کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ اورنگی کے باشندوں کو ایک دوسرے پروجیکٹ سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا جس کی خصوصیت اقوامِ متحدہ کی شان و شوکت ہو گی اور جسے غیر ملکی ماہروں کی رہنمائی حاصل ہو گی۔" (۲۰)

سی ڈی سی نے وہی پروگرام شروع کرنے کی کوشش کی جو اوپی پی کے زیرِاہتمام پہلے سے چل رہے تھے، لیکن اس کا طریقِ کار "متعینہ ہدف والا، باقاعدہ، اور پیشہ ورانہ اور تکنیکی مہارت پر زور دینے والا" رہا۔ اسے متعدد غیر ملکی ماہروں کی اعانت بھی حاصل رہی۔ لیکن چھ برس گزرنے پر صورت حال یہ تھی کہ یہ نیا پروجیکٹ محض ۳۶ گلیوں میں نکاسیِ آب کا نظام قائم کر سکا، اور اس کے چلائے ہوئے تمام دوسرے پروگرام ناکام ہو کر ختم ہو گئے۔ ۱۹۸۹ء میں اس پروجیکٹ کو بند کر کے اس کے زیرِانتظام علاقہ دوبارہ اوپی پی کو سونپ دیا گیا۔ اپنی چھ سال کی زندگی میں سی ڈی سی نے چھ لاکھ ۲۵ ہزار ڈالر سے زیادہ رقم خرچ کی۔ اسی عرصے میں، اور اس سے ایک تہائی سے بھی کم خرچ پر، اوپی پی چار ہزار سے زیادہ گلیوں کے ۷۰ ہزار سے زیادہ مکانوں کے لیے نکاسیِ آب کا نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوئی اور اپنے دوسرے کئی پروگراموں کو بھی اورنگی ٹاؤن شپ کی حدوں سے آگے لے گئی۔ اختر حمید خاں کا طریق کار درست ثابت ہوا، اور ان کے ایک اور منصوبے کو بین الاقوامی تحسین حاصل ہوئی اور پیروی کرنے والوں کو ایک اور نمونہ میسر آیا۔

۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۸ء کے درمیان اوپی پی کے پروگرام بہت تیز رفتاری سے پھیلے۔ کراچی اور ملک کے دوسرے شہروں کی کچی آبادیوں اور غیر رسمی بستیوں میں قائم کمیونٹی کی انجمنوں، کارکنوں اور غیر سرکاری تنظیموں نے اوپی پی کو درخواستیں بھیجنی شروع کر دیں کہ وہ اپنے پروگراموں، خصوصاً کم لاگت والا نکاسیِ آب کا نظام قائم کرنے کے پروگرام کو ان کے علاقوں میں شروع کرنے کے سلسلے میں ان کی مدد کرے۔ اس بڑھتی ہوئی مانگ کو موثر طور پر پورا کرنے کے لیے ۱۹۸۸ء میں اوپی پی کا درجہ بڑھا کر اسے چار خود مختار اداروں کی شکل دے دی گئی: (۱) اوپی پی سوسائٹی، جس کا کام فنڈز کو مناسب استعمال میں لانا ہے، (۲) اوپی پی ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (OPP-RTI) جو نکاسیِ آب، مکانوں کی تعمیر اور معاشرتی جنگل بانی کے پروگراموں کا انتظام کرتا ہے، اور اوپی پی کے تمام پروگراموں کے سلسلے میں این جی اوز، سرکاری محکموں، امدادی اداروں اور کمیونٹی تنظیموں کے نمائندوں کی تربیت کا

ذمے دار ہے، (۳) اورنگی چیریٹیبل ٹرسٹ (OCT) جس کا کام قرض فراہم کرنے والے پروگراموں کا انتظام چلانا اور انھیں وسعت دینا ہے، اور (۴) کراچی ہیلتھ اینڈ سوشل ڈویلپمنٹ ایسوسی ایشن (KHASDA) جس کے ذمے صحت عامہ کے پروگرام کا انتظام کرنا ہے۔ دیہی پروگرام کی نگرانی براہِ راست او پی پی کے ہاتھ میں ہے اور یہ کام آر ٹی آئی کی تکنیکی اعانت سے انجام دیا جاتا ہے۔

۱۹۸۷ء سے بین الاقوامی اداروں نے بھی او پی پی سے تعلقات قائم کرنا شروع کر دیا، اور گزشتہ چند برسوں میں انھوں نے او پی پی کے تجربات کو ایسے سرکاری منصوبوں کی پلاننگ کا حصہ بنانے کی کوششیں کی ہیں جو ان کی مالی امداد سے چلائے جا رہے ہیں۔ دریں اثنا، او پی پی کو اورنگی کے مسئلوں کا حل تلاش کرنے کے عمل میں متعلقہ بلدیاتی اور سرکاری محکموں سے کام نکلوانے کے لیے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی ہے۔ اس غرض سے کہ سرکاری منصوبہ سازی کی بے حسی کے ہاتھوں اورنگی کے باشندوں کا انجام دیا ہوا ترقیاتی کام کہیں تباہ نہ ہو جائے، اس کو ملکی اور بین الاقوامی طور پر چلائے جانے والے ترقیاتی منصوبوں کی کڑی نگرانی کرنی پڑی ہے اور ان کا نفاذ کرنے والے اداروں سے معاملہ کرنا پڑا ہے۔ او پی پی یہ تمام کام اس لیے انجام دے سکی کہ اسے بی سی سی آئی کی گرانٹ کے علاوہ بین الاقوامی این جی اوز اور دوسرے کثیر فریقی اور دو فریقی اداروں کی مالی اعانت حاصل رہی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ او پی پی نے اپنے کام کی ترقی اور توسیع کے لیے درکار انسانی وسائل کو بڑی کامیابی سے تیار کیا ہے۔ یہ انسانی وسائل کن افراد پر مشتمل ہیں اور ان کی تیاری میں کیا کیا مراحل پیش آئے، ان کا بیان او پی پی کی اہم ترین کامیابی اور وقیع ترین اثاثے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

او پی پی کا عملہ مجموعی طور پر پیشہ ور ماہروں، سماجی تنظیم کاروں اور تکنیکی کارکنوں پر مشتمل ہے۔ پیشہ ور ماہروں کا کام یہ ہے کہ اورنگی کے مسائل کی تحقیق اور تجزیہ کریں، لوگوں نے ان مسائل کو حل کرنے کے جو دیسی طریقے اختیار کیے ہیں ان کا مطالعہ کریں، اور ایک بار پھر تکنیکی ریسرچ کے ذریعے ان مسائل کے حل کے سلسلے میں ایک بہتر مشاورتی پیکج تیار کریں۔ توسیعی لٹریچر تیار کرنا اور تعمیری کام وغیرہ کی نگرانی کرنا بھی ان کے ذمے ہے۔ اس تمام پیشہ ورانہ تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ وہ علاقے کے کم آمدنی والے باشندوں کے سماجی اور معاشی حالات سے مطابقت رکھتی ہو، اور اس تحقیق کے نتیجے میں تیار ہونے والا حل ایسا ہو کہ یہ باشندے اس پر عمل کر سکیں اور بعد میں اس کی دیکھ بھال بھی اپنے طور پر کر سکیں۔

سماجی تنظیم کاروں کو کمیونٹی میں سے منتخب کیا جاتا ہے۔ ان کا کام لوگوں سے رابطہ قائم کرنا، ان کو منظم ہونے میں مدد دینا، پیشہ ور ماہروں کے تیار کیے ہوئے مشاورتی پیکیج کو عام کرنا اور اس کی نگرانی کرنا، اور جاری یا آئندہ ہونے والے ترقیاتی کام کے سلسلے میں کمیونٹی میں پیش آنے والے ممکنہ مسائل کا جائزہ لینا ہے۔ سماجی تنظیم کار، علاقے کے باشندوں اور پیشہ ور ماہروں کے درمیان رابطے کے ذریعے کی حیثیت رکھتے ہیں، اور پیشہ وروں کے کام میں ان کی شمولیت اور اس پر ہونے والے عوامی رد عمل کے تجزیے کے باعث اس تحقیقی کام کی جڑیں زمین پر موجود حقیقت سے الگ نہیں ہونے پاتیں۔

تکنیکی کارکنوں کو بھی علاقے ہی سے منتخب کیا جاتا ہے۔ یہ افراد سماجی تنظیم کاروں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں، ترقیاتی کام کی نگرانی کرتے ہیں، اور پیشہ ور ماہروں کے تیار کیے ہوئے مشاورتی پیکیج کی توسیع میں مددگار ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہیں اور سماجی تنظیم کاروں کو ایک ٹیم کی شکل میں مل کر کام کرنا ہوتا ہے۔ تکنیکی کارکن کو پیشہ ور ماہر کے ساتھ بھی کام کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ اس کے تیار کیے ہوئے مشاورتی پیکیج کو سمجھ سکے اور اس کے عملی نفاذ میں پیش آنے والی دشواریوں کی اطلاع اس تک پہنچا سکے۔

ابتدا میں اوپی پی نے تجربہ کار پیشہ ور افراد کو اپنے عملے میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ تاہم، بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ ایسے پیشہ ور افراد کے لیے اوپی پی کے فلسفے اور طریق کار سے مطابقت پیدا کرنا بہت دشوار ہے۔ یہ لوگ روایتی طریق کار کے بہت زیادہ عادی ہو چکے تھے۔ آگے چل کر اوپی پی کو ایک مشیر (کنسلٹنٹ) اور چند نوجوان گریجویٹوں پر انحصار کرنا پڑا جن کی نشوونما اوپی پی کے ساتھ ساتھ ہوئی ہے۔ ان نوجوان گریجویٹوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ بعض ایسی چیزیں بھلا سکیں جن کا سبق انہیں یونیورسٹیوں میں دیا گیا تھا، اور عام لوگوں، سماجی تنظیم کاروں اور تکنیکی کارکنوں سے سیکھنے پر آمادگی پیدا کر سکیں۔ آرکیٹیکٹ پروین رحمان، جو اب اوپی پی آر ٹی آئی کی ڈائرکٹر ہیں، ماہر معاشیات انور راشد، جو اوپی پی کے جوائنٹ ڈائرکٹر ہیں، اور آرکیٹیکٹ سلیم علیم الدین، یہ تینوں اپنی پیشہ ورانہ تعلیم مکمل کرنے کے چند برسوں کے اندر ہی اوپی پی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ پروین اور انور ۱۹۸۲ء میں اوپی پی سے منسلک ہوئے جبکہ سلیم، جو داؤد کالج میں پروین کے طالب علم رہے تھے، ۱۹۸۹ء میں آئے اگرچہ وہ اپنی تعلیم کے دوران بھی ۱۹۸۴ء سے اوپی پی کے کاموں میں حصہ لیتے رہے تھے۔ ان کے علاوہ انجنیئر راشد کھتری بھی اوپی پی کے پیشہ ور ماہروں میں شامل ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۷ء میں اپنی تعلیم

پوری کرنے کے بعد سے پاکستانی این جی او سیکٹر میں کام شروع کیا جس کے سلسلے میں وہ او پی پی سے متعارف ہوے۔ چند سال او پی پی کے لیے باہر رہ کر کام کرنے کے بعد وہ ۱۹۹۲ء میں باقاعدہ عملے کا حصہ بن گئے۔ ڈاکٹر شمیم زین الدین خاں، جو کراچی ہیلتھ اینڈ سوشل ڈویلپمنٹ ایسوسی ایشن کی ڈائرکٹر ہیں، او پی پی کے پیشہ ور عملے کی واحد رکن ہیں جو اپنے سابقہ تجربے کے ساتھ او پی پی میں آئیں۔ ۶۲ سالہ ڈاکٹر شمیم زین الدین زندگی بھر ایک سرگرم سیاسی کارکن رہی ہیں اور وقت کے گزرنے سے ان کی سرگرمی پر ذرا بھی اثر نہیں پڑا ہے۔

سماجی تنظیم کاروں نے او پی پی کی نشوونما میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ابتدائی مراحل میں، جب اختر حمید خاں اورنگی کے سماجی رہنماؤں، تنظیموں اور عام باشندوں سے رابطے قائم کر رہے تھے، تب انھوں نے چند ایسے افراد کو منتخب کیا جو ان کے خیال میں اس کام کے لیے موزوں تھے۔ اس انتخاب کی بنیاد بظاہر وجدان پر تھی، لیکن اس وجدان کی پشت پر ترقیاتی کام کا برسوں طویل تجربہ تھا۔ اتفاق سے ان تمام تنظیم کاروں میں بعض باتیں مشترک ہیں۔ یہ سب کسی نہ کسی اعتبار سے سیاسی پس منظر رکھتے ہیں۔ یہ سب محلے کی تنظیموں میں سرگرم رہے ہیں۔ اورنگی کے رہنما اپنی حمایت کے لیے ان پر انحصار کرتے رہے ہیں۔ ان سب کا مزاج سماجی تبدیلی سے ہم آہنگ ہے اور اختر حمید خاں جو نئی باتیں سکھانے کی کوشش کر رہے تھے، انھیں سیکھنے میں ان کو دوسروں کی نسبت بہت کم وقت لگا۔ یہ سب افراد اورنگی ٹاؤن شپ کی ترقی میں سرگرمی کے ساتھ شامل رہے ہیں۔ اپنے سیاسی پس منظر کی بدولت ان کے لیے لوگوں سے رابطہ قائم کرنا، ان کے اجلاس منعقد کرنا، اور کمیونٹی کے کاموں میں ناگزیر طور پر پیش آنے والے سماجی اور تنظیمی مسائل سے نمٹنا آسان تھا۔ حفیظ آرائیں اور رمضان قریشی او پی پی کے سب سے پرانے سماجی تنظیم کار ہیں اور ادارے کی ابتدا ہی سے اس کے ساتھ رہے ہیں۔ حفیظ آرائیں ایک سیاسی کارکن رہے ہیں اور دوسرے کاموں کے علاوہ رکشاڈرائیور اور اورنگی کے ایک غیررسمی ڈویلپر کے نائب کی حیثیت سے بھی کام کر چکے ہیں۔ رمضان قریشی ایک چھوٹے ٹھیکے دار اور چوڑیاں اور ہاتھی دانت کی اشیا بنانے والے کاریگر کے طور پر کام کرتے تھے۔

او پی پی کے تکنیکی کارکنوں میں پلمبر، ڈرافٹس مین اور سرویئر شامل ہیں۔ پلمبر اور سرویئر اورنگی ہی کے رہنے والے ہیں اور او پی پی سے منسلک ہونے سے پہلے بھی یہی کام کرتے رہے تھے۔

پیشہ ور عملے کے ارکان، سماجی تنظیم کار اور تکنیکی کارکن مختلف طبقاتی پس منظروں سے تعلق

رکھتے ہیں۔ جب انھوں نے مل کر کام کرنا شروع کیا تو ان میں سے ہر ایک کے ذہن میں ترقیاتی کام کے بارے میں جدا جدا خیالات تھے جس کا سبب ان کی تعلیم اور زندگی کا تجربہ تھا۔ ان کے مل کر کام کرنے کے لیے یہ لازمی تھا کہ وہ لوگوں کے اس ترقیاتی کام کے بارے میں ایک مشترک نقطۂ نظر وضع کریں جس کی ان کو اعانت کرنی تھی۔ یہاں اختر حمید خاں نے ایک استاد کی حیثیت سے نہایت موثر کردار ادا کیا۔ پروجیکٹ کی ابتدا سے لے کر ۱۹۸۸ء تک اوپی پی کے تمام عملے کی ہفتہ وار میٹنگ باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ اس میٹنگ میں پورے ہفتے کے کام، اور اس کے سماجی، تکنیکی اور معاشی پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا تھا۔ عملے کا ہر رکن اپنی رپورٹ پیش کرتا۔ ہر میٹنگ میں عملے کے ارکان کو کام سونپے جاتے جن میں اپنے تجربات کو تحریر میں لانا بھی شامل ہوتا تھا، اور پچھلی میٹنگ میں سونپے گئے کام کا جائزہ لیا جاتا۔ تجربات اور خیالات کا یہ لین دین خود ہی ہر ایک کے لیے ایک قیمتی تعلیمی تجربہ ہوتا تھا۔ اس کو مزید تقویت اختر حمید خاں کے تجزیوں اور مشوروں سے ملتی تھی، اور جس طرح وہ عملے کے افراد کے اٹھائے ہوئے چھوٹے چھوٹے عام مسائل کا رشتہ وسیع قومی اور بین الاقوامی حقائق اور مسائل سے جوڑتے تھے وہ عملے کے ارکان کی رہنمائی کا بہت موثر ذریعہ تھا۔ ہر میٹنگ کا آغاز عملے کے ارکان کے نام ڈائرکٹر کی رپورٹ سے ہوتا تھا جس میں اس تمام بات چیت کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا جاتا جو بین الاقوامی اداروں، سرکاری اہلکاروں اور اداروں، یا قومی اور مقامی سیاست دانوں سے ڈائرکٹر کی ملاقاتوں میں کی گئی ہوتی۔ حسابات کو بھی زیرِ بحث لایا جاتا اور ادارے کی کوئی بھی بات عملے سے پوشیدہ نہ رکھی جاتی۔ علاوہ ازیں، عملے کے ہر رکن کی حوصلہ افزائی کی جاتی کہ وہ اپنے تجربات اور خیالات کو تحریر کرے اور یہ تحریریں اوپی پی کے رسالے میں شائع کی جاتیں۔

ان میٹنگوں کے وسیلے سے اختر حمید خاں نہ صرف عملے کے ارکان تک اپنی بصیرت پہنچانے، اور سماجی، معاشی اور تکنیکی مسائل کے باہمی رشتے کی بابت انھیں تعلیم دینے میں کامیاب ہوئے بلکہ رفتہ رفتہ انھوں نے تمام ارکان کے درمیان ایک مضبوط ربط پیدا کر دیا۔ یہ ربط نہ صرف ترقیاتی کام کی بابت ایک مشترکہ نقطۂ نظر پر مبنی تھا بلکہ اس میں فرض شناسی، کفایت شعاری، انکسار، حساب کتاب میں باقاعدگی اور طریقِ کار میں شفافیت کی وہ اقدار بھی کارفرما تھیں جن کو قائم کرنے کی اختر حمید خاں اپنی پُرواقعہ زندگی میں ہمیشہ کوشش کرتے رہے ہیں۔

۱۹۸۸ء میں جب اوپی پی کا درجہ بڑھا کر اس کے کام کو چار خودمختار اداروں میں بانٹ دیا گیا تو

ان میں سے ہر ادارے نے ہفتہ وار میٹنگ کی اس روایت کو اور اس کے مخصوص طریق کار کو الگ الگ برقرار رکھا- تاہم، اختر حمید خاں ان میٹنگوں میں شریک نہیں ہوتے البتہ وہ ان اداروں کے سربراہوں سے متواتر ملتے رہتے ہیں اور استاد کے طور پر اپنا کردار ادا کرنا جاری رکھے ہوئے ہیں- ان میں سے ہر ادارہ اب اپنا نیوزلیٹر اور پروگریس رپورٹ تیار کرتا ہے-

اوپر بیان کیے گئے عمل کے نتیجے میں پیشہ ور ماہرین، سماجی تنظیم کار اور تکنیکی کارکن ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرنے میں کسی قسم کی جھجھک محسوس نہیں کرتے- بلکہ تنظیم کاروں نے تکنیکی کارکنوں سے ان کا کام سیکھ لیا ہے اور بیشتر تکنیکی کارکن عمدہ تنظیم کار بھی بن گئے ہیں- چند ایک تنظیم کار اور تکنیکی کارکن ایسے بھی ہیں جو جزوی طور پر پیشہ ور ماہروں کا کام انجام دے سکتے ہیں، اور تقریباً تمام پیشہ ور ماہر سماجی تنظیم کاروں کا- اس کے علاوہ سماجی تنظیم کاروں اور تکنیکی کارکنوں نے اپنے ہنر کو ترقی بھی دی ہے- ان میں سے بعض نے، او پی پی کی مدد سے، نقشے بنانے اور سروے کرنے کے کورس کیے ہیں اور بعض نے کمپیوٹر سائنس کی تربیت حاصل کی ہے- اس طرح او پی پی، اپنے محدود عملے کے ساتھ، اپنا دائرہ کار وسیع کرنے میں کامیاب رہا ہے-

تاہم، انسانی وسائل کی ترقی کے سلسلے میں او پی پی کا کام صرف اورنگی کے عملے تک محدود نہیں ہے- او پی پی کی مشاورت سے ۵۰۰۰ سے زیادہ گلیوں کے لوگوں نے نکاسِ آب کی لائنوں کی تعمیر کی نگرانی اور انتظام کا کام کیا ہے- ان میں سے ہر گلی نے اپنے لیے ایک لین مینیجر منتخب یا نامزد کیا- ان مینیجروں اور ان کے مددگاروں نے لوگوں سے پیسے جمع کیے، ان کا حساب رکھا، اور گلی کے رہنے والوں کی عملی شراکت سے نکاس کی پائپ لائن ڈالنے کے کام کو منظم کیا- ان میں سے بہت سے منتظم بعد میں او پی پی کے دوسرے پروگراموں میں بھی شامل ہوئے اور او پی پی کے کاموں کی توسیع کے سلسلے میں اہم مددگاروں کی حیثیت حاصل کرلی- یہ افراد اب او پی پی کے متعارف کرائے ہوئے تصور، یعنی لوگوں کی شرکت اور اپنی مدد آپ کے ذریعے ترقیاتی کام کے تصور، کو عام کررہے ہیں-

اس پورے عمل کے ذریعے عام لوگوں کو نکاس کے نظام اور تعمیراتی ٹیکنالوجی کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی ہیں- چناں چہ اب وہ اپنے علاقے میں سرکاری ٹھیکے داروں یا خود اپنے مقرر کردہ ٹھیکے داروں کو غیر معیاری یا ناقص کام کرنے سے روک دیتے ہیں- اس طرح حکومت، غیر رسمی سیکٹر اور علاقے کے لوگوں کے درمیان تعلق پہلے سے زیادہ متوازن ہو گیا ہے- اس عمل کے نتیجے میں او پی پی کے

صحت عامہ، قرض کی فراہمی اور مکانوں کی تعمیر کے پروگراموں کو پھیلانے میں بھی مدد ملی ہے۔

انسانی وسائل کی ترقی کے سلسلے میں او پی پی کی کارکردگی متاثر کن ہے۔ اس کے باوجود اسے اعانت کی ان بڑھتی ہوئی درخواستوں کو پورا کرنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے جو اپنے پروگراموں کی دوسری جگہوں پر پیروی کرنے کے ضمن میں اسے کمیونٹی تنظیموں، این جی اوز، اور سندھ کچی آبادی اتھارٹی (SKAA) کی جانب سے موصول ہوتی رہتی ہیں۔ اس مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے او پی پی نے ان بستیوں میں جہاں اس کا کام جاری ہے، نوجوانوں اور طالب علموں کو تکنیکی کارکنوں کے طور پر تربیت دینے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ نوجوان بستیوں کا سروے کرنے اور نقشہ بنانے، تعمیری پلان تیار کرنے اور صحت عامہ کے پروگرام کے سلسلے میں حفاظتی ٹیکے لگانے کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ انھیں ایک مخصوص مدت تک او پی پی آر ٹی آئی میں اپرنٹس کے طور پر تربیت دی جاتی ہے۔ اس تربیتی پروگرام کے لیے فنڈ مختلف بین الاقوامی این جی اوز نے فراہم کیے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ تربیت پا کر نکلنے والے سرویئر اور ڈیزائنر کے طور پر اپنا آزادانہ کام شروع کرنے کے لیے دفاتر قائم کریں گے اور جو لوگ یا مقامی تنظیمیں ان کی خدمات حاصل کرنا چاہیں انھیں ایک مخصوص معاوضے کے بدلے میں یہ خدمات فراہم کریں گے۔ اسی طرح حفاظتی ٹیکے لگانے کی تربیت حاصل کرنے والے نجی شفاخانوں سے منسلک ہو جائیں گے جو پاکستان کی کم آمدنی والے بستیوں میں بڑی تعداد میں کام کر رہے ہیں اور جنھیں تربیت یافتہ عملہ حاصل کرنے میں سخت مشکل پیش آتی ہے۔

انسانی وسائل کی اس ترقی کے نتیجے میں اب آر ٹی آئی اپنی تربیتی سرگرمیاں متواتر جاری رکھ سکتا ہے اور این جی اوز، کمیونٹی تنظیموں اور سرکاری محکموں کو تکنیکی اعانت فراہم کرنے کے قابل ہے۔ او پی پی کے عملے کے تمام ارکان (پیشہ ور ماہرین، سماجی تنظیم کار اور تکنیکی کارکن) اس تربیتی پروگرام میں مل کر حصہ لیتے ہیں اور جہاں کہیں ضرورت ہوتی ہے لین مینیجروں اور توسیعی کارکنوں کو بھی بلا لیا جاتا ہے۔ اورنگی کا علاقہ، جو پچھلے پندرہ سال سے او پی پی کی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے، تربیت کے دوران مشاہداتی علاقے کے طور پر کام آتا ہے۔ اس انداز کی تربیت کا فائدہ یہ ہے کہ تربیت پانے والا خواہ کسی بھی سماجی، طبقاتی یا تعلیمی پس منظر سے تعلق رکھتا ہو، آر ٹی آئی میں تربیت دینے والوں سے براہِ راست رشتہ قائم کر سکتا ہے۔

۱۹۸۰ء کے عشرے کے آخر میں سرکاری اہلکاروں کو بڑی تعداد میں او پی پی کے دوروں پر

بھیجا گیا جس کا مقصد ملازمت کے دوران انھیں اس نئے کام کی خصوصیات سے آگاہ کرانا تھا۔ اختر حمید خاں خود بھی سرکاری افسروں کے مختلف تربیتی اداروں کے مستقل مقرر اور ان میں پڑھائے جانے والے کورسوں میں فیکلٹی ممبر کی حیثیت سے شامل رہے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ سابق آئی سی ایس افسر ہیں اور دوسری یہ کہ کومیلا میں کیے ہوئے کام کے سلسلے میں ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان میں کلیدی عہدوں پر فائز بہت سے بیوروکریٹ ان کے دوست اور سابق رفیق کار تھے۔ وہ ان اداروں میں لیکچر دے کر خوشی محسوس کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ او پی پی نے اورنگی میں جو عملی نمونے تیار کیے ہیں، نوجوان افسر ان سے رہنمائی حاصل کریں گے اور اس طرح ریاست اور مزدور طبقے کے باہمی رشتے میں پیدا ہونے والے بحران پر قابو پایا جا سکے گا۔

تقریباً اسی زمانے میں پاکستان کی این جی او تحریک کو بین الاقوامی اور دو فریقی امدادی اداروں اور بین الاقوامی این جی اوز نے بڑے پیمانے پر امداد دینا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات بہت زور دے کر کہی جانے لگی تھی کہ ریاست کے بڑے بڑے کام بیرونی امداد سے چلنے والی این جی اوز کو سنبھال لینے چاہییں۔ اختر حمید خاں نے اس بات سے پُرزور اختلاف کیا۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے بیرونی امدادی اداروں کے زیراہتمام منعقد کرائے جانے والے سیمیناروں، ورک شاپس اور میٹنگوں کو "ملنے جلنے، گپ شپ کرنے اور کھانے پینے" کی غرض سے برپا کی جانے والی محفلیں قرار دیا۔ ان کا پختہ خیال تھا کہ پاکستانی ریاستی اداروں میں زندگی کی رو موجود ہے اور انھیں صرف ترقیاتی کام کے موزوں نمونوں یا ماڈلوں کی ضرورت ہے جو پاکستانی معاشرے کی سماجی اور معاشی صورت حال میں آتی ہوئی تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہوں۔ اُن دنوں اختر حمید خاں کا نعرہ یہ تھا: "دیوانی برائے فروخت نہیں ہے!" اس بات کا اشارہ بنگال کی اُس دور کی صورت حال کی جانب تھا جس کا خاتمہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بنگال کے نوابوں کے تمام انتظامی ڈھانچے کو اپنی تحویل میں لے لینے پر ہوا۔

اپنے ان خیالات کے باعث اختر حمید خاں کو اُس وقت بڑی خوشی محسوس ہوئی جب ۱۹۹۰ء میں او پی پی کے کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کے ساتھ اورنگی کے بعض علاقوں کی حالت بہتر کرنے کے سلسلے میں ایشین ڈویلپمنٹ بینک کی مالی امداد سے تیار کیے ہوئے کراچی اربن ڈویلپمنٹ پروگرام پر، اور سکھر میں یونیسیف کی امداد سے اربن بیسک سروسز پروگرام پر کام کرنے کے امکانات پیدا ہوئے۔ ۱۹۹۱ء میں عالمی بینک نے بھی او پی پی کو اپنے اور حکومتِ پاکستان کے ساتھ کم آمدنی والی کمیونٹیز کو

رہائشی سہولتیں فراہم کرنے کے پروجیکٹ پر کام کرنے کی دعوت دی۔ او پی پی نے ان تینوں پروگراموں میں کنسلٹنٹ کے طور پر ذمے داری قبول کرلی۔

اس سلسلے میں کے ایم سی، عالمی بینک اور یونیسیف کے ساتھ قابلِ قبول معاہدے کی شرائط کرنے کے لیے او پی پی کو کئی ماہ تک مذاکرات کرنے پڑے۔ پروگراموں کی منصوبہ بندی اور عملی نفاذ کے طریقوں کے سلسلے میں سخت اختلافات پائے جاتے تھے، اور اس سلسلے میں بھی کہ کمیونٹی، او پی پی، حکومت پاکستان اور امداد فراہم کرنے والے بین الاقوامی اداروں کا کیا کردار ہونا چاہیے۔ یہ اختلافات کم و بیش ویسے ہی تھے جو ۱۹۸۳ء میں یو این ایچ سی ایس اور اختر حمید خاں کے مابین پیدا ہوئے تھے۔ تاہم، اب او پی پی کے پاس آزمائے ہوئے ترقیاتی ماڈل بھی تھے اور مشاہدے کے لیے ایک علاقہ بھی، اور گزشتہ عشرے کے دوران بین الاقوامی امدادی ادارے بھی اپنے کئی پروگراموں کی ناکامی سے سبق سیکھ چکے تھے۔ او پی پی کے اصرار پر ان تینوں پروگراموں کے انتظام اور نفاذ کے طریق کار میں اہم تبدیلیاں کی گئیں اور او پی پی اور بین الاقوامی اداروں کے باہمی اختلاف کا حل نکالنا کوئی آسان کام ثابت نہ ہوا۔ یہ تبدیلیاں اور اختلافات اس فاصلے کی نشان دہی کرتے ہیں جو اختر حمید خاں کے طریق کار اور روایتی طریق کار کے درمیان ہے۔

سکھر میں یونیسیف کی مدد سے چلائے جانے والے اربن بیسک سروسز پروگرام کے لیے پروگرام کا دفتر سکھر میونسپل کارپوریشن (ایس ایم سی) کی عمارت میں نہیں بلکہ شہر کی اسی غریب بستی میں قائم کیا گیا جہاں یہ کام کیا جانا تھا۔ طے کیا گیا کہ دفتر شام کو دیر تک کھلا رہے گا تاکہ لوگ اپنے دن کے کام سے فارغ ہو کر وہاں آسکیں۔ اس دفتر کے ذمے گلیوں کے نمائندوں کو نکاس کے نظام کے نقشے اور تخمینے فراہم کرنا اور بستی کے لوگوں کو اس پروگرام میں حصہ لینے کے لیے منظم کرنا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے کیا گیا کہ سماجی تنظیم کار اسی بستی سے مقرر کیے جائیں گے، جب کہ اس قسم کے دوسرے پروگراموں میں یہ کارکن بلدیاتی بیوروکریسی میں سے تعینات کیے جاتے ہیں۔ او پی پی کا خیال تھا کہ سرکاری ملازم سماجی تنظیم کاروں کے طور پر کام نہیں کرسکتے کیوں کہ ایک تو بستی کے باشندوں کے لیے ان سے ملنا دشوار ہے، دوسرے انھیں بستی والوں سے رابطہ قائم کرنے میں کلچر، زبان اور وقت کی تنگی کی مشکلات درپیش ہوں گی۔ ان مقرر کیے ہوئے تنظیم کاروں کی تنخواہیں یونیسیف کو او پی پی کے توسط سے ادا کرنی تھیں، کیوں کہ یہ محسوس کیا گیا کہ اگر انھیں براہِ راست سرکاری محکموں سے تنخواہ ملی تو وہ

اس دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے جو سرکاری اہلکاروں پر عموماً پڑتا ہے، اور نہ وہ اعلیٰ سرکاری افسروں کے مفادات کے برخلاف کوئی کام کرنے کی ہمت کر پائیں گے۔

عالمی بینک کے ساتھ (جس کے ساتھ حیدر آباد میں ایک پائلٹ پروجیکٹ شروع کیا گیا) اختلافات زیادہ شدید تھے، لیکن انھیں زیادہ تر او پی پی کی ضروریات کے مطابق طے کر لیا گیا۔ عالمی بینک ایک سے زیادہ پائلٹ پروجیکٹ شروع کرنا چاہتا تھا۔ انھیں امید تھی کہ سندھ کے تین شہروں میں ایک ساتھ کام شروع کیا جا سکے گا۔ تاہم، او پی پی کا خیال تھا کہ وہ صرف ایک پروجیکٹ کو سنبھال سکتا ہے، اور اگر یہ واحد پروجیکٹ مناسب طور سے ترقی پا جائے تو وہ دوسرے شہروں کے لیے مشاہدے اور تربیت کا مرکز بن سکتا ہے۔ پھر عالمی بینک علاقے کی حالت میں بہتری لانے کے عمل کے ہر مرحلے پر حکومت کی شمولیت چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ علاقے کے باشندوں کو پروجیکٹ میں حصہ لینے پر آمادہ کرنے، انھیں منظم کرنے اور تکنیکی تربیت دینے کے لیے سرکاری عملے کو تعینات کیا جائے۔ لیکن او پی پی کا اصرار تھا کہ یہ سب کام سرکاری ملازمین نہیں بلکہ صرف کمیونٹی کے منتخب لوگ این جی اوز کی مدد سے انجام دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ عالمی بینک کی نظر میں پروجیکٹ کا دفتر ایک سرکاری ادارہ تھا جسے حیدر آباد میونسپل کارپوریشن (ایچ ایم سی) یا سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے تحت کام کرنا تھا۔ او پی پی کے خیال میں یہ کمیونٹی کا دفتر تھا جس کا انتظام عارضی طور پر او پی پی کے ہاتھ میں تھا۔ عالمی بینک کا ارادہ تھا کہ پروجیکٹ کے شروع ہونے کے موقع پر ایک بڑا سیمینار منعقد کیا جائے جس میں پروجیکٹ میں حصہ لینے والے تمام ادارے اور کمیونٹی کے لوگ شریک ہوں۔ او پی پی کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے پروجیکٹ خطرے میں پڑ جائے گا کیوں کہ علاقے کے لوگ سیمینار میں بہت سے غیر ملکیوں کو حصہ لیتے اور بہت سا پیسہ خرچ ہوتے دیکھیں گے۔ وہ فوراً یہی کہیں گے کہ یہ پیسہ ترقیاتی کاموں پر کیوں نہیں خرچ کیا جاتا۔ اس کے علاوہ وہ محسوس کریں گے کہ اس پروجیکٹ کا انداز اپنی مدد آپ کرنے اور ترقیاتی کام کا مالی بوجھ خود اٹھانے کے اصولوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ پروجیکٹ کے دفتر کی نوعیت کے سلسلے میں بھی او پی پی اور عالمی بینک کے درمیان اسی طرح کے اختلافات تھے۔ او پی پی ایک سادہ اور غیر ایئر کنڈیشنڈ دفتر چاہتی تھی جو علاقے میں واقع ہو۔ عالمی بینک کا خیال ایک عالی شان دفتر قائم کرنے کا تھا۔ ان اختلافات کی فہرست بہت طولانی ہے۔ جہاں تک او پی پی کے نقطۂ نظر کا تعلق ہے، اس کی وضاحت اختر حمید خاں نے ۱۹۸۰ء میں اپنے مضمون "فلاحی کام پر ایک نوٹ" میں بخوبی کر دی تھی۔

عالمی بینک اور یونیسیف کے مقابلے میں کے ایم سی کے ساتھ سمجھوتے پر پہنچنا زیادہ آسان ثابت ہوا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ کے ایم سی کے میئر او پی پی کے طریق کار کے پوری طرح حامی تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کے ایم سی کے افسروں کو کراچی کی آبادیوں کے باشندوں کے ساتھ کام کرنے کا طویل تجربہ تھا اور وہ ان کے ساتھ کام کرنے کی مشکلات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے لیے بھی او پی پی کے طریق کار اور ترقیاتی کام میں علاقے کے باشندوں کے نمایاں کردار کو تسلیم کرنا خاصا مشکل تھا۔ باشندوں کا فعال کردار سرکاری اہلکاروں کی بدعنوانی، ٹھیکے داروں کی ناجائز منافع خوری اور غیر معیاری تعمیری کام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھا، چنانچہ علاقے کے باشندوں کے عمل دخل کا تصور ٹھیکے داروں اور کے ایم سی میں ان کے سرپرست اہلکاروں کے لیے ناپسندیدہ تھا۔

ان تینوں منصوبوں میں او پی پی کی شمولیت کی شرائط طے کرنے کے سلسلے میں مذاکرات اختر حمید خاں نے نہیں بلکہ او پی پی کے پیشہ ور ماہروں نے کیے۔ تاہم اس سلسلے میں ان کی رہنمائی اور ہدایات کی اہمیت مسلّم تھی۔ اس کے علاوہ پروجیکٹ کا انتظام، نفاذ اور نگرانی کا تقریباً تمام کام او پی پی کے عملے نے نمایاں کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ اس کام میں انھوں نے اپنے استاد اختر حمید خاں کے سکھائے ہوئے اصولوں پر پوری طرح عمل کیا، اگرچہ بعض تفصیلات کے بارے میں وہ ان سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔ اختر حمید خاں کو اپنے شاگردوں پر بجا طور پر فخر ہے۔

یہ تینوں پروگرام بین الاقوامی اداروں (یا کے ایم سی کے پروجیکٹ کے سلسلے میں خود کے ایم سی)، متعلقہ صوبائی سرکاری محکمے، مقامی کمیونٹی اور او پی پی کی شراکت کار پر مبنی تھے۔ تینوں کے سلسلے میں (سوائے کے ایم سی کے پروجیکٹ کے جس میں دوسرا طریق کار اختیار کیا گیا) متعلقہ سرکاری محکمے وہ ذمے داریاں انجام دینے میں ناکام رہے جو معاہدے کے تحت انھیں سونپی گئی تھیں۔ اس سلسلے میں عدم دلچسپی، تاخیر، جواب دہی کے عمل کی غیر موجودگی، سرکاری اہلکاروں کے باہمی اختلافات، بار بار کے تبادلوں اور مبینہ طور پر بدعنوانی کے واقعات سامنے آئے۔ دوسری جانب مقامی کمیونٹی کے باشندوں کے ذمے جو کام تھا وہ انھوں نے توقع سے زیادہ بڑھ چڑھ کر انجام دیا، اور وہ اس کام میں مزید اضافے کے لیے بھی تیار ہیں بشرطے کہ معاہدے میں جس معمولی سرکاری امداد کا یقین دلایا گیا تھا وہ انھیں دستیاب ہو۔ او پی پی نے بھی سرکاری محکموں پر دباؤ ڈالنے میں بہت وقت صرف کیا ہے تاکہ وہ اپنی متعینہ ذمے داری پوری کریں، اور بعض موقعوں پر اس نے ان کے حصے کا کچھ کام خود بھی انجام دیا ہے۔

تاہم او پی پی کو معلوم ہوا کہ سرکاری محکموں کا پیچھا کرنا ایک کل وقتی اور بے نتیجہ کام ہے اور اس وقت کے اس سے بہتر مصرف بھی ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر او پی پی نے اپنی پالیسی میں تبدیلی پیدا کی ہے۔ کے ایم سی کے پروجیکٹ کے سلسلے میں اس نے مقامی باشندوں کو پروجیکٹ کے تمام متعلقہ حقائق اور اعدادوشمار سے، اور اس میں کے ایم سی کی متعینہ ذمے داری سے آگاہ کر دیا ہے۔ اس نے باشندوں کو تربیت بھی دی ہے کہ وہ کے ایم سی کے ٹھیکے داروں کے کیے ہوئے کام کے معیار کا جائزہ لے سکیں۔ اس کے نتیجے میں علاقے کے باشندوں نے تعمیراتی کام کی نگرانی کرنے اور غیر معیاری کام کو روکنے کا کام موثر طور پر سنبھال لیا ہے۔ ترقیاتی کام میں ایک باشعور اور حقائق سے آگاہ کمیونٹی کے شامل ہونے سے ابتدا میں سخت ہنگامہ ہوا لیکن پھر کے ایم سی کے انجنیئروں، ٹھیکے داروں اور کمیونٹی کے باشندوں کے درمیان ایک عمدہ تعلق قائم ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب کے ایم سی میں بھی او پی پی کے طریق کار سے ہمدردی رکھنے والے اہلکار موجود ہیں۔ تاہم کمیونٹی کے باشندے کے ایم سی سے وہ ذمے داریاں پوری کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکی جن کا تعلق تعمیراتی کام کے مکمل ہونے کے بعد اس کی دیکھ بھال سے ہے۔ سکھر کے یو بی ایس پروجیکٹ کے سلسلے میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو کراچی میں کے ایم سی کے پروجیکٹ کے سلسلے میں استعمال کیا گیا تھا، اور کمیونٹی کی ایک تنظیم کی حوصلہ افزائی اور اعانت کی جا رہی ہے جو مقامی بلدیاتی محکموں کو ان کی ذمے داری پوری کرنے پر مجبور کر سکے۔ عالمی بینک کے پروجیکٹ کے نتائج سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا ضروری ہو گا۔

بین الاقوامی ادارے، حکومت، او پی پی اور مقامی کمیونٹی کے درمیان شراکت کے تصور کا ایک مفروضہ یہ تھا کہ بلدیاتی ادارے، اگر ان کو مناسب اعانت اور رہنمائی حاصل ہو تو فعال شریک کار ثابت ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ مفروضہ بڑی حد تک غلط ثابت ہوا۔ اختر حمید خاں اب پاکستان (یا کم از کم سندھ) کے موجودہ حالات اور ہندوستانی تاریخ کے بعض ادوار میں گہری مماثلت دیکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ حالات بالکل محمد شاہ رنگیلے کے دور کے حالات سے ملتے جلتے ہیں، جب وہ مغل سلطنت کے کھنڈروں پر اپنے اسلاف کی سی شان و شوکت کے ساتھ یوں حکومت کر رہا تھا جیسے کسی زوال کا وجود ہی نہ ہو۔ اختر حمید خاں کا موجودہ نعرہ، جس کی بنیاد ایک بار پھر ہندوستانی تاریخ پر ہے، یہ ہے کہ "ہمیں ایک ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کرنی چاہیے۔"

لیکن حالات اتنے مایوس کن نہیں جتنے اوپر بیان کیے ہوئے یو بی ایس اور عالمی بینک کے منصوبوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ ایک سرکاری محکمے، سندھ کچی آبادی اتھارٹی، نے او پی پی کا طریق کار بڑی کامیابی کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ اس کے کاموں میں سرخ فیتے کی کارفرمائی بہت کم ہو گئی ہے۔ اس نے کم لاگت کی ٹیکنالوجی استعمال کرنی شروع کر دی ہے۔ کچی آبادیوں کی سماجی اور ترقیاتی حالت میں بہتری کے کام میں کمیونٹی کے باشندوں کو بھی شامل کیا گیا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ سندھ کچی آبادی اتھارٹی نے خود کو علاقے کے باشندوں کی ان کوششوں میں شامل کر لیا ہے جو وہ اپنے علاقے کی بہتری کے لیے کر رہے ہیں۔ آمدن اور خرچ کا تفصیلی حساب رکھنے، کام کی مرحلہ وار نگرانی کرنے اور ہر چیز کو تحریر میں لانے کے سلسلے میں او پی پی کے نمونے کو اختیار کیا گیا ہے۔ اتھارٹی کے عملے کو او پی پی میں تربیت دی گئی ہے اور اتھارٹی کے ترقیاتی کاموں کے سلسلے میں او پی پی کنسلٹنٹ کے طور پر کام کر رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کا کچی آبادی امپرووومنٹ اینڈ ریگولرائزیشن پروگرام، جو بری طرح ناکام ہو چکا تھا، کراچی میں دوبارہ فعال ہو گیا ہے۔ اس طرح اختر حمید خاں کا طریق کار ایک بار پھر درست ثابت ہوا ہے۔ ایک اچھا افسر، اگر اس کے پاس قابلِ عمل نمونہ موجود ہو، اپنے محکمے کو درست کر سکتا ہے۔

او پی پی اور سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے درمیان شراکتِ کار، اتھارٹی کے سربراہ تسنیم احمد صدیقی نے شروع کی تھی۔ ان کا او پی پی کے ساتھ طویل تعلق رہا ہے، اور ایک زمانے میں، جب وہ اپنی ملازمت سے رخصت پر تھے، وہ او پی پی کے کاروباری قرضوں کے پروگرام کا انتظام رضاکارانہ بنیاد پر سنبھال چکے ہیں۔ لیکن اختر حمید خاں کو اس بات کا دکھ ہے کہ "پندرہ برس کے عرصے میں ہمیں صرف ایک تسنیم صدیقی ملے ہیں۔ اگر اس طرح کے دس افسر بھی ہمیں دستیاب ہو جائیں تو آپ اس کے نتائج کا اندازہ کر سکتے ہیں۔"

حکومت کے ساتھ کام کرنے کے تجربات کے برعکس، نئی این جی اوز اور کمیونٹی تنظیموں کے ساتھ او پی پی کا کام نہایت کامیاب رہا ہے۔ او پی پی آر ٹی آئی میں تربیت پانے کے بعد، اور تھوڑی بہت پیشہ ورانہ اور سماجی رہنمائی کے ساتھ، کراچی میں منظور کالونی کے باشندے اپنے علاقے میں نکاسی آب کا نظام اپنے خرچ پر قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، لاہور میں یوتھ کمیشن فار ہیومن رائٹس (YCHR) نے او پی پی کے کئی پروگراموں کی پیروی کی ہے اور اب ان کے دائرہ کار میں اضافہ کر رہا ہے، اور آرگنائزیشن فار پارٹیسپیٹری ڈویلپمنٹ (OPD) کے گوجرانوالہ کی غریب بستیوں میں او پی پی

کی طرز پر نکاسی آب اور کاروباری قرضوں کے پروگرام شروع کیے ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد کمیونٹی تنظیمیں پاکستان کے مختلف علاقوں میں او پی پی کے کاروباری قرضوں کے پروگرام کو کامیابی سے چلارہی ہیں۔ کراچی کے ابراہیم حیدری علاقے میں قرضوں کے پروگرام نے ماہی گیروں کو ٹھیکے داروں اور آڑھتیوں کے استحصال سے آزاد کر دیا ہے۔ دوسری طرف شہر کے دیہی علاقوں میں زرعی پیداوار بڑھ گئی ہے اور اس کا شہر اور اس کی معیشت سے تعلق قائم ہو گیا ہے، اور اب کاشت کار اور مویشی پالنے والے پہلے سے زیادہ تعداد میں قرضوں کی درخواستیں دینے لگے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ وائی سی ایچ آر اور او پی ڈی اپنے اپنے علاقے میں او پی پی کی طرح ترقی حاصل کر لیں اور ارد گرد کے علاقوں کے لیے تربیتی اداروں کی شکل اختیار کر لیں۔ انھوں نے اپنے کاموں کا دستاویزی ریکارڈ رکھنے، پروگریس رپورٹیں تیار کرنے، حسابات رکھنے اور امدادی اداروں سے مذاکرات کرنے میں او پی پی کا طریق کار استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔

نئی کمیونٹی تنظیموں، این جی اوز اور متعدد امدادی اور بین الاقوامی ترقیاتی اداروں پر اپنے اثرات قائم کرنے کے علاوہ او پی پی نے ساؤتھ ایشین پارٹنرشپ (SAP)، کینیڈا کی امداد سے چلنے والی ایک این جی او، اور یو این ڈی پی کے جی ای ایف اور لائف پروگراموں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ساؤتھ ایشین پارٹنرشپ کے سلسلے میں اس اثر کی وجہ یہ ہے کہ اختر حمید خاں اس کی گورننگ کاؤنسل میں شامل تھے۔ جی ای ایف اور لائف پروگراموں کے کوآرڈینیٹر سرکاری منصوبوں میں کمیونٹی کے باشندوں کی شراکت میں پیش آنے والے مسائل سے اپنے تجربے کی بنا پر آگاہ تھے اور اختر حمید خاں کے کیے ہوئے کام سے بھی واقف تھے۔ ان تمام پروگراموں میں زیادہ زور انسانی وسائل کو ترقی دینے اور تحقیق، تربیت اور خود نگرانی کے ذریعے ان کو تقویت پہنچانے پر رہا ہے۔ یہ پروگرام دوسرے ملکوں میں بھی کام کر رہے ہیں، لیکن پاکستانی پروگرام اور دوسرے ملکوں کے پروگراموں کے درمیان واضح فرق ہے۔ اور یہ فرق اختر حمید خاں اور او پی پی کے قائم کیے ہوئے نمونوں کے اثر کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ او پی پی کے طریق کار کو آغا خان فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام شمالی علاقوں میں واقع کریم آباد میں چلائے جانے والے کنزرویشن پروجیکٹ اور او ڈی اے (برطانیہ) کی امداد سے چلائے جانے والے فیصل آباد اربن ڈویلپمنٹ پروجیکٹ میں بھی استعمال کیا جارہا ہے۔

او پی پی کا تعلق کراچی کے کئی تعلیمی اداروں کے ساتھ بھی رہا ہے۔ ان میں آغا خان میڈیکل

یونیورسٹی، بقائی میڈیکل یونیورسٹی اور داؤد کالج آف انجنیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کا ڈیپارٹمنٹ آف آرکیٹیکچر اینڈ پلاننگ شامل ہیں۔ تاہم، یہ تعلق صرف داؤد کالج ہی کے سلسلے میں مزید بڑھا اور مضبوط ہوا ہے۔

داؤد کالج نے او پی پی کو اس کے پروجیکٹ ایریا میں کی جانے والی ریسرچ اور دستاویزی ریکارڈ کی تیاری کے لیے طالب علموں کی مدد فراہم کی ہے، اور اس کے کام کا کراچی کا ایک مجموعی تناظر قائم کیا ہے۔ دوسری طرف اورنگی کی صورت میں داؤد کالج کو اپنے طلبہ کی تعلیم کے لیے ایک پروجیکٹ ایریا دستیاب ہوا ہے جو غریب بستیوں میں وہاں کے باشندوں کی شمولیت سے کیے جانے والے ترقیاتی کام کا ایک نمونہ ہے۔ او پی پی سے اپنے اس تعلق کی بدولت داؤد کالج کراچی کی زمینی حقیقت سے وابستہ ''سماجی طور پر باشعور'' آرکیٹیکٹ تیار کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ تھیوری اور عملی تجربہ مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ لیکن اس بات کی نشان دہی ضروری ہے کہ ان دونوں اداروں کے درمیان اس تعلق کے پھلنے پھولنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ او پی پی کے عملے میں شامل پیشہ ور ماہرین داؤد کالج ہی کی پیداوار ہیں، اور او پی پی آر ٹی آئی کی ڈائرکٹر اور او پی پی کے کنسلٹنٹ دونوں داؤد کالج میں پڑھاتے ہیں۔ اس طرح داؤد کالج کے طلبا کو شہری ترقی کے ایک نئے، اختراعی اور کامیاب عمل میں باقاعدہ حصہ لینے کا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ نئے قائم ہونے والے پروجیکٹ اور بین الاقوامی ادارے ان گریجویٹوں کو اپنے عملے میں شامل کرنے کے سلسلے میں ترجیح دیتے ہیں۔

او پی پی کی مستقبل کی سمت اب پوری طرح واضح ہے۔ اس کا بنیادی کام کمیونٹی کی بنیاد پر قائم ہونے والی چھوٹی تنظیموں اور نوجوان کارکنوں کی مدد کرنا ہے تاکہ وہ او پی پی کے طریق کار اور پروگراموں کو اپنے طور پر چلانے اور آگے بڑھانے کے قابل ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے او پی پی ان کو تربیت اور رہنمائی فراہم کرتا ہے اور انھیں چھوٹی رقمیں حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے تاکہ ان تنظیموں کے عملے کے ارکان اور کارکن روزی کمانے کی فکر سے کسی قدر آزاد ہو سکیں۔ اس کے علاوہ او پی پی ان گروپوں کو علم اور خیالات سے لیس کرتا ہے تاکہ وہ اپنے کام کا بخوبی حساب رکھ سکیں، اور اپنے یا سرکاری محکموں کے کیے ہوئے کام کی نگرانی کر سکیں، اور جو کام وہ خود کرنے کے قابل نہ ہوں اس کے لیے سرکاری محکموں کو سستے اور موزوں قابلِ عمل منصوبے تیار کر کے دے سکیں۔ اگرچہ او پی پی اب بھی حکومت کے ساتھ کام جاری رکھنے کو تیار ہے، لیکن اس کا خیال ہے کہ سرکاری محکموں کو کام کرنے پر صرف باشعور اور منظم باشندے مجبور کر سکتے ہیں نہ کہ حکومت، این جی اوز اور بین الاقوامی اداروں کے درمیان طے پانے والے

معاہدے۔ اپنے طے کردہ اس کردار کو ادا کرنے کے لیے او پی پی کے ادارے مناسب اہلیت حاصل کر چکے ہیں اور کمیونٹی کے باشندوں کی تربیت اور تعلیمی اداروں سے متواتر تعلق کے ذریعے پیشہ ور ماہروں، تکنیکی کارکنوں اور سماجی تنظیم کاروں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس طرح ایک نئی اور وسیع کمیونٹی پیدا ہو رہی ہے۔

اختر حمید خاں اب اکیاسی برس کے ہیں۔ وہ تعلیم، رہنمائی اور تجزیہ فراہم کرنے کے مقصد سے ہر روز اورنگی آتے ہیں، اور ان کا کہنا ہے کہ اس عمل کے ذریعے وہ اپنی ہوشمندی برقرار رکھتے ہیں۔ وہ خود کو نانا یا دادا اور او پی پی کے عملے کو اپنے نواسے نواسیاں سمجھتے ہیں۔ لوگ ان سے ملنے بھی برابر آتے رہتے ہیں۔ ان میں اورنگی میں قائم تنظیموں کے نمائندے، مقامی کارکن، پاکستان کے مختلف شہری اور دیہی علاقوں کی تنظیموں کے ارکان، بین الاقوامی اداروں اور سرکاری محکموں کے نمائندے اور کنسلٹنٹ، مقامی اور بیرونی صحافی اور پرانے دوست اور ساتھی شامل ہیں۔ وہ سب ان سے کچھ نہ کچھ سیکھ کر اٹھتے ہیں۔

او پی پی کے تیار کردہ عملی نمونے کو پورے پاکستان کے تناظر میں دیکھا جانا ضروری ہے تاکہ اس نمونے کی اہمیت کا پورا اندازہ ہو سکے۔ پاکستان کا رسمی سیکٹر شہری علاقوں میں سال بھر میں صرف ایک لاکھ ۸۰ ہزار ۶۰۰ رہائشی یونٹ تیار کرتا ہے، جبکہ مانگ ۴ لاکھ ۲۸ ہزار رہائشی یونٹوں کی ہے۔ ۲ لاکھ ۷۵ ہزار چار سو یونٹوں کی سالانہ بقیہ ضرورت کچی آبادیوں کے قیام اور زرعی زمین کی غیر رسمی تقسیم کے ذریعے سے پوری ہوتی ہے۔ (۲۱) اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان میں اس وقت تقریباً تین ہزار کچی آبادیاں ہیں جن میں ۷۰ لاکھ افراد رہتے ہیں۔ یہ تعداد پاکستان کی کل شہری آبادی کے تقریباً ۲۲ فیصد حصے کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ ایک کروڑ ۲۰ لاکھ سے زیادہ لوگ شہروں کی سرحدوں پر واقع غیر رسمی طور پر تقسیم کی ہوئی زرعی زمینوں، ماحولیاتی لحاظ سے غیر محفوظ علاقوں اور ویران میدانوں میں رہتے ہیں۔ ان غریب بستیوں اور کچی آبادیوں میں پائے جانے والے حالات ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ پاکستان کے شہری علاقوں کے ۵۵ فیصد باشندے شہری سہولتوں سے مکمل یا جزوی طور پر محرومی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان غیر رسمی بستیوں اور کچی آبادیوں میں اضافے کی شرح کا تخمینہ ۱۰ فیصد سالانہ ہے، جبکہ شہری علاقوں کی کل آبادی ۴.۸ فیصد سالانہ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ (۲۲) ان اعداد و شمار سے بحران کی شدت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ان کچی آبادیوں اور غیر رسمی بستیوں کی مادی، سماجی اور معاشی ترقی کے لیے بنائے جانے والے

سرکاری منصوبے مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔ کچی آبادی امپروومنٹ اینڈ ریگولرائزیشن پروگرام ہر سال ان میں سے صرف ایک فیصد بستیوں کو باقاعدہ کرنے اور ان کی حالت میں بہتری پیدا کرنے کا کام کر پاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ جو بستیاں اِس وقت موجود ہیں ان کو باقاعدہ کرنے میں سو برس کا عرصہ لگے گا۔ دوسری طرف او پی پی کے چلائے ہوئے رہائش اور نکاسی آب کے پروگراموں نے بڑی مثبت ماحولیاتی تبدیلیاں پیدا کی ہیں، اور حکومت پر ایک پیسے کا بوجھ ڈالے بغیر اورنگی ٹاؤن شپ کے اسی فیصد حصے نے نکاسی آب کا نظام اپنے طور پر قائم کر لیا ہے۔ او پی پی کے نکاسی آب اور صحت عامہ کے پروگراموں کے نتیجے میں شیر خوار بچوں کی اموات کا تناسب، جو ۱۹۸۴ء میں ۱۳۰ فی ہزار تھا، ۱۹۹۱ء تک گھٹ کر ۳۷ فی ہزار ہو چکا تھا۔(۲۳) اسی طرح اورنگی کے علاقے میں قائم اسکول، حکومت یا کسی اور خارجی ذریعے سے کوئی امداد حاصل کیے بغیر، وہاں کی شرحِ خواندگی کو ۷۸ فیصد تک پہنچا چکے ہیں جبکہ کراچی کی مجموعی شرحِ خواندگی تقریباً ۶۲ فیصد ہے۔

اس کے علاوہ، کراچی ماسٹر پلان کے تیار کردہ ۱۹۸۹ء کے تخمینے کے مطابق کراچی میں روزگار کے ۷۵ فیصد مواقع غیر رسمی سیکٹر فراہم کرتا ہے اور کراچی میں بےروزگاری کا تناسب ۲۰۰۰ء تک ۱۲ فیصد ہو جائے گا۔ پلان میں مزید کہا گیا ہے کہ بےروزگاری کو اس سطح پر رکھنے کے لیے ہر سال ۱۱ لاکھ ملازمتوں کی ضرورت ہو گی۔ چنانچہ یہ بات ظاہر ہے کہ موجودہ صورت حال میں ملازمتوں کے مواقع پیدا کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ غیر رسمی سیکٹر کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اسے قرض، تکنیکی امداد اور انتظامی رہنمائی فراہم کی جائے جو انھیں کسی ذریعے سے دستیاب نہیں ہے۔ اس لحاظ سے او پی پی کا کاروباری قرضوں کا پروگرام افراطِ زر، کساد بازاری اور بےروزگاری کا مقابلہ کرنے کا ایک بہت اہم ذریعہ ہے۔

اس تعارف کو ختم کرنے سے پہلے یہ بات کہنا ضروری ہے کہ اختر حمید خاں کے شروع کیے ہوئے کئی پروگرام ایسے ہیں جن کی کامیابی مزدور طبقے کی عورتوں کے ادا کیے ہوئے کردار کی مرہون منت ہے۔ اس کتاب میں شامل کئی مضامین میں ان پروگراموں کی تفصیل اور متعلقہ مسئلے کے سلسلے میں اس کا اختیار کردہ طریق کار بیان کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "بڑے شہر کی صنعتی تہذیب کے دباؤ نے، جسے اورنگی کے باشندوں نے بنسی خوشی اپنایا ہے، اور ہماری بد انتظامی کی شکار معیشت کی پیدا کردہ بےپناہ مہنگائی نے اورنگی کے معاشرے میں عورت کے کردار کو ڈرامائی طور پر بدل دیا ہے۔ پرانے پدر پرست طریقے سے زندگی گزارنا اب ناممکن ہو گیا ہے۔ ان لوگوں نے پردہ نشیں محتاجوں کے بجائے آزاد معاشی

کارکن بننے کے عمل میں اپنے گھر کی عورتوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ گھروں کو کارخانوں میں تبدیل کر لیا گیا ہے۔ گلی گلی میں چھوٹے کاروباری یونٹ قائم ہوئے ہیں۔ اور نگی کی ان گھریلو صنعتوں میں عورتیں اکثریت نہیں تو ایک بہت بڑی اقلیت کے طور پر حصہ لے رہی ہیں۔" (۲۴) وہ مزید لکھتے ہیں: "میں نے ان باروزگار عورتوں، ان استانیوں اور ان طالبات کا بڑی احتیاط سے مشاہدہ کیا ہے۔ بلاشبہ یہ عورتیں ہمارے معاشرے کا ایک بالکل نیا مظہر ہیں۔ وہ میری ماں کی طرح پردہ نشیں نہیں ہیں۔ عملی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے باوجود انھوں نے پرانی تہذیب کے نسوانی وقار کو قائم رکھا ہے۔ میری ماں کے برعکس، وہ نہ چادر اوڑھتی ہیں اور نہ چاردیواری میں قید رہتی ہیں۔ اس کے باوجود بنیادی طور پر ان کے طور طریقوں میں اتنی ہی حیاداری موجود ہے جتنی میری ماں کے طور طریقوں میں تھی۔ میں ان باروزگار عورتوں، ان استانیوں اور ان طالبات کے وجود کو اورنگی کے لوگوں کی سب سے نفیس کامیابی سمجھتا ہوں۔ یہ عورتیں ماضی اور حال کے درمیان ایک زندہ رشتے کی سب سے نمایاں مثال ہیں اور اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی ہماری تیاری کی بہترین علامت ہیں۔ (۲۵) اور اختر حمید خاں اور ان کے زندگی بھر کے کام کی سمت بلاشبہ اکیسویں صدی کی جانب ہی ہے۔

(کراچی، ۳۱ اگست ۱۹۹۵)

نوٹس

(۱) باب ۶: "میں نے کومیلا اور اورنگی میں کیا سیکھا"
(۲) باب ۱: "تبدیلی کی ذاتی یادیں"
(۳) ایضاً۔
(۴) باب ۳: "مجھے نطشے پسند تھا"
(۵) باب ۱: "تبدیلی کی ذاتی یادیں"
(۶) ایضاً۔
(۷) ایضاً۔
(۸) ایضاً۔
(۹) باب ۳: "مجھے نطشے پسند تھا"
(۱۰) "خواندگی اور تعلیم بالغاں کے میدان میں میرے پچاس برس"
(۱۱) باب ۳: "مجھے نطشے پسند تھا"
(۱۲) ایضاً۔
(۱۳) ایضاً۔
(۱۴) ایضاً۔
(۱۵) ایضاً۔
(۱۶) باب ۹: "اورنگی میں تشدد کا سد باب"
(۱۷) "اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے پروگرامز"
(۱۸) اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کا تجزیہ (دیکھیے ضمیمہ ۱)
(۱۹) دیکھیے ضمیمہ ۲
(۲۰) او پی پی کی ۱۳ویں پروگریس رپورٹ
(۲۱) "پاکستان لو کاسٹ ہاؤسنگ پروجیکٹ رپورٹ": ایشین ڈویلپمنٹ بینک، ۱۹۸۹ء
(۲۲) ۱۹۸۹ء کے ایشین ڈویلپمنٹ بینک کے اعداد و شمار کی بنیاد پر مصنف کا تخمینہ۔
(۲۳) الفلاح کالونی، اورنگی، میں آغاخان یونیورسٹی اور او پی پی کے کرائے ہوئے صحت کے سروے کے نتائج سے لیے گئے اعداد و شمار۔
(۲۴) "اورنگی میں روایت اور تبدیلی"
(۲۵) ایضاً۔

تبدیلی کی ذاتی یادیں

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں تبدیلی کے موضوع پر ایک مقالہ لکھوں۔ یقیناً ایک بوڑھا آدمی، جو ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوا اور جس نے دو عالمی طاقتوں، برطانیہ اور سوویت یونین، کا زوال دیکھا، اور دو ملکوں، ہندوستان اور پاکستان، کی تقسیمیں دیکھیں، بڑے انقلابات کا شاہد ہے۔ میں کوئی تربیت یافتہ ماہرِ عمرانیات نہیں ہوں اس لیے کوئی عالمانہ رائے نہیں دے رہا، بلکہ اپنی ذاتی یادوں کو، جو ایک بوڑھے کے افسانے ہیں، بیان کر رہا ہوں جن کی صحت ایک ناول نگار کے بیان کیے ہوئے قصوں سے زیادہ نہیں۔

میرے والد ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ میرے والد اور والدہ کا تعلق آگرے کے شرفا کے طبقے سے تھا؛ آگرہ اکبر بادشاہ کا شہر تھا، سلطنتِ مغلیہ کا مرکز، غالب، میر اور میاں نظیر کا شہر۔ میرے والدین تین سو سالہ مغل تہذیب کی پیداوار تھے جو ہندی مسلم خیالات کا مرکب تھی۔ یہ قدیم تمدن اپنے دورِ زوال میں مغربی اثرات قبول کر رہا تھا۔ میرے والدین کے بچپن میں سید احمد خاں زندہ تھے اور ان کی اصلاحی تحریک عروج پر تھی جس سے شدید محبت اور شدید نفرت کا رنگ لیے ہوئے مباحثے جنم لے رہے تھے۔ میرے والد نے آگرہ کالج میں تعلیم پائی تھی اور والدہ نے گھر پر انگریزی پڑھی تھی۔

سید احمد خاں دہلی کے شرفا میں سے تھے۔ انھوں نے ملازمت کی ابتدا نچلے درجے کے انگریزی سرکاری افسر کی حیثیت سے کی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے، جنھیں وہ خود غدر کا نام دیتے ہیں اور پاکستانی تاریخ داں جنگ آزادی سے تعبیر کرتے ہیں، ان کو سخت صدمہ پہنچایا۔ سید احمد خاں اپنے اجتماعی حالات کا ایک تکلیف دہ تجزیہ کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلم شرفا کو اصلاح

کی شدید ضرورت ہے؛ اگرچہ ان کے روحانی عقائد اور عبادات درست ہیں، لیکن تعلیمی اور معاشرتی اقدار پس ماندہ ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مدارس میں جو نصاب رائج ہے (وہ خود بھی مدرسے کے فارغ تھے) اور جس کی بنیاد درسِ نظامی پر ہے، نہایت محدود ہے، اور جدید علوم مثلاً طبیعیات اور عمرانیات سے ناآشنا ہے۔ ان کا پریشان کن مشورہ یہ تھا کہ مسلم شرفا کو، اگر وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں، ہندو شرفا کی طرح انگریزی تعلیم اپنانی چاہیے۔ اس کے علاوہ ان کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنی چاہیے اور آپس کے جھگڑوں سے بچنا چاہیے۔ ان کو کئی بیویاں، باندیاں اور ناچنے والیاں رکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ دراصل سید احمد خاں وکٹوریہ کے عہد کے انگریز شرفا کی تقلید کے قائل تھے، جن کو نیومن اور آرنلڈ نے مثالی بنا کر پیش کیا ہے — پاک دامن، روشن خیال، مہذب، بُردبار، محنتی اور خادمِ خلق۔ ہم کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اسی قسم کے وکٹورین شرفا دنیا کی سب سے بڑی حکومت چلا رہے تھے اور ان کے مٹھی بھر ساتھی ہندوستان پر حاکم تھے۔

سائنسی روشن خیالی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور بردبار معاشرے کا قیام کے حق میں سید احمد خاں کی صدا مقبول ہوئی اور دہلی، آگرہ، لکھنؤ، لاہور، پشاور، پٹنہ، ڈھاکہ، حیدر آباد اور مدراس کے شرفا نے جوق در جوق ان کا ساتھ دیا۔ لیکن دوسری جانب اس مصلح کو جمال الدین افغانی جیسے انقلابیوں نے ذاتی ترقی کا خواہش مند اور غدار ہونے کا الزام دیا اور قاسم نانوتوی جیسے عالمِ دین نے فرنگی نواز اور خارجی گردانا۔ جمال الدین افغانی نے مسلم ممالک کے بادشاہوں، شاہِ ایران اور سلطانِ ترکی سے کہا کہ وہ انگلستان اور روس کے خلاف جہاد کا اعلان کریں اور عام مسلمانوں سے مطالبہ کیا کہ ایشیا، افریقہ، چین اور ہندوستان میں کافروں سے جنگ کریں۔ افغانی کے خیال میں سید احمد کا تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کا دعویٰ جہاد کی راہ روکنے کی ایک غدارانہ کوشش کے سوا کچھ نہ تھا جبکہ جہاد ہی ملت کی نجات کی واحد راہ تھی۔ مولانا قاسم کے خیال میں قدیم درسِ نظامی بالکل درست تھا، اس کے برخلاف اسکول کے درس میں یہ خرابی تھی کہ بچے اس کے ذریعے عیسائی ہو جائیں گے۔ جہاں تک قوم کے اخلاق کا تعلق تھا، ان کے خیال میں اس میں کوئی خرابی نہیں تھی، سوائے اس کے کہ مسلمان بزرگوں کے مزاروں پر دعا مانگتے تھے اور شادیوں میں ہندو رسم و رواج اپناتے تھے۔

ایک زیادہ پُرفریب حملہ سید احمد کے اپنے حامیوں کی طرف سے ہوا۔ شرفا کے ذہنی اور

اخلاقی زوال کے دفاع میں ان لوگوں نے تاریخ کی مثالی، خوب صورت، صاف ستھری تصویر پیش کی جس سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ ہمارے قدیم ادارے، ہماری تہذیب اور تمدن بہترین تھے اور یورپ ہم کو کچھ نہیں سکھا سکتا؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی ترقی یافتہ، روشن خیال فلسفہ، سائنس اور حرفت یورپ نے حاصل کی ہے وہ اس کو ابنِ سینا جیسے مسلم علما سے ملی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر نئے زمانے کے شرفا ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ان کو مغرب کی سمت جانے کی بجائے ماضی میں سفر کرنا چاہیے۔ میں خود اپنے بچپن کے تجربے سے جانتا ہوں کہ سنہری دور کی یہ مثالی داستانیں ہمارے لیے فرحت کا باعث ہوتی تھیں۔ ہم ایسے شرفا جو شکست خوردہ اور غریب تھے، اس ٹانک کی بڑی بڑی خوراکیں اس لیے لیتے کہ اس سے ہمارا ٹوٹا ہوا افتخار واپس آ جاتا اور ہم کچھ وقت خواب و خیال میں گزار لیتے۔ ناقد مصلحین ہمارے "پدرم سلطان بود" کے رویّے کے خلاف تھے۔ وہ اندھی آسودہ خاطری اور ضد کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ خیال کرتے تھے، لیکن ہمارے خودپسند عذرخواہوں نے ہماری انا کو بے حد قوی کر دیا تھا۔

علمی اور اخلاقی زوال کے علاوہ شرفا کو ایک اَور سنگین بحران کا سامنا تھا: وہ یہ کہ وہ اپنی سیاسی حیثیت کا تعین کس طرح کریں۔ اکبر بادشاہ اور حضرت اورنگ زیب اور اُن کے دور کے شرفا کے سامنے یہ مسئلہ نہیں تھا کیوں کہ وہ ایک حاکم طبقے، ایک شاہی اقلیت سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ہندوؤں کے ساتھ کرم کا یا سختی کا برتاؤ اپنی مرضی سے کر سکتے تھے۔ ان کو شناخت کا بحران درپیش نہیں تھا۔ وہ بُراعتماد انداز میں اپنے آپ کو ہندوستانی اور مسلمان کہتے تھے۔ لیکن اب مسلم شرفا شکست خوردہ تھے؛ پہلے وہ نادر شاہ سے ہارے، پھر مرہٹوں اور سکھوں سے، اور آخر میں انگریزوں نے ان کو روند ڈالا۔ مصری، ترکی، ایرانی اور انڈونیشی مسلمانوں کے برخلاف، ہندی مسلمان اقلیت میں تھے۔ ایک حاکم اقلیت کی شکست اسے ایک سخت کش مکش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ سید احمد خاں نے مختلف تجاویز پر غور کیا جو اختیار کی جا سکتی تھیں۔ ایک تجویز جو انھوں نے سختی سے رد کر دی، یہ تھی کہ ہندی مسلمان انگریزوں سے ترکِ موالات کریں اور ان سے اُس وقت تک جنگ کریں جب تک گئی ہوئی حکومت واپس نہ آ جائے۔ جہاں تک ہندو اکثریت سے تعلقات کا سوال تھا اس میں وہ متذبذب تھے۔ اس سلسلے میں وہ ایک مشہور تشبیہ بیان کرتے کہ ہندوستان ایک خوب

صورت دلھن ہے اور ہندو اور مسلمان اس دلھن کی دو آنکھیں؛ ان کو آپس میں اسی طرح امن سے رہنا چاہیے جیسے اکبر بادشاہ کے عہد میں رہتے تھے۔ لیکن بیشتر وقت وہ ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف رہتے تھے۔ انھوں نے مسلم شرفا کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی الگ شخصیت کو قائم رکھیں اور ملازمت میں تحفظ اور کوٹا مانگیں۔ میرے والد کے اور میرے ہم عصر خوف زدہ شرفا امیر خسرو، رحیم خان خاناں، ملک محمد جائسی اور میاں نظیر اکبر آبادی کی سی متاثر کن صلاحیت اور دلیری سے محروم تھے، اسی لیے انھوں نے سید احمد خاں کے زیرِاثر تقسیم، تحفظ اور کوٹے کا مطالبہ کیا، جن سے ہم کو بہت سے فائدے ہوے، جیسے میرا آئی سی ایس میں انتخاب۔

آگرے اور دہلی کے شرفا کا ایک قیمتی ورثہ ان کا صوفیا کے روحانی طریقے سے تعلق تھا۔ اس رشتے نے ان کو یہ باور کرایا تھا کہ دنیا کی چمک دمک، یعنی نفس پسندی، کھانا، شہوت، دولت اور عیش و آرام ناپائیدار ہیں؛ سراب کی مانند وہ کچھ دیر کے لیے خوشی دیتے ہیں لیکن آخرکار روح کو زنجیریں پہناتے ہیں۔ اگر کسی کو آزاد اور مطمئن زندگی کی خواہش ہے تو اس کو نفسانی خواہشوں پر، دولت کے لالچ اور حکومت کے شوق پر قابو پانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی اس کو ذکر، مراقبے اور مشاہدے کے ذریعے روحانی دنیا سے تعلق پیدا کرنا چاہیے جو مثالی ہے اور ہمیشہ زندہ، دائم وقائم رہنے والی ہے۔ صرف اسی طرح اس کا قلب مطمئن ہو سکتا ہے۔ منگول افواج کی یلغار اور غارت گری کے بعد اسلامی دنیا میں صوفیا کی تحریک ایک پوشیدہ لیکن اہم قوت بن گئی جس نے بہت سے مردوں اور عورتوں کو مشکل ترین حالات میں بھرپور پُرمعنی زندگی گزارنے کا موقع فراہم کیا؛ اس قوت نے برادریوں کو دوبارہ زندہ کیا۔ کئی موقعوں پر ظالم فاتح اس زہد سے متاثر ہو کر تبدیل ہو گئے۔ صوفیا کے روحانی مقاصد اور مراقبوں کو امام غزالی کے اثر سے ٹکسالی علما نے بھی اپنا لیا جن پر ان طریقوں کا یہ اثر ہوا کہ وہ نرم خو اور محبت کرنے والے ہو گئے۔ صوفی عقائد مثلاً عفو، صبر، توکل، فقر، رضا اور دردمندی نے ادب اور تمدن میں گھر کر لیا۔ لیکن انیسویں صدی کے آخر تک صوفیا کی خانقاہیں شعبدہ بازوں اور ظاہری تصوف کا مرکز بن کر اتنی ہی زوال آمادہ ہو چکی تھیں جیسے مدارس۔ علما کے برخلاف صوفیا کبھی مباحثوں میں نہیں الجھے، اس کے باوجود جنگجو انقلابیوں اور بےچین مصلحوں دونوں نے صوفیا کی صلح پسندی، زہد، صبر، رضا اور سیاست سے اجتناب پر حملہ کیا۔

خوش قسمتی سے میں لڑکپن ہی میں مولانا روم کی مثنوی کے ذریعے، جس نے مجھے بے حد مسحور کیا، صوفیا کے ہمہ گیر آفاقی فلسفے سے آگاہ ہو گیا تھا۔ ٹالسٹائے اور گاندھی جیسے اہلِ باطن کی مثالوں نے میرے اس شغف میں اضافہ کیا۔ میں اُس وقت سے لے کر تمام عمر اسلامی، مسیحی، ہندی اور چینی علمِ باطن کا طالب علم رہا ہوں۔ اپنے نہایت نامکمل انداز سے میں نے صوفیا کے طریقے پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کو زندگی کے ہر دور میں بارآور پایا ہے ـــــ ذاتی خوشی کے معاملے میں بھی اور گھریلو یا باہری زندگی میں بھی۔

میری والدہ ایک فرض شناس بیوی اور ماں کے اُس تصور کی پابند تھیں جس کی تفصیل "بہشتی زیور" میں بیان کی گئی ہے۔ وہ ایثار پسند اور ہمدرد خاتون تھیں۔ ان کو کتابوں اور خیالات سے عشق تھا۔ وہ مجھے، اپنے بڑے بیٹے کو، کتابیں پڑھ کر سناتی تھیں: حالی اور اقبال کی نظمیں، شبلی اور شرر کے تاریخی رزم نامے، محمد علی جوہر کی تقریریں اور ابوالکلام آزاد کے مذہبی مکالمے۔ انھوں نے مجھے کتابوں سے محبت سکھائی اور سادگی اور بلند خیالی کا درس دیا۔ میرے والد ایک پولیس انسپکٹر تھے جنھوں نے کبھی رشوت نہیں لی۔ وہ اپنے وقت کی جنسی عیاشی سے بہت دور تھے، اپنے افسروں کی خوشامد نہیں کرتے تھے اور دفتر کو یا روزانہ کی چار میل کی سیر کو کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے۔ سید احمد خاں کے سچے شاگرد کے طور پر انھوں نے اپنے رہنما کی طرح مسلم زُہد اور وکٹورین جنٹلمین کی خوداحتسابی کو اپنے اندر سمو لیا تھا اور یہ دونوں عمدہ اصول شکر اور دودھ کی طرح گھل مل گئے تھے۔ میں نے اپنے والد سے ایمان داری کی قدروقیمت سیکھی اور اس کے نتیجے کے طور پر خوف اور پریشانی سے نجات کا تجربہ کیا۔ میرے لڑکپن کا گھر، بہت سے دوسرے شرفا کے گھروں کی طرح، سید احمد خاں کی اصلاح کا ثمر تھا۔ ان گھرانوں کا عقلی اور اخلاقی ماحول قدیم شریف گھرانوں سے مختلف تھا: نہ کئی بیویاں، نہ باندیاں، نہ ناچنے والیاں؛ نئے خیالات، نئی توقعات، نئے طور طریق اور نئے شب و روز۔

سید احمد کی وفات سے ایک نسل بعد، مسلم شرفا باقاعدگی سے اسکولوں میں تعلیم پاتے تھے۔ کسی کو یہ وہم نہیں تھا کہ انگریزی اور سائنس پڑھنے کا مطلب اسلام کو چھوڑ دینا ہے۔ بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ جدید سائنس اور حرفت نہیں حاصل کریں گے تو ہمیشہ غریب اور غلام رہیں

گے۔ ہر ایک نے دیکھا کہ نئے اسکولوں نے مرتد پیدا کرنے کی بجائے اسلام کے شیدائی پیدا کیے جیسے مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال اور قائد اعظم جناح۔ وقت کی رو اس وقت بالکل ہی پلٹ گئی جب مصر میں علامہ عبدہ نے جامعہ ازہر میں اسکولوں کا نصاب رائج کیا اور شمس العلما ابو نصر وحید نے بنگال کے مدارس میں انھی خطوط پر اصلاحات کیں۔ آج کراچی کے بہترین مدارس انگریزی زبان یا جدید علوم سے خوف زدہ نہیں؛ بلکہ وہ عالموں کو پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے غیر ملکی یونیورسٹیوں میں بھیجتے ہیں اور اپنے نصاب میں میڈیکل اور انجنیئرنگ کے شعبے شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں امید کرنی چاہیے کہ باغِ جنت میں، جہاں دونوں بزرگ گئے ہیں، مولانا قاسم دوستانہ ماحول میں سید احمد خاں سے ملاقات کریں گے اور محبت سے ان کے ہاتھ کا بوسہ لیں گے۔

جدید تعلیمی نظام، جسے مسلم شرفا نے اپنایا، ایک وسیع المشرب مظہر ہے۔ یہ نظام پہلے مغرب میں مکمل ہوا اور اس کو، سید احمد خاں سے بہت پہلے، ہندوؤں، جاپانیوں، چینیوں، مصریوں اور ترکوں نے اپنا لیا تھا۔ یہ مسیحی پادریوں، قدیم چینیوں یا برہمنوں کے نظامِ تعلیم کی طرح محدود یا جامد نہیں۔ جدید تعلیمی نظام ہر دس سال میں بدل جاتا ہے۔ آج کا انگریزی اسکول وکٹورین اسکول سے بالکل مختلف ہے۔ وہ زمانہ بیت گیا جب پُرامن ماحول میں آکسفورڈ اور کیمبرج میں تین سو سال تک درسِ نظامی کے انداز کا نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ ہمارے ہنگامہ پرور دور میں ہر دس بیس سال میں نئے پریشان کن مسائل وجود میں آجاتے ہیں، جن سے نمٹنے کے لیے نئے نئے طریقے رائج کیے جاتے ہیں اور نصاب کو بار بار بدلا جاتا ہے۔ وسیع المشرب نظامِ تعلیم پادریوں کی جاگیر نہیں، جیسا قرونِ وسطیٰ میں تھا، اور نہ اشرافیہ کی جاگیر جیسے وکٹوریہ کے زمانے میں تھا۔ آج کل تعلیمی نظام کی ایک وسیع قومی بنیاد ہے۔ یہ عوام کی ضروریات کو بھی کسی حد تک پورا کرتا ہے۔ حالاں کہ ہم نے ابھی وہ وسعت حاصل نہیں کی جو جرمنی اور جاپان کے تعلیمی نظام میں ہے، لیکن ہم اسی سمت میں رواں ہیں۔

سید احمد خاں کی کوششوں کے مقاصد ذہنی نشاۃ ثانیہ اور اخلاقی اصلاح دونوں تھے۔ کئی سال تک ان کا پرچہ ''تہذیب الاخلاق''، اور اس کا مشہور معاصر ''اودھ پنچ''، اور حالی جیسے شاعر، اور نذیر احمد جیسے ناول نویس، شرفا کی عیاشیوں، اُتھلے پن، پھکڑپن اور ظالمانہ عادات کو ملامت، مذاق، طنز

اور مذمت کا نشانہ بناتے رہے۔ یہ مہم بہت موثر ثابت ہوئی۔ جب تک میں جوان ہوا، مسلم شرفا کا طبقہ اپنی خراب عادتوں کو چھوڑ کر میرے والدین کی طرح بردبار، محنتی، منکسر اور نرم خو ہو چکا تھا۔ بدقسمتی سے اخلاقی اصلاح کی یہ تحریک اپنی رفتار قائم نہیں رکھ سکی۔

سید احمد خاں اسلامی سادگی اور وکٹورین پبلک اسکول کے شخصی نظم وضبط کو باہم جوڑنے کی خواہش رکھتے تھے۔ ان کے اصولوں کی پابندی کرنے والے شرفا نیک، محنتی، جزرس، نرم خو اور مخیر ہوتے تھے۔ وہ خدا، اپنی قوم اور اپنے خاندان کے اور اپنے حقوق نہایت وفاداری سے ادا کرتے تھے۔ میں نے اپنے لڑکپن میں بہت سے ایسے بزرگ دیکھے ہیں، لیکن افسوس، ہر عشرے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد کم ہوتی گئی۔ ہو سکتا ہے مجھ پر بڑھاپے کے تعصب کا غلبہ ہو گیا ہو۔ لیکن میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ۱۹۳۸ء میں جب میں پہلی دفعہ بنگال گیا تو اس وقت وہاں سترہ آئی سی ایس افسر تھے۔ وہ تمام بےداغ شہرت رکھتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں جب میں دوبارہ مشرقی پاکستان گیا تو میرے یہ ساتھی بڑے بڑے عہدوں پر متمکن تھے۔ میں نے افسوس کے ساتھ دیکھا کہ ایک ایک کر کے وہ سب، زر، زن اور زمین کی ترغیبوں کا شکار ہو گئے۔ سترہ میں سے صرف تین بےداغ رہے۔ اور یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ اس کے بعد اوسط اَور خراب ہوا ہے۔ اگر سید احمد آج آ جائیں تو وہ یہ دیکھ کر دل شکستہ ہوں گے کہ ان کے روحانی شاگرد اسلامی سادگی اور وکٹورین نظم وضبط کو تج کر لارڈ کارنوالس سے پہلے کے کمپنی کلرکوں کی عادت اپنا چکے ہیں جو اپنے سرکاری اثر سے لوٹ مار کر کے چوری اور رشوت کے ذریعے نواب بن جاتے تھے۔

بےشک پس ماندگی اور زوال میں ہم تنہا نہیں ہیں۔ روحانی اور اخلاقی اقدار ساری دنیا میں زوال پذیر ہیں۔ ہر شے کو روا رکھنے والا، خودغرض اور صارفانہ تمدن ہر جگہ پھیل رہا ہے۔ خود انگلستان میں وکٹورین نظم وضبط برطانوی سلطنت کی طرح مفقود ہو چکا ہے۔ ہم سب اس دنیا کے عاشق، اس کی نفسانی خوشیوں، شہوت اور عیش و عشرت کے رسیا ہو گئے ہیں۔ ہم کو دائمی اقدار رکھنے والی مثالی دنیا سے، پیغمبروں اور عارفوں کی دنیا سے، اس دنیا سے جو لالچ، شہوت اور جبر کی زنجیروں سے نجات دلاتی ہے، رشتہ جوڑنے کا شوق نہیں رہا۔ صرف اس مثالی دنیا کی بصیرت ہی ہم کو پاک دامن بنا سکتی ہے۔

بد قسمتی سے انقلابیوں اور عذر خواہوں دونوں نے مل کر ایسی فضا پیدا کر دی ہے جس میں روحانی اور اخلاقی ترقی کے امکانات نہیں ہیں۔ انقلاب پسندوں نے اس عقیدے کو عام کیا ہے کہ اچھائی کے حصول کے لیے سیاسی طاقت کافی ہے۔ سیاسی اقتدار کے حصول سے ہر خرابی دور کر کے ایک مثالی معاشرہ، گویا اللہ کی مملکت وجود میں لائی جا سکتی ہے۔ تاریخی شواہد کسی طور بھی اس نظریے کی تائید نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف لارڈ آکٹن کے خیال میں اقتدار اخلاق کو خراب کرتا ہے اور مطلق اقتدار پوری طرح۔

عذر خواہ، ہمارے ترقی یافتہ ماضی اور گزشتہ عظمت کے بارے میں شیخی بگھارتے رہتے ہیں۔ اور ہم بھی بڑائی کے اس خبط کو خوشی سے قبول کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ ہماری ناکامی اور پستی کا ذمے دار ہمارے دشمنوں کی عیاری کو ٹھہراتے ہیں۔ ہم اس مالیخولیا کو بھی خوشی سے اپنا لیتے ہیں۔ بڑائی کے خبط اور دشمنوں کے خوف کے قلعے میں بند ہو کر ہم ہر قسم کی تنقید اور اصلاح کے مشورے کو رد کر دیتے ہیں۔

میری نسل کی زندگی پر سب سے گہرا اثر سیاست کا رہا۔ سید احمد کے زمانے سے شرفا کے سامنے سب سے اہم مسئلہ شکست اور ممتاز شاہی رتبے سے محروم ہونے کے بعد اپنی حیثیت کا تعین تھا۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں محمد علی جوہر نے جمال الدین افغانی کے پان اسلامزم کے نظریے کی مشعل کو تھاما اور تحریکِ خلافت کے ذریعے انگریزی سامراج کی مخالفت اور خلافت عثمانی کی حمایت کی۔ ان کو اُس وقت پریشانی کا سامنا ہوا جب عربوں نے یونانیوں کی طرح عثمانی سلطنت سے علیحدگی اور قومی آزادی کو ترجیح دی۔ مزید پریشانی کا موقع اس وقت آیا جب کمال اتاترک نے اعلان کیا کہ سلطنت کا زمانہ ختم ہو گیا اور ترکی اب ایک قومی حکومت ہے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں، علامہ مشرقی نے، جو میرے سسر تھے، سلطنت کی ٹمٹماتی ہوئی مشعل پھر سے روشن کی۔ ان کو واقعی یہ یقین تھا کہ ان کی رہنمائی میں ہندی مسلمان ہندوستان کو اسی طرح دوبارہ فتح کر سکتے ہیں جیسے محمود غزنوی، محمد غوری اور بابر کے دور میں ہوا تھا۔ جوانی کے جوش میں مَیں بھی ان کا ہم خیال ہو گیا۔

۱۹۳۶ء میں خوش قسمتی سے کیمبرج میں چودھری رحمت علی سے میری ملاقات ہوئی۔

میں نے ان سے پاکستان کے منصوبے کے بارے میں سنا۔ رحمت علی نے قومی آزادی کی مشعل اتاترک سے لی تھی۔ ان کا مسلمانوں کو مشورہ تھا کہ سلطنت کا زمانہ ختم ہوا، اب ان کو ایسے علاقوں میں قومی حکومت بنانے پر راضی ہونا چاہیے جہاں وہ اکثریت میں ہیں۔ آخرکار قائداعظم نے وہی کیا جو اتاترک نے کیا تھا، یعنی ہماری قومی ریاست تشکیل دی۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ پاکستانی مسلمانوں نے اپنی حیثیت کا فیصلہ کر لیا۔ ان کو اب اپنی قومی ریاست کا بندوبست چلانا سیکھنا چاہیے؛ اگر مثالی خدائی انداز میں نہیں تو کم ازکم اس عمدگی کے ساتھ جیسے جرمن اور جاپانی چلاتے ہیں۔ میرے پرانے ہم وطن، دہلی اور آگرے کے شرفا، اسی پریشانی کا شکار ہیں جس کا سید احمد کے زمانے میں تھے۔ ان کو آج بھی ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہے جو ان کو سید احمد خاں کی طرح یہ سکھائیں کہ وہ اپنے آپ کو بے مقصد غصے اور افسردہ ناکامی سے تباہ نہ کریں بلکہ کمر ہمت کس کر اپنے خیالات کو روشن کریں، اپنے اخلاق کو پاکیزہ بنائیں اور اپنی قوم اور برادری کی وفاداری سے خدمت کریں۔

میں نے اپنی نسل کے ذہنی، اخلاقی اور سیاسی مسائل کا ایک ذاتی جائزہ پیش کیا ہے اور اس جائزے میں درمیانہ طبقے پر نگاہ مرکوز رکھی ہے جس سے میرا تعلق رہا ہے۔ لیکن میں تھوڑا سا باغی بھی ہوں، میں نے شرفا کے گھٹے ہوئے ماحول سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، (گو اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا) اور مزدور طبقوں کا ساتھ دینے کی کوشش کی ہے۔ حال ہی میں مَیں نے اورنگی کی کچی آبادی میں تبدیلی اور روایت کی کشمکش کا ایک خاکہ تیار کیا ہے۔ میں اورنگی میں پچھلے تیرہ سال سے کام میں مصروف ہوں۔ اس خاکے کو میں اس مقالے کے دوسرے حصے کے طور پر شامل کرتا ہوں۔

اورنگی میں روایت اور تبدیلی

اخبار پڑھنے کی لت کے شکار دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی روزانہ روایت اور جدیدیت کی خوراک لیتا ہوں اور اس نشے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خمار یعنی اپنی شناخت کی گمشدگی کا تجربہ کرتا

ہوں۔ تب مجھے ایسا لگتا ہے گویا میں احمق ہوں یا بندر۔ پھر اپنے ذہنی توازن کو قائم رکھنے کے لیے میں اورنگی کے مزدوروں کے پاس جاتا ہوں۔ وہ بھی ہمارے اوپری طبقے اور چرب زبان خیال پرستوں کی طرح ایک تبدیلی کے عمل سے گزر رہے ہیں، لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ وہ کسی اُلجھن کا شکار معلوم نہیں ہوتے۔

میں نے تیرہ سال مسلسل ان کا مشاہدہ کیا ہے اور ان کے لیے میری پسندیدگی متواتر بڑھتی گئی ہے۔ ان کو زندہ رہنے کا فن آتا ہے۔ وہ خودپسند خیال پرستوں کی رہنمائی میں نہیں بلکہ اپنے فطری تقاضوں کی مدد سے جدید اور قدیم کا قابلِ عمل مرکب تیار کر رہے ہیں۔ ان کو اس بات کا خطرہ نہیں کہ وہ بدیسی تہذیب سے گمراہ ہو کر اپنی ذات کو گم کر دیں گے۔ وہ ایک ایسا تناور درخت ہیں جس کی جڑیں اپنی زمین میں گہری اتری ہوئی ہیں اور شاخیں مغربی ہواؤں کو خوش آمدید کہتی ہیں۔

اورنگی کے باشندوں نے تین بنیادی روایات ورثے میں پائی ہیں: دینی، اخلاقی اور معاشرتی۔ حقیقت میں یہ تینوں ایک ہی تمدن کے مختلف رخ ہیں۔ اس وقت یہ قدیم تمدن ایک جدید شہر کے زبردست دباؤ کا کامیاب مقابلہ کرتے ہوئے خود کو متوازن کر رہا ہے۔ لوگوں کا فطری ردعمل پرانی اقدار کو قائم رکھتے ہوئے تھوڑا تبدیل ہونا ہے، وہ نہ تو ماضی سے کٹنا چاہتے ہیں اور نہ حال سے، وہ نہ تو روایتی معنوں میں دقیانوسی ہونا چاہتے ہیں اور نہ جدّت پسند، نہ تو احمق اور نہ بندر۔

ان کی دینی روایت نے ایک طرف خالق اور قدرت کی مخفی قوتوں سے رشتہ جوڑا ہے اور دوسری طرف اپنے ساتھی انسانوں سے۔ مسجد (خدا کا گھر) ایک پاکیزہ ادارہ تھا جو روحانی اور معاشرتی بندھن کا مظہر تھا۔ اورنگی کے لوگوں کے لیے مسجد آج بھی ایک روحانی اور معاشرتی قوت کے مرکز کی حیثیت سے زندہ ہے جیسے ماضی میں تھا۔ ہر نئے سیکٹر میں قدرتی طور پر سب سے پہلے مسجد تعمیر کی جاتی ہے اور اس کی دیکھ بھال اور امام کا تقرر اسی طرح ہوتا ہے جیسے ماضی میں ہوتا تھا۔ ۱۹۸۲ء کے جائزے کی رو سے تیرہ سال میں محلہ کمیٹیوں نے ۱۶۸ مساجد اورنگی میں تعمیر کیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ان مسجدوں کے امام صاحبان بیشتر اورنگی کے باہر سے آئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اورنگی والے امام کے پیشے سے متاثر نہیں۔ اماموں کی دین کے علم بردار کی حیثیت سے عزت کی جاتی ہے لیکن ان کو سیاسی قائدین کے طور پر ووٹ نہیں ملتے۔ اسی طرح ثواب کے لیے مدرسوں کو امداد دی جاتی ہے لیکن اپنے بچوں کو لوگ اسکول ہی بھیجنا پسند کرتے ہیں۔

اپنے بزرگوں کی طرح اورنگی کے لوگ قدرت کی مخفی روحانی قوتوں سے رابطے کے قائل ہیں جن سے وہ پریشانی اور نقصان کی صورت میں مدد طلب کرتے ہیں۔ مقدس قوت کے مراکز، جیسے مساجد یا بزرگوں کے مزار، پریشانی میں ان کی آخری پناہ گاہیں ہیں۔ جب بچے کو میعادی بخار ہوتا ہے تو ماں دعا کرتی ہے، لیکن سوچ میں ایک نازک سا فرق آیا ہے۔ اس کے باوجود کہ مقدس روحانی طریقہ قائم ہے، دنیاوی طریقے کو رد نہیں کیا جاتا۔ ماں دعا تو کرتی ہے لیکن وہ ڈاکٹر کے پاس بھی دوڑتی ہے۔ ہمارے صحتِ عامہ کے پروگرام کی خاتون کارکن بیان کرتی ہیں کہ ناخواندہ پٹھان بیویاں ان سے بیماری سے بچاؤ اور پیدائش میں وقفے کی تعلیم خوشی سے حاصل کرتی ہیں۔ ان کا مخفی قوتوں اور دعا میں یقین جدید حفظانِ صحت کے اصول اور خاندانی منصوبہ بندی کا حریف نہیں ہے۔

اورنگی میں روحانی رشتہ اب بھی لوگوں کو زندگی کی دشواریوں سے ہمت سے مقابلے کی قوت فراہم کرتا ہے۔ معاشرتی رشتہ، جو اخوت اور خیرات کے مذہبی نظریے کی پیداوار ہے، گلیوں کے مکینوں کے درمیان خاندان اور ہمسایگی کے تعلق کو مضبوط کرتا ہے۔ روحانی اور معاشرتی رشتے اورنگی کے لوگوں کو جدید طریقے اپنانے سے نہیں روکتے، بلکہ اس قبولیت کو زیادہ لچک دار بناتے ہیں۔

اورنگی میں خاندانی رشتے پائیدار ہیں۔ ان میں اس قسم کی ٹوٹ پھوٹ نہیں جیسے دوسرے طبقوں اور برادریوں میں ہے۔ کسی بھی برادری کے لیے مضبوط خاندان ایک اثاثہ ہے۔ اورنگی میں اس کی وجہ سے نئی بستیاں بسی ہیں اور ان میں رفتہ رفتہ ترقی ہوئی ہے۔ خاندانی رشتوں نے محلوں اور گلیوں میں تعلقات کو تقویت دی ہے۔ اورنگی میں خاندانی رشتوں نے دیہات کی برادری کی ریت، ایک دوسرے کی مدد اور اجتماعی بندوبست کو زندہ کیا ہے۔ برادری کی ریت سے ہزاروں

گلیوں میں لوگوں نے اپنے خرچ اور انتظام کے تحت جدید سینی ٹیشن کا نظام ــــ مکانوں میں فلش لیٹرین اور زیرِزمین گندے پانی کی نکاسی کی لائنیں ــــ بہت تیزی سے تعمیر کیا ہے۔ نہ صرف یہ تعمیری کام مل جل کر آسانی سے ہزاروں گلیوں میں ہوا بلکہ ہمارے ریکارڈ میں ہے کہ بہت سے غریب گھرانوں کے پڑوسیوں نے اس سلسلے میں ان کی مالی امداد بھی کی۔ اس طرح روحانی روایت، خیرات اور اخوت نے اورنگی کی گلیوں میں قائم رہ کر جدید سینی ٹیشن کے نظام کو رائج کرنے میں معاونت کی۔

کوئی بھی باریک بیں شاید یہ مشاہدہ کرسکتا ہے کہ مذہبی روایت کے رائج کیے ہوئے اخلاقی اصولوں ــــ محنت، جزرسی، خیرات اور انکسار ــــ پر اورنگی کے لوگ (ظاہر ہے کہ عمومی طور پر) آج بھی عمل پیرا ہیں۔ قدیم روایت آرام پسندی کے بجائے نظم وضبط کی پابند زندگی، جھوٹی شان وشوکت کے بجائے سادگی، لالچ کے بجائے خیر، عیش پرستی کے بجائے پاک دامنی کا تقاضا کرتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بحیثیت مجموعی اورنگی کے مزدور طبقے کے لوگ بے حد محنتی، سادہ اور مخیر ہیں، شراب اور نشے سے دور، پاک دامن زندگی بسر کرتے ہیں۔ روایتی اقدار، محنت، جزرسی، خیرات اور انکسار کی انھی خصوصیات نے اورنگی کے لوگوں کو اس قابل کیا کہ بغیر کسی باہری امداد کے، اپنی ہی بچت سے وہ اپنے گھر، سینی ٹیشن کا نظام، اسکول، شفاخانے اور سواری کی گاڑیاں چلاسکے۔

سب سے زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ، میکس ویبر کی پروٹسٹنٹ اخلاقیات کی طرح، محنت اور جزرسی نے مضبوط خاندانی رشتوں کے ساتھ مل کر اورنگی میں لوگوں کو اس لائق کیا کہ وہ ہزاروں چھوٹے کاروبار قائم کرسکے، جہاں ان کو روزگار کے مواقع فراہم ہوئے اور یوں انھوں نے خود کو افراطِ زر اور کساد بازاری کی تباہی سے بچالیا۔ قدیم روحانی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کی موجودگی نے اورنگی کو ایک خوش حال، محنتی، صاف ستھرا اور متعین ذیلی شہر بنادیا ہے نہ کہ گندہ، ناپاک، تاریک محلہ۔

شہری مشینی تہذیب کے دباؤ میں آکر، جسے اورنگی کے لوگوں نے خوشی سے قبول کیا ہے، افراطِ زر کی پیدا کردہ شدید مہنگائی اور بدانتظام معیشت کے دباؤ کے تحت عورتوں کا کارِ منصبی

ڈرامائی انداز سے بدل گیا ہے۔ اب پرانے قبیلہ واری نظام میں رہنا ممکن نہیں۔ لوگوں نے تبدیلی کے ردعمل کے طور پر اپنی عورتوں کو موقع دیا کہ وہ بھی آزادی سے کمانے والی بن جائیں۔ گھر اب کارخانے بن رہے ہیں۔ یہ گھریلو کارخانے ہر گلی میں وجود میں آرہے ہیں۔ ان کارخانوں میں عورتیں اگر اکثریت میں نہیں تو ایک بڑی اقلیت ہیں۔ اور نگی میں عورتیں کارکن کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ کارخانےدار بن کر ابھر رہی ہیں۔ ۱۹۸۷ء سے اورنگی چیریٹبل ٹرسٹ ان گھریلو مراکز کو قرضے دے رہا ہے۔ فروری ۱۹۹۰ء تک چار کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کے قرضے ۳۱۵۹ مراکز کو دیے گئے جہاں کم ازکم پندرہ ہزار کارکن مصروفِ کار ہیں۔ ہم اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ ان مراکز میں کم ازکم ۴۰ فیصد عورتیں کام کرتی ہیں۔ ان میں سے ۶۱۳ کاروبار خواتین کارخانےدار چلارہی ہیں۔ وہ اب تک ۸۷ لاکھ ۵۰ ہزار روپے قرض لے کر ۵۰ لاکھ ۹۰ ہزار روپے واپس کر چکی ہیں۔ یہ عورتیں پینتالیس قسم کے کاروبار چلاتی ہیں۔ ان میں سلائی کے مراکز (۲۲۲)، پرچون کی دکانیں (۱۰۵)، اسکول (۲۳)، گھریلو کارخانے (۷)، دواخانے (۱۴)، بیوٹی پارلر (۶) اور کشیدہ کاری کے مراکز (۱۳۴) شامل ہیں۔ ہم اپنی قرضدار عورتوں کی صلاحیت اور دیانتداری سے بےحد متاثر ہوے ہیں۔

علاوہ ازیں، لڑکیاں اب پہلے سے زیادہ تعداد میں اسکول جارہی ہیں۔ ۱۹۸۹ء کے جائزے میں، جو اورنگی کے پانچ سو پچاسی اسکولوں پر محیط تھا، یہ ظاہر ہوا کہ ۸۰ ہزار طلبا میں ۳۶ ہزار، یعنی ۴۵ فیصد طالبات تھیں۔ یقیناً یہ ایک نیا سماجی مظہر ہے۔ یہ طالبات میری ماں کی طرح پردہ نشین نہیں لیکن اپنی آزادی کے باوجود ان میں قدیم تمدن کی حیا باقی ہے۔ گو وہ میری ماں کی طرح چادر میں لپٹی ہوئی نہیں، نہ گھر میں قید ہیں، لیکن ان کا نسوانی برتاؤ ویسا ہی باحیا ہے جیسا میری ماں کا تھا۔

میں ان کارکن عورتوں کو، ان استانیوں کو اور طالبات کو اورنگی کے لوگوں کا بہترین مظہر خیال کرتا ہوں، ایک ایسی تابندہ مثال جو قدیم اور جدید میں قدم رکھ کر اکیسویں صدی میں داخلے کی نہایت عمدہ تیاری ہے۔

قرآنی عقیدہ اور اسوۂ حسنہ

ایمان کیا ہے

عام طور پر ہم اپنی موجودہ زندگی سے مسحور رہتے ہیں۔ ایمان اس دنیا کی زندگی (حیات الدنیا) کی ناپائیداری کو عیاں کرتا ہے۔ وہ اس کے علاوہ ایک دائمی حقیقت آخرت (حیات بعد الموت) کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

اور کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے۔ (س ۴۵، آیت ۲۴)

اور کافر لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہو رہے ہیں اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں بہت تھوڑا فائدہ ہے۔ (س ۱۳، آیت ۲۶)

جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اسی پر مطمئن ہو بیٹھے، اور ہماری نشانیوں سے غافل ہو رہے ہیں۔ (س ۱۰، آیت ۷)

لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں مگر یہ سب دنیا ہی کی زندگی کے سامان ہیں اور خدا کے پاس بہت اچھا ٹھکانا ہے۔ (س ۳، آیت ۱۴)

یہ دنیا کی زندگی چند روز فائدہ اٹھانے کی چیز ہے اور جو آخرت ہے وہی ہمیشہ رہنے کا گھر ہے۔ (س ۴۰، آیت ۳۹)

دُنیوی زندگی کی ناپائیداری کو تشبیہ کے رنگ میں یوں پیش کیا گیا ہے:

اور ان سے دنیا کی زندگی کی مثال بھی بیان کرو۔ وہ ایسی ہے جیسے پانی جسے ہم نے آسمان سے برسایا۔ تو اس کے ساتھ زمین کی روئید گی مل گئی۔ پھر

وہ چورا چورا ہو گئی کہ ہوائیں اسے اُڑاتی پھرتی ہیں۔ اور خدا تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی رونق وزینت ہیں۔ اور نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں وہ ثواب کے لحاظ سے تمہارے پروردگار کے ہاں بہت اچھی اور امید کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں۔ (س ۱۸، آیت ۴۶-۴۵)

ایمان کا تقاضا ہے کہ ہم دنیا کے عارضی ہونے، بڑھاپے اور موت اور آخرت کی قائم رہنے والی حقیقت پر غور کریں۔

ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے... اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔ (س ۳، آیت ۱۸۵)

خدا ہی تو ہے جس نے تم کو ابتدا میں کمزور حالت میں پیدا کیا پھر کمزوری کے بعد طاقت عنایت کی پھر طاقت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دیا۔ (س ۳۰، آیت ۵۴)

ایمان ہم کو باور کراتا ہے کہ جس طرح دنیا میں بے رحم فطری قوانین ہیں اُسی طرح بے رحم اخلاقی قوانین بھی ہیں۔

تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ (س ۹۹، آیت ۸-۷)

ایمان ہمیں ترغیب دیتا ہے کہ ہم اخلاقیات کی بلند راہ اختیار کریں یعنی خدمتِ خلق کا راستا۔

بھلا ہم نے اُس کو دو آنکھیں نہیں دیں، اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے۔ یہ چیزیں بھی دیں اور اس کو خیر و شر کے دونوں رستے بھی دکھا دیے۔ مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا۔ اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی کی گردن کا چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا یتیم رشتے دار کو یا فقیر خاکسار کو۔ پھر ان لوگوں میں بھی داخل ہوا جو ایمان لائے اور صبر کی نصیحت اور لوگوں پر شفقت کرنے کی وصیت کرتے رہے۔ (س ۹۰، آیت ۱۷-۸)

ایمان کے سہارے ہم دعا، مراقبے اور نظم و ضبط سے گھٹیا جبلتوں پر غلبہ پا کر، حق کے راستے پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

اور نماز کے پابند رہو۔ کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے۔ (س ۲۹، آیت ۴۵)

ایمان اور خدمت کی زندگی ایک اچھے درخت کی طرح پائیدار ہے۔ اس کی جڑیں گہری ہیں اور شاخیں بلند، سڑے ہوئے بوٹے کے برخلاف۔

جو شخص نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت وہ مومن بھی ہو گا تو ہم اس کو دنیا میں پاک اور آرام کی زندگی سے زندہ رکھیں گے۔ (س ۱۶، آیت ۹۷)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے وہ ایسی ہے جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط یعنی زمین کو پکڑے ہوئے ہو اور شاخیں آسمان میں۔ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا اور میوے دیتا ہو... اور ناپاک بات کی مثال ناپاک درخت کی سی ہے نہ جڑ مستحکم نہ شاخیں بلند۔ زمین کے اوپر ہی سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے اُس کو ذرا بھی قرار و ثبات نہیں۔ (س ۱۴، آیت ۲۶-۲۴)

ایمان اور خدمتِ خلق کے ثمر اور علامات

ایمان اور خدمتِ خلق ہم کو غم اور فکر سے آزاد کرتے ہیں۔

سن رکھو کہ جو خدا کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ (س ۱۰، آیت ۶۲)

ہاں جو شخص خدا کے آگے گردن جھکا دے یعنی ایمان لے آئے اور وہ نیکو کار بھی ہو تو اس کا صلہ اس کے پروردگار کے پاس ہے اور ایسے لوگوں کو قیامت کے دن نہ کسی طرح کا خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ (س ۲، آیت ۱۱۲)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہے ان کو ان کے کاموں کا صلہ خدا کے ہاں ملے گا اور قیامت کے دن ان کو نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ (س ۲، آیت ۲۷۷)

صاحبِ ایمان کی نشانی: وہ نرم خو، متین، مخیر، پاک باز اور سچے ہوتے ہیں۔

بے شک ایمان والے رُستگار ہو گئے، جو نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں اور

جو بیہودہ باتوں سے منہ موڑے رہتے ہیں اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں... اور جو امانتوں اور اقراروں کو ملحوظ رکھتے ہیں (س ۲۳، آیت ۸-۱)

خدائی خادم کی نشانی... وہ شرمیلے، صلح کُن، جزرس، پُرامن اور پاک دامن ہوتے ہیں۔

اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں، اور جب جاہل لوگ اُن سے جاہلانہ گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں... اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بےجا اُڑاتے ہیں اور نہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں بلکہ اعتدال کے ساتھ نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔ اور وہ جو خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جاندار کو مار ڈالنا خدا نے حرام کیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے (س ۲۵، آیت ۶۸-۶۳)

یہ لوگ ہر مذہب میں ملتے ہیں۔

جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی یا عیسائی یا ستارہ پرست یعنی کوئی شخص کسی قوم و مذہب کا ہو جو خدا اور روزِ قیامت پر ایمان لائے گا اور عمل نیک کرے گا تو ایسے لوگوں کو ان کے اعمال کا صلہ خدا کے ہاں ملے گا اور قیامت کے دن ان کو نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ (س ۲، آیت ۶۲)

صرف رسوم کی پابندی نیکی نہیں ہے۔ اصلی نیکی پختہ ایمان خدمتِ خلق اور اخلاقی اقدار پر عمل ہے۔

نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق و مغرب کو قبلہ سمجھ کر اُن کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور فرشتوں پر اور خدا کی کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں۔ اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کے چھڑانے میں خرچ کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جب عہد کر لیں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں اور معرکہ کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔ (س ۲، آیت ۱۷۷)

اُن پر افسوس ہے کہ جو عبادت تو کرتے ہیں لیکن خیرات نہیں دیتے۔

بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی بد بخت ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا۔ تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے۔ جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیزیں عاریتاً نہیں دیتے۔ (س ۱۰۷، آیت ۱-۶)

اخلاقی اقدار

ہم کو انصاف پسند، ہم درد اور مخیر ہونا چاہیے، اور بے حیائی، رسوائی اور بد تمیزی سے بچنا چاہیے۔

اور جو تم سود دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں افزائش ہو تو خدا کے نزدیک اس میں افزائش نہیں ہوتی اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو اور اس سے خدا کی رضامندی طلب کرتے ہو تو وہ موجب برکت ہے اور ایسے ہی لوگ اپنے مال کو دوچند سہ چند کرنے والے ہیں۔ (س ۳۰، آیت ۳۹)

خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو خرچ سے مدد دینے کا حکم دیتا ہے۔ اور بے حیائی اور نامعقول کاموں سے اور سرکشی سے منع کرتا ہے اور تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو (س ۱۶، آیت ۹۰)

ہم کو لالچ، غرور اور شیخی سے بچنا چاہیے اور اپنے والدین، رشتے داروں، یتیموں، فقرا، پڑوسیوں اور ملازموں سے نرمی سے پیش آنا چاہیے۔

اور ماں باپ اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور رشتہ دار ہمسایوں اور اجنبی ہمسایوں اور رفقائے پہلو یعنی پاس بیٹھنے والوں اور مسافروں اور جو لوگ تمھارے قبضے میں ہوں سب کے ساتھ احسان کرو کہ خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور تکبر کرنے بڑائی مارنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (س ۴، آیت ۳۶)

باوجودیکہ ان کو خود طعام کی خواہش اور حاجت ہے فقیروں اور یتیموں کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم کو خالص خدا کے لیے کھلاتے ہیں۔ نہ تم سے عوض کے خواستگار ہیں نہ شکر گزاری کے طلبگار۔ (س ۷۶، آیت ۸-۹)

تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔ (س ۹۳، آیت ۱۰-۹)

ہم کو باحیا ہونا چاہیے اور جنسی بے راہ روی سے اور آشنائی سے بچنا چاہیے۔

مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ اُن کے لیے بڑی پاکیزگی کی بات ہے اور جو کام یہ کرتے ہیں خدا ان سے خبردار ہے۔ اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں اور اپنی آرائش یعنی زیور کے مقامات کو ظاہر نہ ہونے دیا کریں مگر جو اُس میں سے کھلا رہتا ہو۔ اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں۔ (س ۲۴، آیت ۳۱-۳۰)

اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح پہلے جاہلیت کے دنوں میں اظہارِ تجمل کرتی تھیں اس طرح زینت نہ دکھاؤ۔ (س ۳۳، آیت ۳۳)

ہم کو اپنے لین دین میں کھرا اور امین ہونا چاہیے اور دھوکے اور کنجوسی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو۔ اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ (س ۴، آیت ۵۸)

تو تم ناپ اور تول پوری کیا کرو اور لوگوں کو چیزیں کم نہ دیا کرو۔ (س ۷، آیت ۸۵)

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں۔ (س ۸۳، آیت ۳-۱)

فضول خرچی سے بچنا چاہیے۔

اور بے جا نہ اُڑانا کہ خدا بے جا اُڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (س ۶، آیت ۱۴۲)

اور فضول خرچی سے مال نہ اُڑاؤ۔ کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں۔ (س ۱۷، آیت ۲۶-۲۷)

ہم کو پھبتی، بہتان اور غیبت سے بچنا چاہیے۔

کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے ممکن ہے وہ لوگ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں عورتوں سے تمسخر کریں ممکن ہے وہ ان سے اچھی ہوں۔ اور اپنے مومن بھائی کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا بُرا نام رکھو... بہت گمان کرنے سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں اور ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کیا کرو، اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ (س ۴۹، آیت ۱۲)

ہم کو منہ پھٹ مغرور اور شیخی خورہ نہیں ہونا چاہیے۔

اور اپنی چال میں اعتدال کیے رہنا اور بولتے وقت آواز نیچی رکھنا کیونکہ اونچی آواز گدھے کی سی ہے اور کچھ شک نہیں کہ سب سے بُری آواز گدھوں کی ہے۔ (س ۳۱، آیت ۱۹-۱۸)

ہمیں غصے کو قابو میں رکھنا، دوسروں سے مشورہ کرنا اور دوستانہ تعلقات پر زور دینا چاہیے۔

اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔ اور اپنے پروردگار کا فرمان قبول کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں۔ (س ۴۲، آیت ۳۸-۳۷)

سخت کلامی کا ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو۔ ایسا کرنے سے تم دیکھو گے کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے۔ (س ۴۱، آیت ۳۴)

ہم کو امن دوستی اور نیکی کی تلقین کرنی چاہیے۔

اگر مومنوں میں سے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو... اور انصاف سے کام لو کہ خدا انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو۔ (س ۴۹، آیت ۱۰-۹)

اور دیکھو نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔ (س ۵، آیت ۲)

(ترجمہ آیاتِ قرآن از مولانا فتح محمد جالندھری)

مجھے نطشے پسند تھا

مجھے کئی سال تک نطشے پسند رہا۔ میں اُسے پرجوش انداز سے پسند کرتا تھا۔ میں نے "زرتشت نے کیا کہا" (Thus Spake Zarathustra) کو بار بار خوش ہو کر پڑھا۔ میں نے "طاقت کی خواہش" (The Will to Power) اور "حق اور ناحق سے دور" (Beyond Good and Evil) بہت گہری دل چسپی سے پڑھیں اور نطشے کے خیالات سے خود کو مکمل طور پر متفق محسوس کیا۔ لیکن آہستہ آہستہ میری فکر اُس کے سوچنے کے اندازو اقدار سے دور ہوتی گئی۔

جب مجھے پہلے پہل نطشے کے "نوبل مین" یا "سپر مین" سے عشق ہوا تو میری عمر بیس سال تھی۔ میں نے نیا نیا انگریزی ادب میں ایم اے کیا تھا۔ میں نے بی اے میں فلسفے اور تاریخ کا مطالعہ کیا تھا۔ مجھے جرمن زبان نہیں آتی تھی، لیکن ترجمے کی معرفت کانٹ، ہیگل اور شوپن ہاور کے علاوہ افلاطون اور ارسطو کے خیالات سے آشنا ہو چکا تھا۔ بہت کم نوجوان جانتے ہیں کہ تھوڑی سی واقفیت خطرناک ہوتی ہے اور میں خاص طور پر ایک فریب خوردہ نوجوان تھا کیوں کہ میں بقول کے "ہونہار طالب علم" تھا، اور اس لیے بھی کہ قدرت نے مجھے غوروفکر کرنے والا مزاج دیا تھا اور میرا دماغ مابعدالطبیعیاتی قیاسات کو قبول کرتا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے جسم کو کالج کی ورزش گاہ میں ورزش کے ذریعے اور چہل قدمی اور سائیکل چلا کر سخت اور مضبوط کر لیا تھا۔ جب مجھے نطشے سے عشق ہوا، میں جسمانی اور دماغی اعتبار سے چست تھا اور میری نوجوانی کا پیالہ شیخی سے پُر تھا۔

پس میں نے خیال کیا کہ اُس کا پیغام خاص طور پر میرے لیے ہے، اور یہ کیسا فرحت بخش پیغام تھا: کہ مجھے ایک عام آدمی نہیں ہونا چاہیے، میں عام گلّے کا فرد، پیوندزدہ اور بھونڈا، بہت سوں جیسا ایک اَور بننے کے لیے نہیں پیدا ہوا ہوں؛ اس کے برخلاف مجھے کوشش کر کے اپنے آپ

کو کامل بنانا چاہیے۔ مجھے غلام نہیں آقا بننا چاہیے، انسانِ کامل، فوق البشر، جھپٹنےوالا عقاب، شاہی شیر۔ ایک جنگی سورما یا فاتح، نپولین کی طرح، اپنی اقدار خود تشکیل دیتا ہے۔ وہ روایتی حق اور ناحق سے بلند تر ہوتا ہے۔ عام لوگوں کے نیکی بدی کے تصورات کو رد کرتا ہے اور عام تاملات، یعنی صبر، بردباری اور ہم دردی کو بھی۔ جس طرح ایک فن کار اپنے برش، رنگ اور کاغذ کو استعمال کرتا ہے، بالکل اُسی طرح وہ عام آدمیوں کو استعمال کرتا ہے۔ وہ ہر پابندی سے آزاد، مغرور اور بے رحم ہوتا ہے۔

فتوحات کے اس تصور کو اس بات سے تقویت ملی کہ بچپن سے میرے ذہن میں تاریخ کے مسلمان غازیوں کے لیے عقیدت کے جذبات تھے۔ نطشے کے مردِ کامل عام طور پر السی بیادس، سکندر اور نپولین جیسے فوجی مشاہیر تھے۔ مجھے بھی بچپن سے میرے والدین نے اور بعد میں کتابوں اور خطبوں نے حضرت خالد بن ولید سیف اللہ کو پسند کرنا سکھایا تھا، جن کی وجہ سے بڑی بڑی کافر افواج شکست کھا گئیں؛ یا کم عمر جنرل محمد بن قاسم کو، جس نے دیبل کو فتح کیا، راجا داہر کو قتل کیا اور اس کی بیٹی کو خلیفہ کے حرم میں داخل ہونے کے لیے بھیجا، یا سلطان محمود غزنوی کے کارناموں کو، جس نے ہندوستان کے شہروں اور مندروں کو تیس سال میں سترہ بار لوٹا اور آخر میں سومناتھ کے بڑے بُت کو توڑ ڈالا۔ نطشے اس سے زیادہ اور کیا پیغام دے سکتا تھا؟

اور جوانی کے نشے میں ایسا لگا کہ میری نسل کے استاد، عظیم فلسفی شاعر اقبال بھی مجھے وہی سبق پڑھا رہے ہیں جو نطشے نے دیا تھا۔ میری خوش بختی تھی کہ میں وہ سب کتابیں پڑھتا تھا جو چھپ کر نئی نئی بازار میں آتی تھیں۔ میرے کان میں مقصدِ بلند کے حصول کی، جہدِ مسلسل اور خودی کی گونج صاف طور پر آتی تھی۔ اقبال کا پسندیدہ استعارہ شہباز ہے، بلند مقام عقاب جو اپنا آشیانہ پہاڑ کے غار میں بناتا ہے اور کبوتر پر جھپٹ کر خوش ہوتا ہے۔ ہم نوجوان نسل کے لوگ اُن کے خودی کے نظریے سے مسحور ہوتے تھے۔ پرانے صوفیا نے کہا ہے کہ انسان کی خودی جذبات کا ــــ شہوت، لالچ، غرور اور قہر کا ــــ مرکز ہے؛ اور یہ کہ خودی کی تعمیر فرد اور معاشرے دونوں کے لیے پریشان کن اور خطرناک ہے۔ انفرادی اور اجتماعی امن اور سکون قائم رکھنے کے لیے جذبات کو قابو میں رکھنا اور خودی کو کمزور کرنا ضروری ہے۔ اب میرے سامنے ایک نیا، اُکسانے

والا نظریہ آیا۔ مجھے بتایا گیا کہ خودی کو کم زور کرنے اور انکساری کی بجائے اتنا بلند کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے میری تقدیر کے فیصلے سے پہلے مشورہ کرے۔ مجھے معلوم ہوا کہ خودی کی تعمیر سے لوگ ایسے ہو جاتے ہیں:

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ اِن کی ہیبت سے رائی

میرے نطشائی عظمت کے خبط ہی نے مجھے ایک دوسرے اُستاد علامہ مشرقی کا معتقد بنا دیا۔ وہ ایک ریاضی داں تھے جو ڈارون کے نظریۂ بقاے اصلح (survival of the fittest) سے بے حد متاثر ہوے تھے۔ میرا خیال نہیں کہ انھوں نے نطشے کا مطالعہ کیا تھا، لیکن "بشر اور فوق البشر" کا نظریہ ڈارون کے تخیل سے قریب تر ہے۔ علامہ مشرقی نے قرآن مجید کا تجزیہ کیا اور اس میں سے دس نکات پر مشتمل بقاے اصلح کا نسخہ دریافت کیا۔ قرونِ اولیٰ کی مسلم فوجی فتوحات کو اس نسخے کی سچائی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اس نسخے میں حکومت کا حصول، یعنی تمکن فی الارض اور غلبہ، بنیادی نکتہ ہے۔ اس نظریے کے تحت ہندی مسلمانوں کو ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ ہندوستان پر غلبہ حاصل کریں، اور جنرل محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کے نام کو دوبارہ روشن کریں۔

پہلے استاد علامہ اقبال نے گو کسرِ نفسی اور انکسار کو رد کیا تھا، تاہم اُن کے دل میں صوفیا کے لیے ایک نرم گوشہ تھا۔ لیکن میرے دوسرے اُستاد علامہ مشرقی صوفیا کو حقیر سمجھتے تھے۔ وہ اُن کی امن پسندی، تسلیم و رضا اور صلحِ کل کے رویّے کو نفرت سے دیکھتے تھے۔ وہ صوفیا کو مسلم مملکت کے زوال اور خاتمے کا ذمّے دار ٹھہراتے تھے کیوں کہ ان کے خیال میں انھوں نے مسلمانوں کو قوت کے حصول اور تمکن اور غلبے سے دور کر دیا۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں میرے دوسرے اُستاد کے خیال میں ہٹلر اور اس کی پارٹی بقاے اصلح کے اصول پر عمل پیرا تھی، اس لیے اس کا غلبہ یقینی تھا۔

میرا نطشے کے فلسفے کے جادو کے اثر سے نجات پانا حیرت انگیز طور پر اُس دور میں ہوا جب

میں، آئی سی ایس میں بھرتی ہو کر، ایک قسم کا آقا بن گیا۔ یہ حاکم طبقہ تھا۔ میں نے قوت اور حکومت کا مزہ چکھا، لیکن یہ بھی دریافت کیا کہ خدا نے مجھے نطشے کے سانچے میں، یعنی ایک سپر مین، ہم دردی سے عاری، فنکار حکمراں کے سانچے میں نہیں ڈھالا ہے۔ جب غریب میرے پاؤں پڑتے تھے تو مجھے خوشی نہیں بلکہ شرمندگی ہوتی تھی۔ اور جب میں اُن کی مفلسی دیکھتا، جیسے قحط کے زمانے میں، تو میں اپنی نوابانہ بےاعتنائی قائم نہ رکھ پاتا بلکہ بےحد افسردہ ہو جاتا۔ میں اس بےرحمانہ نظام سے بھی آنکھیں بند نہ رکھ پاتا جس کے استحکام کی خاطر مجھ کو بطور انعام دولت اور قوت ملتی تھی۔ جب مَیں جنگ کے دوران حکومت کی ممانعت کی پالیسی کے تحت غریبوں کی کشتیاں اور گاڑیاں چھینتا اور اس طرح انھیں قحط سے دوچار کر دیتا، یا جب میں قوم پرست باغیوں کو گرفتار کرتا، تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا مردِ کامل ہونے کا وہم فریب ہے اور میں نے اُس سے پیچھا چھڑا لیا۔

میری ایک ذاتی لگن تھی؛ میں ایک ایسی زندگی گزارنا چاہتا تھا جس میں خوف اور پریشانی نہ ہو، ایک مطمئن اور پُرسکون زندگی، جس میں فتنہ و فساد نہ ہو۔ میں نے دریافت کیا کہ جب میں نطشے کے مشورے پر عمل کر کے ایک طاقتور آقا، مغرور فوق البشر، بننا چاہتا ہوں تو میرا غرور اور غصہ میری پریشانی اور خوف میں اضافہ کرتے ہیں، اور طرح طرح کے جھگڑوں میں اُلجھاتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر میں صوفیا اور عارفوں کے مشورے پر عمل کرتا ہوں اور اپنے لالچ، غرور اور غصّے کو کم کرتا ہوں تو خوف، پریشانی اور جھگڑے گھٹ جاتے ہیں۔

پس میں نے پروفیسر فریڈرک ولہلم نطشے اور اس کے غرور اور قہر پر مبنی پاگل پن کے نظریے سے منہ موڑ لیا۔ (یہ بات خاصی اہم ہے کہ پروفیسر چوالیس سال کی عمر میں پاگل ہو گیا تھا اور بارہ سال بعد یعنی اپنی موت تک پاگل رہا۔)

اپنی شخصی نجات کے لیے میں آخر میں عارفوں اور صوفیا کی طرف لوٹ آیا۔ پروفیسر اور اس کے شاگردوں کے تھکا دینے والے خوابِ پریشاں کے مقابلے میں بوڑھے عارف کے پُراعتدال تجزیے نے میرے دل اور دماغ کو آسودہ کیا۔

یقیناً نفسانی خواہش (اقتدار کی خواہش) سے، نفسانی خواہش کی ترغیب سے پوری طرح مغلوب ہو کر، بادشاہ بادشاہ سے لڑتے ہیں، شاہ زادے شاہ زادوں سے، پادری پادری سے، شہری شہری سے، ماں بیٹے سے، اور بیٹا ماں سے، باپ بیٹے سے، اور بیٹا باپ سے لڑتا ہے۔ بھائی بھائی سے اور بھائی بہن سے اور بہن بھائی سے اور دوست دوست سے لڑتے ہیں۔ پس تفرقے اور اختلاف اور لڑائی کی بنا پر وہ ایک دوسرے پر حملے کرتے ہیں، مکّوں، لکڑیوں اور تلواروں سے، اور یوں وہ موت سے یا بے پناہ تکالیف سے دوچار ہوتے ہیں۔

شہوت سے مجبور ہو کر، غصّے کی حالت میں سراب سے اندھے ہو کر، دماغی طور پر مفلوج انسان اپنے نقصان کا باعث ہوتا ہے اور دوسروں کا بھی نقصان کرتا ہے۔ گویا دونوں کا نقصان اُسی کی وجہ سے ہوتا ہے اور یوں وہ دکھ اور رنج کے تجربے سے گزرتا ہے۔ لیکن اگر شہوت، غصّے اور سراب سے نجات حاصل کرلی جائے تو انسان نہ خود کو نقصان پہنچائے گا اور نہ دوسروں کو، اور یوں اُس کو دماغی رنج اور دکھ کا تجربہ نہیں ہوگا۔

میں نے ایرانی شاعر کی صلح کن رائے قبول کرلی:

ما قصّۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

عارفوں کے اقوال سے روشن خیالی حاصل کر کے جب میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا تو مجھے پتا چلا کہ فتح کے دو رُخ ہیں۔ یہ فوق البشر فاتح کے لیے تو بلند نامی ہے لیکن مفتوح کے لیے سخت تکلیف دہ۔ بچپن سے میرے اندر قبائلی تعصب کو رچایا گیا تھا۔ مجھے سکھایا گیا تھا کہ میں محمود کے ترک سپاہیوں کی فتوحات کی پھیلائی ہوئی تباہی پر خوشی مناؤں، لیکن ہلاکو کی تباہ کاری پر افسوس کروں؛ بہمنی فوج کے ہاتھوں وجے نگر کی تباہی پر ہنسوں، اور سرنگاپٹم کی شکست پر، جو انگریزوں کے ہاتھوں ہوئی، آنسو بہاؤں۔ لیکن رحم دل اشوک نے کالنگا میں مفتوحین کے قتل عام پر رنج کیا تھا۔ اور معرّی نے، جو سلطان محمود کا ہم عصر ہے، اس بات پر ماتم کیا تھا کہ فاتحوں کی "خواہشات کی منزل کے راستے تمھارے سینوں کو بھالوں سے چیر کر جاتے ہیں۔"

میری والدہ کا طرزِ زندگی

میری والدہ ۱۸۹۶ء میں آگرے میں پیدا ہوئیں۔ اُن کا تعلق مسلم شرفا کے گھرانے سے تھا۔ ان کے والد محکمۂ پیمائش میں افسر تھے۔ چودہ سال کی عمر میں ان کی شادی ہو گئی۔ گیارہ سال میں چھ بچوں کی پیدائش اور پرورش سے ان کی صحت خراب ہوئی لیکن جب ساتویں بچی پیدا ہوئی تو وہ ٹی بی کی مریض ہو گئیں، اور چھ سال تک سخت تکلیف برداشت کر کے، ۱۹۳۲ء میں، چھتیس سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔

سب سے بڑا لڑکا ہونے کی وجہ سے میں ان سے بےحد قریب تھا۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور حساس خاتون تھیں۔ وہ مجھے اپنے خیالات اور اقدار سے آگاہ کرتی تھیں، مجھ سے اپنے خوشی اور رنج کے تاثرات کا اظہار کرتیں اور میں بےحد غور سے سنتا اور دیکھتا تھا۔ ان کی زندگی کی دشواریاں اور پابندیاں میرے ذہن پر نقش ہیں اور اپنی طویل زندگی میں میں نے بارہا ان پر غور کیا ہے۔ پہلے ایک شوہر کی اور بعد میں باپ کی حیثیت سے مجھے بار بار تنقیدی نظر سے اپنی والدہ کی زندگی اور اپنی بیوی اور بیٹی کی، یعنی ان کے بعد کی دو نسلوں کی عورتوں کی زندگی کے فرق کو دیکھنا پڑا ہے۔ اس کے علاوہ نئی دنیا کا جہاں گرد شہری ہونے کی وجہ سے میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ میں اپنی والدہ کی زندگی کا دوسرے تمدن میں زندگی گزارنے والی خواتین سے موازنہ کروں۔

میری والدہ معاشرے کی باغی نہیں تھیں۔ وہ قدیم روایتوں اور رواجوں پر وفاداری سے عمل کرنے والی تھیں۔ جہیز میں ان کو قران مجید کے علاوہ "بہشتی زیور" کا ایک نسخہ دیا گیا تھا۔ وہ اس کتاب کو ایک سچا راہ نما سمجھ کر اس پر حتی الامکان عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتی تھیں۔

"بہشتی زیور" میں رسوم پر عمل کے طریقوں، حفظانِ صحت کے پرانے اصولوں، خوراک،

صحت اور بیماری کے بارے میں حکیموں کے مشوروں، اور اخلاقیات اور معاشرتی زندگی کے پاکیزہ طریقوں کا تفصیلی بیان ہے۔ سب سے بڑھ کر اس میں ایک شریف گھرانے میں خاتونِ خانہ کی ذمّے داری اور کردار کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ میری والدہ نے ایمان داری سے اس کردار کو نبھایا لیکن ان سے اگلی دو نسلوں کی عورتوں نے، جن میں میری بیوی اور بیٹی بھی شامل تھیں، اس کردار سے انحراف اختیار کیا۔ ظاہر ہے کہ رسومات تو اپنی جگہ، شاید ہمیشہ، قائم رہ سکتی ہیں لیکن خواتین کا کردار وقت کے ساتھ بدلتا اور نئے سرے سے بیان ہوتا رہتا ہے۔

"بہشتی زیور" میں میرے بچپن کی خواتین کے کردار کا تعین کس طرح کیا جاتا تھا؟ یہ نسخہ چار اصولوں یا مفروضوں پر مبنی تھا:

۱۔ پہلا اصول پردہ تھا۔ ایک نیک بی بی اپنے شوہر کے علاوہ صرف محرم مردوں سے بات چیت کر سکتی ہے، یعنی ایسے مردوں سے جن سے شادی نہیں ہو سکتی (جیسے باپ، چچا، بھائی، ماموں اور سُسر)۔ ایک نیک بی بی کو نامحرموں سے دور رہنا چاہیے یعنی محرموں کو چھوڑ کر تمام بالغ مردوں سے۔ ایک نیک بی بی کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلے، لیکن اگر مجبوراً اسے نکلنا پڑے تو وہ چادر اوڑھ کر یا برقع پہن کر نکلے۔

۲۔ دوسرا اصول اطاعت تھا۔ ایک نیک بی بی کو غیر مردوں سے دوری کو خوشی سے قبول کرنا چاہیے۔ زوجہ کی حیثیت سے اپنے خاوند کی عزت کرنی چاہیے اور اس کو اپنا حاکم تصور کرنا چاہیے۔ اس کی جنسی بے راہ روی کو نظر انداز کرنا اور سوکنوں کے ساتھ خوشی سے رہنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں اسے ایک محکوم کی طرح مطیع اور قانع رہنا چاہیے۔

۳۔ تیسرا اصول، دوسرے اصول کا منطقی نتیجہ، خواتین کا مردوں کا دست نگر ہونا تھا۔ اس بات کو بطورِ عقیدہ بیان کیا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو تقسیمِ کار کی ہے اس میں مرد خاندان کا کفیل اور عورت گھر کی نگراں اور بچے پیدا کرنے والی ہے۔ گھر میں قید اور مطیع خواتین بہر صورت مضبوط پیڑ کے تنے سے لپٹی ایک کمزور بیل کے سوا کیا ہو سکتی تھیں۔

۴۔ چوتھا اصول یہ تھا کہ عورت کا بنیادی کام بچے پیدا کرنا ہے۔ ایک مثالی بیوی کا پہلا فرض ایک نرم مزاج فرماں بردار شریکِ حیات کا اور دوسرا فرض بچے پیدا کرنے والی کا تھا۔ بانجھ

عورت عورت نہیں ہوتی۔ کثیر اولاد والی بی بی خوش بخت اور بھاگوان ہوتی ہے۔

میری والدہ نے "بہشتی زیور" میں بیان کردہ نیک خاتون کا کردار پوری طرح ادا کیا۔ وہ ساری عمر پردے میں رہیں اور یہ شاذ ہی ہوتا، شاید تین ماہ میں ایک بار، کہ وہ چاردیواری سے باہر نکلتیں، اور جب نکلتیں تو پوری طرح اوڑھ لپیٹ کر ڈولی یا تانگے میں، جس میں پردے کا اہتمام ہوتا تھا۔ ان کو ہمہ وقت نامحرموں سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ اپنے خاوند کو مجازی خدا سمجھتی تھیں اور ان کی خدمت باندی کی طرح حکم مان کر کرتیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہر شام کس طرح ان کی دفتر سے واپسی کی تیاری ہوتی تھی۔ بچوں کو تلقین کی جاتی کہ خاموش رہیں، فرش کو جھاڑو دے کر صاف کیا جاتا، کرسی اور میز کو پونچھا جاتا، ہاتھ دھونے کا تسلہ، پانی کا جگ، تولیہ اور جوتے قرینے سے اپنی اپنی جگہ رکھے جاتے۔ میرے والد جب گھر میں داخل ہوتے تو میری ماں ہدایت کے مطابق، اچھی بیوی کی طرح، ان کا مسکرا کر خیر مقدم کرتیں۔ وہ بیٹھ جاتے تو میری ماں ان کے جوتے کے بند کھولتیں، ان کے موزے اتارتیں، سلیپر پیروں کے نیچے رکھتیں اور جب تک وہ کھانا کھاتے (جو الگ سے خاص ان کے لیے تیار ہوتا تھا) اس وقت تک ان کو پنکھا جھلتی رہتیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری ماں یہ سب اس وجہ سے نہیں کرتی تھیں کہ میرے باپ، جو ایک مہذب انسان تھے، ان سے اس خدمت کے خواہاں تھے۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتی تھیں کہ ان کی ہدایت کی کتاب میں بیوی کے یہی فرائض لکھے تھے۔

تیسری بات یہ ہے کہ میری والدہ پوری طرح دست نگر تھیں۔ وہ کوئی کام خود نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ خود بازار نہیں جا سکتی تھیں، جہاں نامحرموں کی افراط تھی، اور نہ ریل میں بغیر کسی محافظ کے آگرے سے میرٹھ تک سفر کر سکتی تھیں۔

اور چوتھی بات یہ کہ انھوں نے افزائشِ نسل کی قربان گاہ پر اپنی صحت قربان کر دی۔

اپنے بچپن ہی میں میں نے دیکھا کہ بہت سی مسلم خواتین میری ماں کے طریقے پر عمل نہیں کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر جب ہم میرٹھ میں تھے (۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۶ء تک) ہمارے پڑوس میں گھوسیوں (گوالوں) کا ایک خاندان آباد تھا۔ وہ مسلمان تھے۔ میں دیکھتا تھا کہ

صبح سے شام تک ان کی جفاکش عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ کام میں مصروف رہتیں۔ وہ کھلے میدان میں نامحرم مردوں کے ساتھ دودھ دوہنے، جانوروں کی سانی، دودھ کی تقسیم، چارے کی فراہمی، اور اپلے تھاپنے اور بیچنے میں مشغول رہتیں۔ وہ نہ میری ماں کی طرح برقع اوڑھتیں اور نہ چاردیواری میں بند رہتیں۔ کچھ اَور مسلم عورتیں بھی (ہندو عورتوں کے علاوہ) نامحرموں کی موجودگی کا ذرا احساس کیے بغیر کاروبار میں مصروف رہتی تھیں۔ ان میں دھوبن، کنجڑن، مالن، منیہارن، نائن، دائی اور ماما وغیرہ شامل تھیں۔ میری والدہ مجھے بتاتی تھیں کہ یہ چھوٹی ذات کی عورتیں ہیں جبکہ ہم اونچے اور شریف لوگ ہیں۔ اس زمانے میں مجھے اپنی شرافت پر فخر محسوس ہوتا تھا، لیکن اب میرا خیال ہے کہ "بہشتی زیور" کا عورتوں کا مثالی کردار شرفا کی بڑائی کی علامت تو ہے لیکن مزدور طبقے کی عورتوں کے لیے قابلِ عمل نہیں۔

میری ماں کے لیے ایک پردہ نشین، محکوم، دست نگر، ازدواجی تسکین بخش، بچے پیدا کرنے والی بیوی کے کردار کو ہدایت کے مطابق ادا کرنا اس لیے ممکن تھا کہ ان کے پاس باہر کے کام کے لیے نوکر تھا، کھانے پکانے والی ماما، کپڑے دھونے والی دھوبن، پاخانہ صاف کرنے کے لیے بھنگن اور پانی لانے کے لیے سقہ تھا۔ اور وہ شرفا کے لیے کیسا اچھا زمانہ تھا! ان کو نوکر دس روپے ماہوار پر مل جاتا، ماما چھ روپے ماہوار پر اور جزوقتی کام کرنے والی دھوبن، بھنگن، سقہ پانچ روپے ماہوار سے زیادہ نہیں مانگتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سستے ملازم ہمارے چادر اور چاردیواری والے آگرے کے تمدن کے رکھوالے تھے، یعنی اس تمدن کے جس کا "بہشتی زیور" میں ذکر ہے۔

میری مرحوم بیوی نے جس طرح اپنی زندگی کا انداز بدلا، وہ میری آنکھیں کھلنے کا باعث ہوا۔ وہ علامہ مشرقی کی بیٹی تھیں اور سخت پردہ نشینی میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ چاردیواری سے باہر نکلنے پر پابندی کی وجہ سے وہ کالج نہیں گئیں۔ ماں کے انتقال کے بعد کم عمری ہی میں ان کو گھر کے تمام کام خود کرنا پڑتے اور ہر روز بیس پچیس مہمان خاکساروں کے لیے روٹی بھی پکانی پڑتی۔ ہماری شادی ۱۹۳۹ء میں ہوئی اور میں ان کو برقعے میں لپیٹ کر، نامحرموں کی نگاہوں سے محفوظ، تاملوک میں ایس ڈی او کے بنگلے میں لے آیا۔ چند ماہ تو وہ مجھے "بہشتی زیور" میں بیان کردہ

پردے کی خوبیاں اور عورت کے اصل کردار کی تفصیل سمجھاتی رہیں۔ مگر پھر میں نے ان کی شخصیت میں ایک بنیادی تبدیلی کا مشاہدہ کیا۔ میری بیوی کی فعال اور انانیت پسند شخصیت تتلی کی طرح اپنے قرونِ وسطیٰ کے خول سے نکلی۔ انھوں نے پردہ، اطاعت اور دست نگری کو تج دیا۔ نامحرموں کے شانہ بشانہ کام کرتے ہوئے انھوں نے ڈھاکہ اور لاہور کے اسکولوں میں بُنائی اور رنگائی کا کام سیکھا اور آخر اپنا کارخانہ قائم کیا جس میں دس مرد کارکن تھے۔ وہ کبھی کبھی مجھے جتاتیں کہ ان کی آمدنی مجھ سے زیادہ ہے کیوں کہ مجھے وکٹوریہ کالج کومیلا کے پرنسپل کی حیثیت سے صرف ۴۵۰ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ انھوں نے کبھی میرے جوتے کے بند نہیں کھولے اور نہ موزے اتارے۔ وہ میری والدہ کی طرح "بہشتی زیور" کی بی بی کا کردار ادا نہیں کرتی تھیں کیوں کہ اپنی نسل کی دوسری عورتوں کی طرح وہ بھی آزاد، ہم پلہ اور خود مختار ہونا چاہتی تھیں۔

اور مجھے کوئی شبہ نہیں کہ میری بیٹیاں اور نئی نسل کی دوسری لڑکیاں ان سے بھی بڑھ کر پردے اور دست نگری کے خلاف ہیں اور آزاد، ہم پلہ اور خود مختار ہستی ہونا چاہتی ہیں۔

میری بیوی اور بیٹیوں کی طرح درمیانہ طبقے کی مسلمان عورتوں نے اپنی مرضی سے، دنیا بھر میں عورتوں کی بیداری کی لہر سے متاثر ہو کر، "بہشتی زیور" میں بیان کردہ عورتوں کے کردار کو بدلا ہے۔ لیکن دوسری طرف میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے اورنگی کے خاندانوں میں بھی قبیلہ واری، سرداری روایت، جس میں عورت پوری طرح مرد کی کمائی کی دست نگر ہوتی ہے، مہنگائی، بے روزگاری اور ہیروئن کی لت کی وجہ سے پارہ پارہ ہو رہی ہے۔ اورنگی میں بیویوں اور لڑکیوں کو اپنے خاندان کی کفالت کی خاطر مزدوری کرنی پڑتی ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں وہ ایسے نفع بخش کاموں میں مصروف ہیں جہاں ان کو نامحرموں سے روزانہ سامنا پڑتا ہے۔ کاروبار اور لین دین میں شرکت آج بھی "بہشتی زیور" کی پردہ نشینی سے مطابقت نہیں رکھتی، جیسے میرے بچپن کی گھوسن، دھوبن، کنجڑن اور بھنگن کی زندگی سے مطابقت نہیں رکھتی تھی، اور اس بات کی شہادت اورنگی کی ان عورتوں کی زندگی سے ملتی ہے جو اپنے خاندان کے لیے روزی کماتی ہیں، کیوں کہ یا تو وہ بیوہ ہیں یا ان کے خاوند کم آمدنی والے ہیں جو گھر کے خرچ کے لیے ناکافی ہے۔ یا اپاہج، بے روزگار، آوارہ اور نشے کی لت کا شکار ہیں۔

اپوا کی خواتین سے خطاب

[اپوا کی مجلسِ تنظیمی کے سامنے اپنے کلیدی مقالے میں ڈاکٹر اختر حمید خاں نے پاکستانی عورتوں کے مسائل کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی اور کہا کہ چینی، ترکی اور مغل سلطنتوں کے زوال کا بڑا سبب اُن کا اپنی عورتوں سے برتاؤ تھا۔ اُن کی تقریر حسبِ ذیل ہے۔]

اگر ہم قرونِ وسطیٰ میں جائیں، یعنی مثال کے طور پر ۱۶۵۰ء میں، تو ہم کو تین بڑی سلطنتیں نظر آئیں گی: ترکی، چینی، اور مغل۔ یہ تینوں سلطنتیں طاقتور، امیر اور پُرشوکت تھیں۔ اس وقت دوسرے ممالک ان پر رشک اور حسد کرتے، اور اُن کے انداز اور رسم و رواج کی نقل کرتے تھے۔ ان کا تمدن پائیدار اور ترقی یافتہ لگتا تھا۔ لیکن دو سو سال بعد، یعنی ۱۸۵۰ء میں، ہم کیا دیکھتے ہیں؟ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بڑی سلطنتیں اور اُن کا ترقی یافتہ تمدن زوال پذیر اور موت کے قریب ہے۔

جب سوال کیا جاتا ہے کہ زوال کے اسباب کیا ہیں اور اسے کیسے روکا جا سکتا ہے تو دو نظریے سامنے آتے ہیں۔ ایک روایت پسندوں کا نظریہ ہے جو کہتے ہیں کہ قدیم اقدار پر اَور زیادہ شدت سے عمل کرنا چاہیے۔ اور دوسری طرف اصلاح پسند ہیں جن کا کہنا ہے کہ کچھ پرانی اقدار کو ترک کر دینا چاہیے۔ زوال کے دور میں روایت پسندوں اور اصلاح پسندوں کے بیچ اختلاف دیرپا اور شدید ہوتا ہے۔ یہ اسی شدت سے چوتھی صدی عیسوی میں رومن ریاست کے زوال کے وقت ہوا تھا جیسا انیسویں صدی میں چینی اور ترکی ریاست کے زوال کے وقت ہوا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے نرم مزاج مصلح سید احمد خاں کو روایت پسندوں نے باغی گردانا تھا۔

آیئے چینی ریاست کے زوال پر غور کریں۔ انیسویں صدی میں ان کی تہذیب قدیم ترین

زندہ تہذیب تھی۔ ان کی اخلاقی اقدار بزرگوں کی عزت، امن پسندی، اطاعت، نرم روی، اور نفاست پسندی پر مبنی تھیں۔ لیکن یہ سب اقدار اندورنی انتشار اور بیرونی حملوں سے پارہ پارہ ہو گئیں۔ اقوام کی تاریخ میں اندورنی انتشار اور بیرونی حملے ایک دوسرے سے بے حد قریبی طور پر منسلک ہوتے ہیں۔ ایک منتشر غیر مطمئن قوم، اُسی طرح بیرونی حملوں کو دعوت دیتی ہے جسے ایک کم زور جسم بیماری کو۔ چین کی اندورنی کم زوری کے اسباب کا سیر حاصل تجزیہ ہو چکا ہے اس لیے ہم کو ان سب کو زیرِ بحث لانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان میں سے ایک سبب ہماری توجہ چاہتا ہے۔ یہ چینی معاشرے میں عورتوں کی حیثیت ہے۔ وہاں عورتوں کے دو اہم کام تھے: پہلا بچے پیدا کرنا، خاص طور پر لڑکے، اور دوسرا داشتہ بن کر مردوں کا دل خوش کرنا۔ چینی مرد، حسبِ توفیق، زیادہ سے زیادہ بیویاں اور باندیاں رکھتے تھے۔ کسی نے اِس فعل پر کبھی اعتراض نہیں کیا، چینی عورتوں نے بھی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان پر ان کے غریب پڑوسی اُسی طرح رشک کرتے جیسے کراچی میں موٹر سائیکل رکھنے والا اپنے پڑوسی پر رشک کرتا ہے جس کے پاس کئی کاریں ہوں۔ باندیاں اپنے ریشمی لباسوں اور زیوروں پر فخر کرتی تھیں۔ خوب صورت عورتوں کے مالک ان کی کڑی نگرانی کرتے۔ حسد کے جذبے پر مبنی ایک اور رسم بچپن میں لڑکیوں کے پیر تنگ جوتوں میں جکڑ کر رکھنے کی تھی تاکہ وہ بڑی ہو کر آزادی سے چل پھر نہ سکیں اور اپنے بستر پر خوب صورت مورتی بن کر بیٹھی رہیں۔

بہت سی بیویاں اور داشتائیں رکھنا حاکم مزاج چینی مردوں کی تسکین کا باعث تھا۔ لیکن تعددِ ازواج اور داشتائیں رکھنے کے رواج نے چینی قوم کی توانائی کو زائل کر دیا۔ نہ صرف یہ کہ قوم کی نصف آبادی محکومیت اور دست نگری کی غیر صحتمندانہ حیثیت میں گرفتار ہو گئی بلکہ خاندانی زندگی اور بچوں کی پرورش بھی ایک نہایت دشوار عمل بن کر رہ گئی۔ آخر کار، مرد اپنی اخلاقی قوّت سے بالکل محروم ہو گئے۔ عورتوں کو محکوم بنانے، ان کو مساوی انسانی وقار سے محروم رکھنے اور انھیں بچے پیدا کرنے والے جاندار یا جنسی تسکین دینے والے آلے سے بڑھ کر کچھ نہ سمجھنے کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

مہربانی فرما کر تاریخ نویسوں سے اِس بنا پر ناراض نہ ہوں کہ وہ ترک اور مغل سلطنتوں کے

زوال کا سبب بھی انھیں رسوم و رواج کو ٹھہراتے ہیں۔ وہاں بھی کئی بیویاں رکھنا اور باندیوں کی افراط حاکم مردوں کا وتیرہ تھا۔ جاگیرداروں کے حرم میں بہت سی بیویاں اور باندیاں ہوتی تھیں۔ شہروں میں بے حد تہذیب یافتہ طوائفوں اور ناچنے والیوں کی فراوانی تھی جن کے حُسن سے یورپ کے جہاں گرد مسحور ہوتے تھے۔ لیکن زوال آمادہ چینی امرا کی طرح زوال آمادہ مغل اور ترک رئیس بھی، جو پُر تعیش حرم میں پرورش پاتے تھے، بہت سی بیویوں اور باندیوں کے ساتھ بڑے ہو کر صرف مرغِ زریں بن جاتے تھے۔

بہرحال اب چینی اصلاح پسندوں کی طرف لوٹتے ہیں۔ وہ اپنے پیارے وطن پر بیرونی جارحیت کا، نوآبادیاتی حملوں کا خاتمہ چاہتے تھے۔ لیکن وہ یہ بات پوری طرح سمجھ چکے تھے کہ یہ بات بغیر اندورنی زوال اور شکست و ریخت کو ختم کیے ممکن نہیں ہو گی۔ چین کے بڑے رہنماؤں نے، مثلاً سن یات سین (۱۸۶۶ء-۱۹۲۵ء) جس نے چین کی جمہوری حکومت (۱۹۱۱ء) کی بنیاد رکھی، یا ماؤزے ڈونگ (۱۸۹۳ء-۱۹۷۶ء) نے بار بار کہا کہ آزادی کی جنگ دو محاذوں پر لڑنی ہو گی۔ برے رسم و رواج کے خلاف جنگ نہ صرف اہم ہے بلکہ غلامی کے خلاف جنگ سے زیادہ اہم ہے۔ سن یات سین اور ماؤ نے بار بار عورتوں کے حقوق کی بات کی۔ وہ ان کو غلام یا خوبصورت پالتو جانور نہیں بلکہ مردوں کا ہم پلہ شریک بنانا چاہتے تھے۔ چناں چہ اب چین میں عورتوں کی حیثیت بالکل بدل گئی ہے؛ وہ اب نہ الگ تھلگ ہیں اور نہ محکوم۔ کئی بیویاں اور باندیاں رکھنے کی اب اجازت نہیں اور نہ بچیوں کے پیر باندھے جاتے ہیں۔ اور تاریخ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ چین کی نئی زندگی میں عورتوں کی آزادی نے ایک بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

سن یاٹ سین اور ماؤ کی طرح نوآبادیاتی سامراج سے جنگ کرنے والے قومی حیات نو کے دوسرے رہنما بھی عورتوں کی آزادی کے وکیل رہے ہیں۔ وہ بھی اپنے ہم قوموں سے التجا کرتے ہیں کہ پُرانی رسوم اور طریقوں کو تج دیں جن کی وجہ سے عورتیں غلام بن گئی ہیں اور اُن کی غلامی کی وجہ سے پوری قوم زوال آمادہ ہے۔ موہن داس کرم چند گاندھی (۱۸۶۹ء-۱۹۴۸ء) کا پیغام ہندوستانی عورتوں کے لیے وہی ہے جو سن یات سین کا چینی عورتوں کے لیے تھا۔ آزاد اور ہم پلہ ہو جاؤ، جاہل اور مردوں کا کھلونا، امربیل یا پالتو جانور بن کر مت رہو۔ کمال اتاترک

(۱۸۸۱ء-۱۹۳۸ء) نے ترکی عورتوں کو اور سوکارنو (۱۹۰۱ء-۱۹۷۰ء) نے انڈونیشیا کی عورتوں کو یہی پیغام دیا۔ اور کیا ہمارے قائدِاعظم نے مسلم عورتوں کو یہی پیغام نہیں دیا؟

جب سن یات سین، اتاترک، سوکارنو، گاندھی اور ہمارے قائدِاعظم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عورتوں کو آزاد ہونا چاہیے، اُن کو نہ صرف آزاد بلکہ ذمّے دار ہونا چاہیے، تو کیا ہم کہیں گے کہ یہ عظیم رہنما بے حیائی کی تعلیم دے رہے ہیں؟ وہ چند بُری رسومات اور رواجوں کو بدلنا چاہتے تھے جو پاؤں کی بیڑی کی طرح قوم کی حیاتِ نو کو روک رہے تھے۔ لیکن اُسی زمانے میں چند روایت پسند بھی تھے جو ایمان داری سے اعتقاد رکھتے تھے کہ مردوں کے حاکمانہ اختیارات ہمیشہ رہنے چاہییں۔ یہ روایت پسند اُس وقت کی طرح اب بھی اصرار کرتے ہیں کہ عورتوں کی آزادی اور برابری بے حیائی ہے اور اس لیے ناپسندیدہ ہے اور یہ کہ عورتوں کو پہلے کی طرح مردوں کی حفاظت میں رہنے پر راضی ہونا چاہیے جیسے وہ قرونِ وسطیٰ میں رہتی تھیں۔

اپوا کی خواتین! آپ پاکستان میں عورتوں کی آزادی اور برابری کے عالم گیر پیغام کی وارث ہیں۔ چینی، ترکی، انڈونیشی اور ہندوستانی خواتین نے اس پیغام پر عمل کیا ہے۔ پچھلے پچاس سال میں انھوں نے خاصی ترقی کی ہے۔ کیا آپ یہ بات پاکستانی عورتوں کے لیے، خاص طور پر دیہاتی عورتوں کے لیے جو آج بھی بڑی اکثریت میں ہیں، کہہ سکتی ہیں؟ ہم مسلمانوں کو اپنے آپ کو سب سے اچھی ملّت کہنے کا شوق ہے۔ بڑائی کا زعم رکھنا بہت آسان ہے، لیکن اقوام کی بڑائی ناپنے کے چند متفقہ پیمانے ہیں۔ یہ بے حد سادہ ہیں۔ پہلا پیمانہ تعلیم ہے۔ ایک معاشرہ جس میں اسّی فی صد لوگ ناخواندہ ہوں، پس ماندہ ہے۔ دوسرا پیمانہ صحت ہے۔ ایک معاشرہ جس میں شیر خوار بچوں کی اموات زیادہ ہوں اور جہاں وبائی امراض بار بار حملہ آور ہوں اور جہاں زندگی کا اوسط کم ہو، ایک پس ماندہ معاشرہ ہے۔ وعلیٰ ہذالقیاس۔ پاکستانی عورتوں کے بارے میں کوئی بھی پیمانہ لے لیں، وہ پس ماندہ ملیں گی۔

اپوا کی خواتین! آپ کو ایک الم ناک صورت حال کا سامنا ہے۔ پچھلے چالیس پچاس سال میں تعلیم، صحت، ملازمت، برابری کے حقوق کے حصول میں دوسرے ملکوں کی عورتوں نے جو پیش رفت کی ہے، اس کے مقابلے میں ہماری عام عورتوں کی ترقی کی رفتار افسوس ناک حد تک سُست

ہے، اور کوئی اُمید افزا صورت ایسی نظر نہیں آتی کہ یہ رفتار تیز ہو گی۔ ترقی جو عام طور پر بیان کی جاتی ہے، اس کا انحصار چند حقائق پر ہے۔ مثال کے طور پر اگر معاشرہ عورتوں کے پردے پر اصرار کرتا ہے تو اُن کی خواندگی کی شرح کم ہو گی، ان کی صحت کا معیار گھٹیا ہو گا اور وہ جبر اور امتیازی سلوک کا شکار رہیں گے۔ چادر اور چاردیواری کے خول میں بند ہو کر ہماری عورتیں کبھی چینی، ترکی، انڈونیشی یا ہندوستانی عورتوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گی۔

یہ صورتِ حال نہ صرف عورتوں کے لیے بلکہ مردوں کے لیے بھی المناک ہے اور اس وجہ سے سارے ملک کے لیے، کیوں کہ ترقی کی بنیاد مربوط حرکت پر ہے۔ اگر عورتوں کی اکثریت پس ماندہ ــــ ناخواندہ، بیمار، مجبور ــــ ہے تو مردوں کی اکثریت بھی پس ماندہ ــــ ناخواندہ، بیمار اور قانون سے باغی ــــ رہے گی۔

اپوا کی خواتین! آپ کے سامنے جو چیلنج ہے وہ بہت بڑا ہے، اُس سے کہیں بڑا جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔ یہ صرف دیہاتی عورتوں کی اصلاح کرنے، بچیوں کے لیے گھریلو کارخانے قائم کرنے یا زچہ بچے کی دیکھ بھال کے مراکز قائم کرنے کا چیلنج نہیں ہے۔ یہ اچھے کام ہیں لیکن یہ صرف مسئلے کی سطح کو چھوتے ہیں۔ آپ کا اصل چیلنج یہ ہے کہ اُن زنجیروں اور بیڑیوں کو، اُن پرانے رسم و رواج کو جو ہماری عورتوں کو، نہ صرف عورتوں کو بلکہ مردوں اور پوری قوم کو، پس ماندہ رکھے ہوئے ہیں، واضح طور پر دیکھیں۔ آپ کا چیلنج یہ ہے کہ ان بیڑیوں کو کاٹیں اور رسم و رواج کو تبدیل کریں۔ آپ آزاد ہیں، آپ کو تمام عورتوں کو آزادی دلوانا چاہیے؛ ان کی ناخواندگی، بیماری اور جبر کو دور کرنا چاہیے اور ان کو قومی ترقی میں برابر کی شرکت دلوانا چاہیے۔ آپ قائدِاعظم کی میراث کی امین ہیں۔ آپ کے قائدِاعظم روایت پسند نہیں تھے، اور نہ ان کی پارٹی روایت پسند تھی۔ ان کی پارٹی، پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ، نے عورتوں سے کہا تھا کہ وہ مغل امرا کی خواتین کا طرزِزندگی نہ اپنائیں۔ وہ پاکستان کو ایک جدید ریاست اور پاکستانی قوم کو ایک جدید قوم بنانا چاہتے تھے۔

آزاد خواتین! آپ کا چیلنج پچھلے دور کے چیلنج سے زیادہ مشکل ہے۔ روایت پسند آپ کے خلاف پہلے سے زیادہ شدّت سے حملہ آور ہیں۔ لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جب چین میں، ترکی

میں، انڈونیشیا میں اور ہندوستان میں عورتوں کو قرونِ وسطیٰ کی عورتوں کی طرح زندہ رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکا تو پھر پاکستان کو اس قانون سے کیسے الگ کیا جائے گا؟

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے میں ایک بےلاگ تبصرہ کروں گا جس کے لیے امید ہے آپ مجھے معاف فرمائیں گی۔ اپوا کی خواتین! آپ کا کام تعلیم دینا، روشنی پھیلانا اور رہنمائی تھا، لیکن آپ نے اپنے شان و شوکت کے رہن سہن سے اپنے اعتماد کو خود مجروح کیا ہے۔ آپ نے روایت پسندوں اور اُن کے جذباتی پیروکاروں کو خود اپنی پٹائی کے لیے ڈنڈا فراہم کیا ہے۔ آپ کی ہم عصر چینی عورتوں کی آزادی کی خواہاں لیڈروں نے یہ غلطی نہیں کی تھی۔ آپ کے عمل سے شان و شوکت کا چلن اور خواتین کے آزادی کے نظریے میں پراگندگی آئی ہے۔ چین کی عورتوں کی سادگی اور وابستگی نے آزادیِ نسواں کے خیال کو قوّت اور شہرت بخشی تھی۔ ایک دن آپ بھی شان و شوکت کے رہن سہن سے چھٹکارا حاصل کرلیں گی۔ آپ بھی خالص آزادی کے جذبے اور شان کا مظاہرہ کریں گی۔ انشاءاللہ۔

("ڈان"، ۱۸ مئی ۱۹۸۴ء)

میں نے کومیلا اور اورنگی میں کیا سیکھا

میں نے ۱۹۳۶ میں آئی سی ایس میں داخل ہو کر نو سال تک محنت سے افسری کی۔ پھر اپنے سوچنے سمجھنے والے ذہن کی افتاد کے پیشِ نظر استاد بننے کا فیصلہ کیا۔ چند سال میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی جامعہ ملیہ میں، جو ایک گاندھیائی ادارہ تھا، تدریس کا کام کیا۔ بعد میں ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائی میں مجھے امریکن پروفیسروں سے بہت رہنمائی ملی۔ ان انگریزی، گاندھیائی اور امریکن استادوں کا قرض جو مجھ پر ہے، میں نے ہمیشہ کھلے دل سے اُسے تسلیم کیا ہے۔ تقدیر نے مجھے بہت سے عملی آزمائشی منصوبوں میں کام کا موقع فراہم کیا، جہاں میں نے اپنے استادوں کی تعلیم سے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔

اپنے تحقیقی کام کے دوران میں نے بہت سے مقالے لکھے، جو کومیلا اکادمی (Collected Works)، وین گارڈ لاہور (Rural Development in Pakistan) اور مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی (Ten Decades of Rural Development) نے شائع کیے ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ میری طرح کے اسّی سال کے بابوں کو بہت زیادہ گفتگو نہیں کرنی چاہیے اور نہ نئی نسل کے لیڈروں کو مشورہ دینا چاہیے۔ لیکن آج جب کہ مجھے ایسے قابل، منصوبہ بندی کے ماہروں اور کارکنوں سے گفتگو کا موقع ملا ہے، میں اپنے دو آزمائشی منصوبوں ___ کومیلا (۱۹۵۸ء-۱۹۷۱ء) اور اورنگی (۱۹۸۰ء-۱۹۹۰ء) ___ کے تجربے بیان کروں گا۔

فورڈ فاؤنڈیشن کی امداد سے حکومتِ پاکستان نے دیہی ترقی کی دو اکادمیاں قائم کیں: ایک پشاور میں مغربی پاکستان کے لیے اور دوسری کومیلا میں مشرقی پاکستان کے لیے۔ ۱۹۵۸ء میں اس وقت کے وزیرِاعظم پاکستان چودھری محمد علی نے مجھے کومیلا اکادمی کا ڈائریکٹر مقرر کیا۔ عجیب

بات ہے، جیسا کہ انھوں نے خود مجھے بتایا، انھوں نے سوچا تھا کہ میں سرکاری افسروں کے لیے اچھا معلم ثابت ہوں گا کیوں کہ میں نے آئی سی ایس سے استعفیٰ دیا تھا۔

فورڈ فاؤنڈیشن نے مشیگن اسٹیٹ یونیورسٹی کو مشاورت کے فرائض سونپے۔ گیارہ اعلیٰ تعلیم یافتہ معلم منتخب کیے گئے جن کو نظم و نسق، عمرانیات، نفسیات، معاشیات، تعلیم اور اعداد وشمار کے میدانوں میں مہارت حاصل تھی، اور اُن کو ایک سال کے لیے مشیگن یونیورسٹی میں تربیت کے لیے بھیجا گیا۔ وہاں میں نے خاص طور پر لینڈ گرانٹ کالجوں، جرمن کوآپریٹوز اور ڈینش عوامی اسکولوں کی ابتدا کا مطالعہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ پاکستان میں دیہی مسائل ویسے ہی ہیں جیسے وسط انیسویں صدی میں لینڈ گرانٹ کالجوں، جرمن کوآپریٹوز اور ڈینش عوامی اسکولوں کو درپیش رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ ضروری ترمیم کے ساتھ انھی قدیم طریقوں پر عمل کیا جائے۔ مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی کے مشیر اس بات پر حیران تھے کہ میں پرانے دانش مندوں کو جدید دور کے ماہرین پر کیوں ترجیح دیتا ہوں؛ تاہم انھوں نے میرے تحقیق اور تجربے کے طریقے کی پوری طرح تائید کی۔

کومیلا اکادمی نے ۱۹۵۹ء میں کام شروع کیا۔ اس درمیان میں جنرل ایوب خاں نے ملک میں بنیادی جمہوریت کا نظام نافذ کر دیا تھا۔ حالاں کہ سینڈھرسٹ کے تربیت یافتہ جنرل کو اُس قدیم خوش گوار زمانے میں واپس جانے کی خواہش تھی جب محدود رائے دہی کا حق ہوتا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ ایمان داری سے ملک میں ترقی کے بارے میں ہارورڈ کے مشیروں اور ورلڈ بینک کے خیالات سے متفق تھا۔ خوش قسمتی سے کومیلا اکادمی کو ایوب خاں اور ہارورڈ کے مشیروں کی سرپرستی حاصل تھی۔ ایوب خاں نے مجھے اُس وقت محافظت فراہم کی، جب سود خور مہاجن اور بے ایمان ٹھیکے دار میری مخالفت کر رہے تھے اور مجھے اس بنا پر بھگانا چاہتے تھے کہ اُن کے خیال میں میں ایک خفیہ اشتراکی تھا جو پاکستان کے خلاف مصروف کار تھا۔ ہارورڈ کے مشیروں نے اکادمی کے تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی کی اور منصوبہ بندی کے محکمے سے بہت سے اہم کام اکادمی کو دلائے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے ذاتی طور پر اعداد وشمار جمع کرنے اور ترتیب دینے میں ہماری نگرانی کی اور اکادمی کے کام کے نمونے کو دوسری جگہ رائج کیا۔ مشرقی پاکستان کا چیف سیکریٹری

اکادمی کے بورڈ کا چیئرمین اور دوسرے سیکریٹری اس کے ممبر تھے؛ اس وجہ سے اکادمی کو مثالی امداد حاصل رہی، یہاں تک کہ ہندوستان کے ساتھ جنگ نے ایوب خاں، بارورڈ کے مشیروں اور مشرقی پاکستان، ہر چیز کو درہم برہم کر دیا۔

اکادمی کو ایک سو مربع میل کے رقبے میں واقع کوتوالی تھانے کے تین سو دیہات کو تحقیقی اور تجرباتی کام کے لیے اپنی تجربہ گاہ بنانے کی اجازت دی گئی تھی۔ تحقیق سے پتا چلا کہ پہلی ضرورت آبپاشی کے نظام، یعنی بند اور سڑکوں کی تعمیرِ نو کی تھی۔ ہر سال سیلاب سے بے حد نقصان ہوتا کیوں کہ نالوں میں مٹی جم گئی تھی اور بند ٹوٹ رہے تھے۔ رابطے کی سڑکیں نہیں تھیں، اس وجہ سے تجارت اور پیداوار کم ہوتی تھی۔ زمینداری نظام، جو لارڈ کارنوالس نے شروع کیا تھا اور جو کسی حد تک بندوں اور کھالوں کی دیکھ بھال کرتا تھا، پاکستان بنتے ہی ختم ہو گیا۔ یقیناً اب ایک نئے نظام کی ضرورت تھی جو نہ صرف پہلے سے موجود کھالوں اور بندوں کی دیکھ بھال کر سکے بلکہ بڑے پیمانے پر ان کو ٹھیک کرے اور نئے سرے سے تعمیر کرے، کیوں کہ موجودہ محکمے یہ کام کرنے سے قاصر تھے اور بغیر سیلاب سے بچاؤ کے بندوں اور رابطہ سڑکوں کے زرعی پیداوار میں اضافے کی امید عبث تھی۔

ایک سال کی مسلسل کوشش کے بعد کومیلا تھانے میں گاؤں کی ترقی کا پروگرام ترتیب دیا گیا:

۱۔ تھانا کونسل اور یونین کونسل کو باقاعدہ تربیت دی گئی کہ وہ کھالوں، بندوں اور سڑکوں کی تعمیر کے لیے پنج سالہ منصوبے بنائیں۔

۲۔ ہر سال ان کونسلوں کو منصوبوں کو مکمل کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے مالی امداد ملتی تھی۔

۳۔ تھانا کونسل کو انجنیئر اور اکاؤنٹنٹ فراہم کیے گئے تاکہ وہ منصوبے کی کمیٹی کو تربیت دیں۔ یہ کمیٹیاں تمام کام ٹھیکے دار کے ذریعے نہیں بلکہ خود کرواتی تھیں، اور یہ کام بے حد تیز رفتاری سے اور محض ایک چوتھائی خرچ پر ہو جاتا تھا۔

۴۔ دیہی ترقی کے کام سے حمل و نقل کا نظام جلد تعمیر ہو گیا اور اس سے بے زمین کسانوں کو مزدوری بھی ملی۔

۵۔ کنٹرول کے تحت آبپاشی کا نظام ـــــ تالابوں سے پانی پمپ کرنا اور ٹیوب ویل لگانا ـــــ پروگرام میں شامل تھا تاکہ زیرزمین پانی کام میں لایا جائے۔ لیکن ٹیوب ویل کی دیکھ بھال کو کونسل کی بجائے ضرورت مندوں کے گروپ کے سپرد کیا گیا تاکہ پروگرام خود کفیل ہوجائے۔

تحقیق سے دوسرا اہم مسئلہ جو دریافت ہوا وہ چھوٹے کاشتکاروں کی غربت کا تھا۔ ان میں سے نوے فیصدی کے پاس پانچ ایکڑ سے کم زمین تھی۔ فصل کی پیداوار فی ایکڑ بے حد کم اور سیلاب اور کیڑوں سے نقصان بہت زیادہ ہوتا تھا۔ اور پھر سودخوروں اور بیوپاریوں کی لوٹ مار اس کے علاوہ تھی۔ چناں چہ کاشتکاروں کی حالت بہتر بنانے کے لیے دو سطح والی کوآپرٹیو سوسائٹی کا نظام وضع کیا گیا۔ اس نظام میں نہ صرف وافر قرض کی آسانی تھی بلکہ ممبروں کو بچت اور حصص کی خریداری کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ ان کو جدید کاشت کے طریقے سکھائے جاتے اور اُن طریقوں پر عمل کرنے کی ترغیب بھی دی جاتی۔ یہی نہیں بلکہ خود کو منظم کرنا بھی سکھایا جاتا۔ تھانا ایسوسی ایشن خرید و فروخت میں مدد کرتی اور زرعی صنعت کے قیام میں معاون ہوتی۔

پہلا اہم کام ـــــ بندوں، کھالوں، سڑکوں اور آب پاشی کے نظام کی تعمیر ـــــ مقامی کونسلوں نے دیہی تعمیر کے محکمے کی مالی امداد سے بخوبی انجام دیا۔

دوسرا اہم کام ـــــ کاشتکاروں کو زیادہ پیداوار حاصل کرنے والا اور صاحب مقتدرت بنانا ـــــ بڑی خوبی سے کوآپریٹوز نے کیا۔ یہ دونوں ادارے حکومت کے دوسرے محکموں کے ساتھ تھانے کے مرکز میں ایک ہی عمارت میں قائم کیے گئے تھے جو تھانا ٹریننگ اینڈ ڈویلپمنٹ سنٹر (TTDC) کہلاتی تھی۔ اس عمارت میں تھانا کونسل تھانا کوآپریٹو ایسوسی ایشن، محکمۂ زراعت کے افسر، حیوانات کے معالج، ماہی پروری کے افسر، تعلیم اور محکمۂ صحت کے افسران بیٹھتے تھے۔ ٹی ٹی ڈی سی میں بہت بڑی تعداد میں دیہاتوں سے نمائندے تربیت کے لیے ہر ہفتے آتے تھے: کونسلر، کوآپریٹو مینیجر، مثالی کاشتکار، معلم، امام صاحبان، خواتین، آرگنائزر اور دائیاں۔ چناں چہ ٹی ٹی ڈی سی ہمہ جہتی دیہی ترقی کی علامت بن گیا۔

اس آزمائشی منصوبے میں چار آسان اصولوں پر عمل ہوتا تھا:

۱۔ مسائل پر سیر حاصل تحقیق کی جاتی۔

۲۔ پھر دو مقبول اداروں کونسل اور کوآپریٹو کو، جو سست ہو گئے تھے، فعال کر کے مسائل کو ان کے سپرد کیا جاتا اور کام میں ان کی تائید اور مدد کی جاتی۔

۳۔ حکومت کے افسران معلم اور تربیت کنندہ کے فرائض انجام دیتے۔

۴۔ دیہات کے نمایاں کارکنوں کو تکنیکی امداد وسیع پیمانے پر فراہم کی جاتی۔

تھوڑے ہی عرصے میں کومیلا تھانے کے علاقے میں غیر معمولی نتائج ظاہر ہوے۔ آزمائشی نمونہ، جو وہاں وجود میں آیا، تربیت کے لیے اچھا مواد ثابت ہوا۔ ہارورڈ کے مشیروں نے حکومت مشرقی پاکستان کو راضی کیا کہ وہ اس نمونے کو دوسری جگہ اپنائیں۔ چناں چہ ۱۹۶۰ء میں مشرقی پاکستان کے تمام ۴۱۷ تھانوں میں ٹریننگ اینڈ ڈویلپمنٹ سنٹر قائم کیے گئے اور دیہی ترقی کا کام شروع ہوا۔

۱۹۷۱ء تک ۲۵۰ تھانوں میں تھانا کوآپریٹو ایسوسی ایشن اور آب پاشی کا نظام قائم ہو گیا اور دیہی تعمیر اور ہمہ جہتی دیہی ترقی کا منصوبہ ورلڈ بینک اور ہارورڈ کے مشیروں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہو گیا۔ ورلڈ بینک کے مشیر دیہی ترقی کے اس کام کو انڈونیشیا لے گئے جہاں مسلسل محنت سے ۱۹۶۴ء کے بعد اس کی وجہ سے وہاں کی دیہاتی زندگی میں انقلاب آ گیا۔

۱۹۷۱ء میں مجھے کومیلا چھوڑنا پڑا۔ دو سال میں نے فیصل آباد میں زرعی یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی میں پڑھایا۔ اپنے قریبی ماضی سے متاثر ہو کر میں نے قحط، کرائے داری کی اصلاح، کوآپریٹو زراعت اور تعلیم کے موضوعات پر کمیشنوں کی رپورٹیں پڑھیں۔ پھر اگلے دو سال میں پشاور اکادمی میں رہا جہاں میرے دوست شعیب سلطان نے داؤدزئی کا منصوبہ کومیلا کے انداز سے شروع کیا تھا۔ بہت جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ ایوب خاں اور ہارورڈ کے مشیروں کا قائم کیا ہوا اداریاتی ڈھانچا، یعنی ٹریننگ اینڈ ڈویلپمنٹ سنٹر جس میں حکومت کے تمام محکمے کونسل اور کوآپریٹو سے مل کر کام کرتے تھے، نئے پاکستان میں فرسودہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس وقت میں ساٹھ سال کا ہو گیا تھا اس لیے میں نے خوشی سے اپنے آپ کو گھورے پر پھینکا جانا قبول کر لیا۔ جہاں سے اٹھا کر مشگن اسٹیٹ یونیورسٹی نے مجھے دوبارہ فعال کر کے ترقیات کا معلم بنا دیا۔

دو سال بعد میں پڑھانے سے تھک گیا اور کراچی واپس آ کر بڑھاپے کے دور کو پُرامن

غور و فکر میں گزارنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جب بی سی سی آئی فاؤنڈیشن کے آغا حسن عابدی نے مجھے دعوت دی کہ میں اورنگی میں ایک اور آزمائشی منصوبہ شروع کروں تو میں اس ترغیب کی مزاحمت نہ کر سکا۔ ایک معنی میں اورنگی پائلٹ پروجیکٹ، کومیلا اکادمی سے بہت مختلف تھا۔ یہ ایک پرائیویٹ ادارہ تھا، جس کے چھوٹے سے بجٹ کا انحصار ایک این جی او پر تھا۔ حکومت وقت کے آمدنی اور قوت کے وسائل، بارورڈ کے مشیر، مشیگن اسٹیٹ یونیورسٹی اور فورڈفاؤنڈیشن موجود نہیں تھے۔ او پی پی کے ڈائریکٹر کے پاس نہ دفتر تھا نہ عملہ، نہ کوئی اثرورسوخ، نہ تعلقات۔ صرف ایک پرانی جیپ تھی۔ اس پر سوار وہ کومیلا اکادمی کے ڈائریکٹر سے زیادہ روبن سن کروسو سے ملتا جلتا تھا۔ لیکن دوسرے معنی میں او پی پی اور کومیلا اکادمی ایک دوسرے سے مماثل تھے، دونوں میں توسیع اور تحقیق کا وہی اصول کارفرما تھا: پہلے سیکھو، پھر سکھاؤ۔

میں نے اپنے ذہن کو اس بات کا عادی کیا کہ ایک پرائیویٹ ادارے میں وسائل حکومتی ادارے کے مقابلے میں محدود ہوتے ہیں۔ او پی پی کے پاس نہ تو کوئی اختیار تھا اور نہ قوت نافذہ۔ وہ مشورہ دے سکتی تھی، مشورے کو نافذ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ لوگوں کو منظم تو کر سکتی تھی لیکن صرف رضاکارانہ بنیاد پر۔ وہ سہولیات فراہم کرنے میں حکومت کے محکموں سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے اپنی مکمل ناواقفیت کا اعتراف کھلے دل سے کیا۔ میں نے کراچی میں کبھی رہائش اختیار نہیں کی تھی اور یہاں بالکل نووارد تھا۔ یہ بڑا شہر کومیلا سے بالکل مختلف تھا۔ پس میں نے پہلے اپنی تربیت شروع کی۔ کئی مہینے میں اپنی ٹوٹی پھوٹی جیپ میں اورنگی کے چکر لگاتا رہا۔ وہاں میں نے گلیوں کو غور سے دیکھا۔ لوگوں سے، افسروں، کونسلروں، دلالوں، ایسوسی ایشن کے چیرمینوں اور کلب کے ممبروں سے بات چیت کی۔ آہستہ آہستہ مجھے اندازہ ہوا کہ اورنگی میں کس قسم کے لوگ آباد ہیں، ان کے کیا مسائل ہیں، وہ ان مسائل کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، ان مسائل کے بارے میں ان کا کیا ردعمل ہے اور ان کو حل کرنے کی وہ کیا کوششیں کر رہے ہیں۔

اورنگی کراچی کی سب سے بڑی کچی آبادی ہے۔ وہ شہر کا اندرونی قدیم محلہ نہیں بلکہ ایک نیا ذیلی شہر ہے جو ۲۵ سال پہلے بسنا شروع ہوا۔ اس کی آبادی آج دس لاکھ ہے جس میں مہاجر،

اردو بولنے والے بہاری (وہ مہاجر جو ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش سے آئے)، پٹھان، پنجابی، سندھی اور بلوچی شامل ہیں۔ اورنگی فخر سے چھوٹا پاکستان کہلاتا ہے۔ یہاں کے باشندوں کی اکثریت مزدور پیشہ ہے۔ ایک تجزیے کی رو سے، جو ۱۹۸۹ء میں کیا گیا، یہاں ایک سو دس سیکٹر یا محلّے ہیں جن میں ۶۳۴۷ گلیاں اور ۹۴۱۲۲ مکانات ہیں۔ باہر سے نئے مہاجر یہاں آ کر مکان تعمیر کر رہے ہیں۔ لوگوں کو اپنی گلی اور ووٹ کی قوّت کا پورا احساس ہے۔ ہر محلّے میں بہت سی انجمنیں اور ایسوسی ایشنیں ہیں۔ سرکاری اداروں پر دباؤ ڈالنے کا طریقہ بے حد مقبول ہے، بار بار مطالبات کیے جاتے ہیں اور شکایات حاکموں تک پہنچائی جاتی ہیں۔

سرکاری اداروں کے پاس نہ اتنے وسائل ہیں اور نہ مہارت کہ وہ ان مطالبات کو پورا کریں۔ وہ سہولیات جو ابھی تک فراہم کی گئی ہیں بے حد ناکافی ہیں۔ او پی پی ایک این جی او کی حیثیت سے نہ تو دعویٰ کرتی ہے کہ وہ حکومتی اداروں کی اہلیت بڑھا سکے گی نہ اس کی قدرت رکھتی ہے اور نہ وہ دباؤ ڈالنے کا طریقہ اختیار کرنا چاہتی ہے کیوں کہ اورنگی میں ایسی تنظیموں کی بہتات ہے۔ لہذا او پی پی نے اپنے لیے ایک نیا منصب پسند کیا۔

تحقیق سے ظاہر ہوا کہ اورنگی میں مکین زیادہ تر اپنا کام خود کر رہے ہیں۔

* پچانوے ہزار مکانات، بغیر کسی حکومتی ترقیاتی ادارے یا ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن کی مدد کے، تعمیر کیے گئے۔

* پانچ سو نجی اسکول اور ۶۴۵ نجی شفاخانے قائم ہوے۔ اس کے علاوہ ذرائعِ حمل و نقل زیادہ تر نجی ہیں۔

* گیارہ ہزار سے زیادہ دکانیں، کارخانے اور گھریلو کاروبار ہزاروں لوگوں کو روزگار فراہم کر رہے ہیں۔

لوگوں کی اپنی کاوش اور تحریک کو بہتر بنانے اور اُن کی صلاحیت بڑھانے کے لیے او پی پی نے ایک امدادی ادارے کی شکل اختیار کی جس کے پاس تھوڑے سے کاریگر اور سماجی کارکن تھے اور جو لوگوں کو تکنیکی اور معاشی مشورے فراہم کرتی تھی۔ بعد میں ایک ٹرسٹ رجسٹر کروا کر ضرورت مندوں کو قرض دینا بھی شروع کیا گیا۔

او پی پی نے توسیع اور تحقیق کا راستا اختیار کیا۔ پہلے مسائل اور اُن کے عام پسند حل کا پوری طرح تجزیہ کیا جاتا۔ پھر اُس کی بنیاد پر مشاورت کا بہتر پیکیج تیار کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا۔

چار اہم بنیادی مسائل تھے جو اورنگی کے لوگوں کی توجہ اور کوشش کا محور بنے ہوئے تھے:
(۱) رہائش اور سینی ٹیشن، (۲) صحت، (۳) تعلیم اور (۴) روزگار۔

کئی سال کی کوشش سے او پی پی نے ان مسائل کے حل میں مدد دینے کے لیے امدادی پروگرام تیار کیے۔ اورنگی کے لوگوں کا تعاون او پی پی کے ساتھ بالکل ویسا ہی ہمہ گیر ہے جیسا کہ کومیلا میں تھا۔ اورنگی کومیلا کی طرح ایک نمونے کا علاقہ بن گیا ہے۔ اگر اورنگی کا کسی دوسری کچی آبادی سے موازنہ کیا جائے تو یہ ثابت ہوگا کہ اورنگی کے غریب باشندوں کی اپنی کوشش ان چار مسائل کے حل میں اس لیے زیادہ مفید ہوئی کیوں کہ ان کو سماجی اور تکنیکی مشاورت حاصل تھی اور جہاں کہیں ضروری تھا قرض بھی میسر تھا۔

اورنگی کا تجربہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ ہمارے عام لوگ، اگر اُن کو تربیت دی جائے اور وہ منظم ہوں تو خود ہی سرمایہ اور انتظامی صلاحیت فراہم کر لیتے ہیں اور ہر قسم کی بیرونی امداد سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

میں نے کومیلا اور اورنگی میں کیا سیکھا، اس کو میں چند الفاظ میں اس طرح بیان کر سکتا ہوں:

۱۔ عام انسان، دیہاتی، گندے محلوں کے رہنے والے کاشتکار یا مزدور ایک تبدیلی کے دور میں زندہ تھے، ایسے دور میں جس میں ادارے ناکارہ ہو گئے تھے۔

۲۔ کومیلا اور اورنگی کے لوگ اس دور میں بے حرکت نہیں رہے بلکہ وہ بے حد محنت کرتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کو زندہ رہنے کا فن آتا تھا۔

۳۔ ان کی اپنے مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد بار آور ہوئی جب ان کو تکنیکی اور معاشی مشورے ملے اور مالی اعانت فراہم کی گئی۔

۴۔ لوگوں نے بڑی خوشی سے برابر کی شرکت کی دعوت قبول کی، چاہے وہ ٹی ٹی ڈی سی یا او پی پی یا حکومت یا کسی این جی او کی طرف سے ہو۔

۵- کومیلا میں آبپاشی کے نظام کی مرمّت کے لیے امداد کی ضرورت پڑی، اور چھوٹے کاشتکاروں کو منظم کرنے اور فی ایکڑ پیداوار بڑھانے کے لیے کوآپریٹوز قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

۶- اورنگی اور کراچی کے چھوٹے دیہاتوں، گوٹھوں، میں نہ تو کوئی بنیادی ڈھانچا تعمیر کرنا تھا اور نہ کوآپریٹو۔ بازار کے لیے سڑکیں اور ذرائعِ حمل و نقل موجود تھے۔ چھوٹے بیوپاری پیداوار اور روزگار میں آسان قرض کی مدد سے اضافہ کر سکتے تھے۔ انھیں کوآپریٹوز بنانے کی ضرورت نہ تھی جو بدقسمتی سے پہلے ہی وڈیروں کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔

(۱۹۹۴ء میں اسلام آباد میں منعقدہ سارک کے سیمینار میں پڑھا گیا۔)

فلاحی کام پر ایک نوٹ

پاکستان میں لوگوں کے مخیر جذبے کا اظہار دو طرح سے ہوتا ہے: کسی عالی شان خیراتی ادارے کے قیام سے یا بھیک کی تقسیم سے۔ عالیشان امدادی اداروں اور خیرات کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن ان کے محدود فوائد بالکل عیاں ہیں۔ مثال کے طور پر اونچے طبقوں کے اسکول اور شفاخانے ضرورت مندوں کے چھوٹے سے حصے کی کفالت کرتے ہیں؛ اسی طرح ان کی بھیک کی تقسیم سے فائدہ اٹھانے والے بھی گو مختلف ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ اکثریت، جو عام لوگوں پر مشتمل ہے، اس عمل سے باہر رہتی ہے۔

بڑے مقصد کا تناظر

فلاحی کام کے میدان میں قدم رکھنے والے نووارد کے لیے ان دو پہیوں والی شہرت کی گاڑی پر سوار ہو جانا بڑی آسان ترغیب ہے۔ لیکن یہ بات کہیں زیادہ سودمند ہو گی کہ غوروفکر کے بعد بڑے تناظر میں ان تمام ضرورتوں پر نظر ڈالی جائے جو رحم دلانہ امداد سے پوری ہو سکتی ہیں۔ اس امداد کے مقصد اور قسم پر بھی غوروفکر کی ضرورت ہے۔

کوئی تیار نقشہ نہیں ہے

اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ امداد کا کوئی تیار نقشہ فوری نفاذ کے لیے موجود نہیں ہے، گو بہت سے قابلِ تقلید نمونے دوسرے ممالک میں موجود ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو عام مروجہ طریقوں سے آگے جانا چاہتے ہیں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ مستقل مزاجی سے تخلیقی طریقہ اپنائیں، اور مقامی لوگوں سے مشورہ کر کے تجربے اور تجزیے کا راستا اختیار کریں۔

عمومی ہدایت: اداراتی تنظیم

مثال کے طور پر اورنگی میں کام کی شروعات کرنے سے پہلے ہم یہ معقول مفروضہ قائم کر سکتے ہیں کہ مقامی صورتِ حال کا سب سے زیادہ نظر انداز کردہ پہلو وہاں کے حالات کے پیش نظر اداروں کی تنظیم کی ضرورت ہے۔ یوں تو ہم سب معاشرتی انتشار کے دور سے گزر رہے ہیں لیکن اورنگی میں بِہاریوں اور پٹھانوں کے لیے یہ مسئلہ اس لیے اور زیادہ اہم ہے کہ دونوں ہی اپنے مانوس ماحول سے بچھڑ گئے ہیں۔ ان کو ایک نئی جگہ محلّہ داری، باہمی امداد اور مل جل کر کام کرنے کا جذبہ دوبارہ زندہ کرنا ہوگا۔ یہ کام کئی طرح کے معاشرتی اور معاشی اداروں کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔ ایسی تنظیموں کے بغیر نراج اور انتشار کا دور دورہ رہے گا لیکن اگر معاشرتی اور معاشی ادارے فروغ پائیں اور جڑ پکڑ لیں تو خدمت اور مادّی ترقی کے مواقع جیسے سینی ٹیشن، اسکولوں، دواخانوں، تربیت کے مراکز اور روزگار میں اضافہ ہوگا۔

رہنما اصول: بنیادی کارکن اور خود کفیل اکائی

معاشرتی اور معاشی اداروں کا قیام، ان کو مشورہ دینا اور ان کے کام کا تجزیہ کسی نئے ادارے یا ٹرسٹ کا اصلی کام ہوگا۔ اس کے لیے آہستہ آہستہ بنیادی ہمہ وقتی کارکن ملازم رکھنے ہوں گے۔

جو نئے ادارے وجود میں آئیں گے وہ اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے اور آخرکار خود کفیل ہو جائیں گے۔ شروع میں ان کے منتظمین کو تربیت دی جائے گی تاکہ وہ کام کو سمجھ سکیں اور آگے چل کر کام کا تجزیہ کر سکیں۔

پہلے سے قائم اداروں سے مل کر کام کرنا

خاص قسم کی تربیت اور تجزیے یا معاشی تنظیم یا مالی امداد کے سلسلے میں فلاحی ادارہ پہلے سے قائم اداروں مثلاً حکومت کے محکموں، یونیورسٹیوں اور بینکوں سے مل جل کر کام کرے گا۔

عجلت سے پرہیز: ایک نظامِ اوقات

ایک معاشی اور معاشرتی ادارے کا قیام جلدی میں نہیں ہو سکتا۔ تیز رفتار ترقی کی کوشش ایسے کام میں نقصان دہ ہوتی ہے۔ لوگوں کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے، ان کے مزاج سے آشنا ہونے اور ان کے اداروں کا تجزیہ کرنے میں کافی وقت اور توجہ درکار ہوتی ہے۔ اس کے لیے ایک نامکمل نظامِ اوقات یہ ہے: کئی ماہ (تین سے چھ ماہ) کی ابتدائی تحقیق، جس کے بعد ایک سال کا آزمائشی منصوبہ تیار کیا جائے گا جس کا ایک سال بعد اعدادوشمار کے ساتھ باقاعدہ تجزیہ ہو گا۔ یہ طریقہ بار بار اپنایا جائے گا، یہاں تک کہ ایک کامیاب قابلِ عمل نقشہ وجود میں آ جائے۔

اداروں کی خاص قسمیں

آزمائشی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادارے جن کو چنا جائے گا وہ لوکل کونسل، مختلف قسم کے کوآپریٹو یا انجمنیں، شفاخانے اور اسکول ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، زور اس بات پر دیا جائے گا کہ گروہی تحریک اور خود کفالت کو فروغ دیا جائے۔ مقصد کسی ایک اسکول یا ہسپتال کو ترقی دینا نہیں ہو گا بلکہ ان اداروں کو فعال کرنا جو اپنے اسٹاف کی تربیت کے ذریعے اپنے آپ کو بہتر کرنا چاہیں اور گروہی تنظیم میں معاونت کریں۔

دو بنیادی اصول

دو بنیادی اصولوں پر ایمان داری سے عمل ضروری ہے: (الف) ہر قسم کے سیاسی یا فرقہ وارانہ تعصب سے پرہیز، (ب) مفادِ عامہ کا خیال، یعنی اس بات کو ترجیح دینا کہ عام آدمی کی ضروریات اہم ہیں۔

آئندہ پھیلاؤ کا نمونہ

ہم کو امید رکھنی چاہیے کہ اگر فوراً نہیں تو چند سال میں معاشی اور معاشرتی اداروں کی تعمیر کا یہ طریقہ کچھ اچھے نتائج دے گا۔ پھر ہم کو یہ امید بھی کرنی چاہیے کہ مثلاً اورنگی میں قائم کیا گیا یہ نمونہ کراچی کے دوسرے علاقوں میں بغیر غیر معمولی کوشش کے رائج ہو جائے گا۔

اشتہار بازی اور دھوم دھام سے پرہیز

ابتدا میں ہر قسم کی تشہیر سے پرہیز کرنا چاہیے۔ وقت سے پہلے دھوم دھام اور اشتہار بازی سے وہی نقصان ہو سکتا ہے جو عجلت میں کی گئی بہت بڑی منصوبہ بندی سے۔ جیسے جیسے منصوبہ ترقی کرے گا، آزاد تجزیہ نگار خود پبلک کو دستاویزی شواہد اور رپورٹوں کی مدد سے ترقی کی رفتار سے آگاہ کریں گے۔

(۲۵ فروری ۱۹۸۰ء)

اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کا جائزہ

اورنگی پائلٹ پروجیکٹ بی سی سی آئی کے آغا حسن عابدی کی سرپرستی میں شروع ہوا۔ اس کی ابتدا پہلی اپریل ۱۹۸۰ء سے ہوئی۔ یہ باقاعدگی سے ہر تیسرے مہینے اپنی کارکردگی کی رپورٹ شائع کرتا ہے جس میں کام اور اخراجات کے گوشوارے دیے جاتے ہیں۔ حالیہ اور شروع سے اب تک کے اخراجات کے اعدادوشمار اس رپورٹ کا حصہ ہوتے ہیں، جس کی بدولت ہر سہ ماہی رپورٹ میں پورے منصوبے کا جائزہ شامل ہوتا ہے۔ ۱۹۸۰ء سے او پی پی نے حسبِ ذیل پروگرام شروع کیے ہیں:

۱۔ کم لاگت سینی ٹیشن	۱۹۸۱ء
۲۔ خواتین بیوپاری	۱۹۸۴ء
۳۔ صحت اور خاندانی منصوبہ بندی	۱۹۸۵ء
۴۔ کم لاگت مکانوں کی تعمیر	۱۹۸۶ء
۵۔ گھریلو کاروبار	۱۹۸۷ء
۶۔ معاشرتی جنگل بانی	۱۹۹۰ء
۷۔ دیہی ترقی کا آزمائشی منصوبہ	۱۹۹۲ء

ہماری مسلسل کوشش ہے کہ یہ تمام پروگرام خودمختار اور خودکفیل ہوجائیں اور ان میں سے ہر ایک کا اپنا انتظامی بورڈ، بجٹ اور آڈٹ رپورٹ ہو۔ حسبِ ذیل انتظامی بورڈ اس وقت فعال ہیں:

۱۔ او پی پی کونسل: اس کو بی سی سی آئی فاؤنڈیشن، انفاق فاؤنڈیشن اور دوسرے مخیر اداروں سے امداد ملتی ہے۔ یہ امداد او پی پی کے مختلف پروگراموں میں تقسیم کی جاتی ہے۔

۱۹۸۰ء

۲- او پی پی ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (آر ٹی آئی) ۱۹۸۹ء۔
۳- صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کا ادارہ، ۱۹۹۰ء۔
۴- او سی ٹی (اورنگی چیریٹیبل ٹرسٹ) ۱۹۸۸ء۔
۵- دیہی ترقی کا آزمائشی منصوبہ ۱۹۹۲ء۔

۱۹۸۵ء سے او پی پی کی طرف دوسرے مخیر اداروں کی بھی توجہ ہو گئی ہے۔ بی سی سی آئی، انفاق فاؤنڈیشن اور دوسرے مخیر اداروں سے جو امداد سال بہ سال ملی اور کہاں خرچ ہوئی، اس کی تفصیل آڈٹ رپورٹ سے نقل کی جاتی ہے:

سال	انفاق	دوسرے	میزان	خرچ
1980-81	4,94,220	45,000	5,39,220	1,87,766
1981-82	9,00,000	25,921	9,25,921	4,52,496
1982-83	18,00,000	11,998	18,11,998	13,20,037
1983-84	20,00,000	3,319	30,3,319	19,77,586
1948-85	22,04,00	4,56,079	26,60,079	18,56,676
1985-86	20,00,000	90,21,394	29,21,394	20,85,179
1986-87	19,98,000	13,19,866	33,17,866	21,85,914
1987-88	20,00,000	18,66,239	38,66,239	37,84915
1988-89	20,00,000	13,75,237	33,75,637	34,85,389
1989-90	21,20,000	19,84,309	41,04,309	39,826,82
1990-91	34,09,812	48,40,426	82,50,238	5938,697
1991-92	46,69,000	47,55,864	94,24,864	74,10,261
1992-93	52,88,335	59,67,135	1,12,55,470	1,62,24,548
1993-94	81,14,500	41,76,972	1,22,91,272	1,16,37,239
	3,89,97,867	2,77,50,359	6,6748,226	6,26,99,385

تفصیلی تحقیق اور توسیع کا طریقہ اپنا کر او پی پی چند قابلِ عمل نمونے وضع کرنے میں کامیاب ہوا ہے جو کچی آبادیوں کے چار بنیادی مسائل کا حل پیش کرتے ہیں: سینی ٹیشن، صحت، تعلیم اور روزگار۔ ان پروگراموں کا عملی شکل میں کیسے استعمال ہو رہا ہے، مخیر ادارے (یونیسیف اور عالمی بینک)، سرکاری محکمے، بلدیاتی ادارے اور روزافزوں تعداد میں این جی اوز اس کا اورنگی میں غور سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان نمونوں کو ملک میں دوسری بستیوں میں نقشِ ثانی کے طور پر زیادہ سے زیادہ آزمایا جا رہا ہے۔

کم لاگت سینی ٹیشن، او پی پی کا سب سے قدیم پروگرام ہے۔ اس نے اورنگی کی کایا پلٹ دی۔ کم آمدنی والے مکانوں کے مالکوں نے اپنی رقم سے، اپنے انتظام کے تحت فروری ۱۹۹۵ء تک ۵۲۵۶ زیرِزمین سینی ٹیشن لائنیں ڈالی ہیں جن کی لمبائی ۱۳۴۴۸۵۹۰ فٹ ہے اور گھروں میں ۸۰۵۰۲ فلش لیٹرین تعمیر کیے ہیں۔ انھوں نے مشترکہ طور پر ۶ کروڑ ۲۷ لاکھ ۳۰ ہزار روپے اپنی جیب سے خرچ کیے ہیں۔ او پی پی نے پہلے تحقیق کر کے ثابت کیا کہ اس طریقے کا خرچ ٹھیکے کے کام کے مقابلے میں ۱/۵ ہوتا ہے۔ اس نے محلّے کے باشندوں کو تکنیکی رہنمائی بھی فراہم کی۔ یونیسیف اور عالمی بینک نے ان پروگراموں کے نمونوں کے سکھر اور حیدرآباد میں نفاذ کے لیے او پی پی آر ٹی آئی کو (تنخواہ دار) مشیر مقرر کیا ہے۔ آر ٹی آئی سندھ کچی آبادی اتھارٹی اور کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کے مشیر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے رہا ہے۔ کئی کچی آبادیوں میں اورنگی کے نمونے پر کام تیزی سے جاری ہے۔ امداد دینے والے اداروں، بلدیاتی اداروں اور این جی اوز سے کارکن تربیت پانے کے لیے بڑی تعداد میں آر ٹی آئی آتے ہیں۔

صحت کا پروگرام جو اورنگی میں شروع ہوا اس کی بنیاد جدید سینی ٹیشن کو رائج کرنے سے پڑی۔ اس پروگرام میں لوگوں کو عام بیماریوں سے بچاؤ کی تربیت، بچوں کو متعدی بیماری سے محفوظ رکھنے کی تعلیم اور خاندانی منصوبہ بندی کی ترغیب شامل تھی۔ پچھلے دس سال میں ہماری خواتین کارکنوں نے ہزاروں تعلیمی اور تربیتی جلسے کیے جس میں محلّے کی ان پڑھ اور نیم خواندہ عورتوں کو صحت کے پروگرام سے متعارف کرایا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ان عورتوں کو

حفظانِ صحت کے اصولوں سے پوری طرح آگاہی ہو گئی ہے۔ تجزیوں سے پتا چلا ہے کہ اورنگی میں بیماریوں میں کمی آئی ہے اور خاندانی منصوبہ بندی کو بڑے پیمانے پر اپنایا جارہا ہے۔ ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ اورنگی میں حال ہی میں ۵۴۶ چھوٹے نجی شفاخانے اور ۵۴۶ زچہ خانے وجود میں آئے ہیں؛ اس سے پتا چلتا ہے کہ اورنگی کی خواتینِ خانہ متعدی امراض سے بچاؤ اور مانعِ حمل اشیا کی خریداری پر روپے خرچ کرنے پر آمادہ ہیں۔

اسی طرح اورنگی کے لوگ اسکول کی فیس ادا کر کے بچوں کو تعلیم دلوانا چاہتے ہیں۔ ۱۹۹۱ء کے ایک جائزے سے معلوم ہوا کہ اورنگی میں ۵۰۹ باقاعدہ تسلیم شدہ نجی اسکول ہیں جو فیسوں سے چل رہے ہیں۔ او پی پی نے ان اسکولوں کو ترقی دینے کی مندرجہ ذیل کوششیں کی ہیں:

۱۔ اسکولوں کی عمارتیں بہتر بنانے کے لیے قرض کی فراہمی: فروری ۱۹۹۵ء تک ۹۴ اسکولوں کو ۲۷ لاکھ ۹۰ ہزار روپے قرض دیے گئے، جس میں سے ۱۷ لاکھ روپے واپس آ گئے اور ۳ لاکھ ۸۰ ہزار ۳۳۹ روپے مارک اپ کی شکل میں آئے۔

۲۔ اسکولوں کی تنظیموں کو ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی مدد سے اپنے اساتذہ کی اہلیت میں اضافہ کریں۔ او پی پی اساتذہ کو بھی قرض دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹی وی او (TVO) کی امداد سے تیس اسکولوں میں کمپیوٹر کی تعلیم شروع کی گئی ہے اور برٹش کونسل کی مدد سے اساتذہ کی انگریزی تعلیم کی صلاحیت بڑھائی گئی ہے۔

۳۔ حال ہی میں ایک نئی تجویز انفاق فاؤنڈیشن کو بھیجی گئی ہے تاکہ دس اسکولوں میں لیبارٹری اور لائبریری قائم کی جائے۔

کچی آبادیوں کی سب سے فوری ضرورت بلاشبہ روزگار کی فراہمی ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری کے دوہرے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے دوسری جگہوں کی طرح اورنگی کے مزدور پیشہ افراد گھریلو کاروبار شروع کر رہے ہیں۔ وہ اپنے گھروں کو کارخانوں میں بدل رہے ہیں اور خواتین کو دست نگر کی بجائے کاروبار میں شراکت دار بنا رہے ہیں۔ اوپری خرچ کی کمی اور کم لاگت مزدوری کی وجہ سے ان گھریلو کارخانوں میں مقابلے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے، اسی لیے ان کے سامان اور ہنر کی مانگ ہے۔ ان گھریلو کارخانوں میں ترقی کی اور گنجائش ہے اگر ان کو بینک

کی شرح پر آسانی سے قرض مل سکے۔ لیکن سرکاری بینکوں سے مشکل طریقِ کار اور رہن کی شرط کی بنا پر ان لوگوں کو قرض نہیں ملتا۔ ان لوگوں کی قرض کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ستمبر ۱۹۸۷ء میں اورنگی چیریٹیبل ٹرسٹ (او سی ٹی) رجسٹر ہوا۔ او سی ٹی نے سرکاری بینکوں سے قواعد کے مطابق، بغیر کسی رعایت کے، مارک اپ پر قرض لیا اور گھریلو کارخانوں کو سرخ فیتے اور رہن کی شرط کے بغیر مارک اپ پر قرض دیا۔ او سی ٹی یہ اس وجہ سے کر سکا کیوں کہ نہ تو وہ بینکوں کی طرح کھاتے داروں کا امانت دار تھا اور نہ اپنے حصص کے مالکان کو جواب دہ، اور نہ نفع کمانے والا۔ علاوہ ازیں اسے سرمایہ مخیر اداروں سے بطور عطیہ ملنے لگا۔

او سی ٹی کو پوری طرح احساس تھا کہ بغیر رہن قرض دینے میں خطرے ہیں۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ نادہندگی، دھونس اور دھمکی ہمارے ملک کا عام دستور ہے۔ اس کے باوجود او سی ٹی کا ایمان تھا کہ اگر وہ ایمان داری اور انصاف سے گاہکوں سے پیش آیا تو قرضہ لینے والے بھی وقت کے ساتھ ساتھ انصاف سے پیش آئیں گے۔ اور یہ کہ تجربے سے او سی ٹی کے کارکن روپے وصول کرنے اور گاہکوں کا احتیاط کے ساتھ انتخاب کرنے کا فن سیکھ جائیں گے اور اس طرح ایمان دار گاہکوں کا ایک بڑا حلقہ وجود میں آ جائے گا۔ سات سال کے تجربے نے اس یقین کو صحیح ثابت کیا۔ پہلے دو سال بے حد تکلیف دہ تھے۔ کافی رقم ڈوب گئی، دھونس اور دھمکی کی شدت رہی، جس میں توہینِ مذہب کے مقدمے بھی شامل تھے۔ رفتہ رفتہ او سی ٹی نے چناؤ کے طریقے کو بہتر کیا اور کارکنوں پر کڑی نظر رکھی اور ان کو ایمان داری کی تلقین کی۔ تیسرے سال کے بعد بہاؤ کا رُخ بدل گیا۔ قرضوں کی مالیت اور اُن کی ادائیگی بڑھی۔ ۱۹۸۷ء کے ستمبر سے ۱۹۹۵ء کے فروری تک ۳۱۵۹ قرضے دیے گئے جن کی مالیت ۴ کروڑ ۸۵ لاکھ روپے ہے۔ اس میں سے ۳ کروڑ ۱۳ لاکھ ۵۰ ہزار روپے ادا ہوئے۔ مارک اپ کی مد میں ۳۷ لاکھ ۳۰ ہزار روپے وصول ہوئے۔ ڈوبے ہوئے قرضے (جو ہر چھ ماہ بعد حساب سے خارج کیے جاتے ہیں) ۱۹ لاکھ ۹۰ ہزار روپے کی مالیت کے ہیں (یعنی کل قرضوں کا ۴.۱ فیصد) جو ۲۷۳ نادہندوں (یعنی کل قرضداروں کے ۸.۶۷ فیصد) کے نام تھے۔ ۶۳ قسم کے کاروباریوں کو قرضے دیے گئے۔ ان میں زیادہ تر ترقی کر رہے ہیں، ان کے کارکنوں میں اضافہ ہوا ہے اور پیداوار بڑھی ہے۔ اب وہ معاشی مثال بن گئے

ہیں اور اورنگی میں آنے والے ان کارخانوں کی گھماگھمی دیکھتے ہیں۔

۱۹۹۰ء میں انفاق فاؤنڈیشن کے سیکریٹری جنرل، مسٹر امتیازی، نے او سی ٹی کے قرض پروگرام کو اورنگی سے باہر، دوسرے شہری اور دیہی علاقوں میں لے جانے کی ترغیب دی۔ حسبِ ذیل نقشے میں اس قرض کی تفصیل دکھائی گئی ہے جو انفاق کے خرچے پر فروری ۱۹۹۵ء تک اورنگی سے باہر دیا گیا:

	قرض	کاروبار	واپسی
گھریلو کارخانے	85,79,900	410	34,89,466
دیہاتی قرض	71,84,000	416	41,51,677
نوجوانوں کو قرض	16,48,600	109	4,50,555
	1,47,12,500	935	81,00,698

گھریلو قرض کے اس پروگرام میں ۱۱ لاکھ روپے سے بڑھ کر ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ تک کی غیر معمولی ترقی اس وجہ سے ممکن ہوئی کہ انفاق فاؤنڈیشن نے اس کام کے لیے ایک بہت بڑا ریوالونگ فنڈ فراہم کیا۔ ورلڈ بینک نے بھی اس پروگرام کو اپنے چھوٹے کاروبار کے منصوبے کے لیے چن لیا اور اب تک او سی ٹی کو چھبیس لاکھ روپے کی امداد فراہم کی ہے۔ او سی ٹی کے دفتری اخراجات قرضوں کی مالیت کا صرف ۶ فیصد ہیں۔ آڈٹ شدہ رپورٹ سے یہ پتا چلتا ہے کہ اب او سی ٹی کے پاس سرمائے کی مد میں اپنے اثاثے ہیں۔

ایک حیرت انگیز تبدیلی یہ آئی ہے کہ دوسری این جی اوز، او پی پی کے ساتھ منسلک ہونا چاہتی ہیں۔ ۹۴-۱۹۹۳ء میں مندرجہ ذیل این جی اوز کو او پی پی سے منسلک کیا گیا:

	این جی او	قرض	کاروبار	ادائیگی	مارک اپ
کراچی کے گوٹھ	5	67.54,040	269	35,53,874	7,48,382
سندھ	8	19,30,500	159	5,72,521	1,26,517
پنجاب	4	14,54,500	141	5,28,342	1,22,188
کل	17	1,01,39,040	569	46,54,737	9,97,587

یہ این جی اوز گاہکوں کے انتخاب اور اُن سے قرضے کی وصولیابی میں غیر معمولی ایمان داری کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ ابھی تک صرف تین قرضے ڈوبے ہیں، جن کی مجموعی رقم ۳۳ ہزار روپے (کل قرضوں کی مالیت کا ۰.۳۳ فیصد اور قرضداروں کی کل تعداد کا ۰.۳۵ فیصد) بنتی ہے۔ او سی ٹی کا اس سلسلے میں سوائے کمپیوٹر کے پرنٹ یا ڈاک خرچ کے کوئی اوپری خرچ نہیں ہے۔ اس طرح کام کو وسعت دینا بے حد سستا پڑتا ہے۔

(فروری ۱۹۹۰ء)

اورنگی میں تشدّد کا سدباب

اورنگی کراچی کی سب سے بڑی کچی آبادی ہے۔ یہاں تقریباً دس لاکھ نفوس آباد ہیں جن میں مہاجر، پٹھان، بہاری، پنجابی، بلوچ، اور سندھی شامل ہیں۔ یہ لوگ کراچی کی کل آبادی کا دس فیصدی ہیں۔ ایک تجزیے سے، جو ۱۹۸۹ء میں کیا گیا، پتا چلا کہ یہاں ۱۱۰ محلّے یا سیکٹر، ۶۳۴۷ گلیاں اور ۹۴۱۲۲ مکانات ہیں۔ اورنگی والے فخر سے اس ذیلی شہر کو چھوٹا پاکستان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

تقدیر کے چکر نے مجھے ۱۹۸۰ء میں اورنگی پہنچا دیا۔ ۱۹۵۰ء سے میں، پہلے وکٹوریہ کالج کے پرنسپل کی اور بعد میں دیہی ترقی کی اکادمی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے، خوشی خوشی کومیلا میں مقیم تھا۔ ایوب خاں اور بارورڈ کے مشیروں کی سرپرستی میں کومیلا کے دیہی کام کے نمونے ــــ کسانوں کی کوآپریٹو اور تھانے کے مراکز ــــ مشرقی پاکستان اور دنیا میں دوسری جگہ، نقشِ ثانی کے طور پر مقبول تھے۔ مجھے امید تھی کہ میں باقی زندگی دیہی ترقی کے کام کو زیادہ بہتر بنانے اور پھیلانے میں صَرف کروں گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے دوبارہ مہاجر بننا پڑے گا۔ ابوالعلا معری کو اس بات کا علم تھا جس نے ہزار سال پہلے کہا:

تم فلک کے نیچے ساکت کھڑے ہو جاؤ
جس کے پہیے قوت سے حرکت کرتے ہیں
اور آزادی سے انتخاب کرتے ہیں
جب کہ تقدیر مسکرا کر دیکھتی رہتی ہے۔

تقدیر ایوب خاں، بارورڈ کے مشیروں اور مشرقی پاکستان کو بہا کر لے گئی اور مجھے، بلاشبہ میرے گناہوں کی پاداش میں، دوبارہ اجڑنے والا مہاجر، پناہ گیر بنا کر یہاں لے آئی۔

ابتدا میں میں نے اس فریب کو دل میں جگہ دی کہ میں کومیلا اکادمی کے دیہی ترقی کے پروگرام کو پشاور اکادمی میں جاری رکھ سکوں گا، جہاں میرے دوست شعیب سلطان ڈائریکٹر تھے۔ لیکن تین سال کے اندر ہم دونوں کو اکادمی سے الگ کر دیا گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ کومیلا کے پروگرام، دیہی ترقی کے کام، تھانا مراکز اور کسانوں کے کوآپریٹو جیسے تصورات کو نئے پاکستان میں فرسودہ مال خیال کیا جاتا ہے۔ میں اب ساٹھ سال کا ہو گیا تھا، لہذا اس بات کا حق دار تھا کہ گھورے پر پھینک دیا جاؤں، جہاں سے اٹھا کر میری تیسری مادرِ علمی، مشیگن اسٹیٹ یونیورسٹی، نے مجھے دوبارہ دیہی ترقی کے معلم کی حیثیت سے کارآمد بنایا۔ غیر ملک میں پانچ سال پُرسکون زندگی گزارنے کے بعد اور بیرونی ملکوں کے طلبہ کو پڑھا کر میں مہاجروں کی پناہ گاہ کراچی واپس آ گیا جو تمام اطراف سے آنے والے پناہ گزینوں کی ماں ہے۔

یہاں میں اپنے ساتھ اپنے صوفی مرشدوں، عارفوں اور روشن ضمیر استادوں، دانشمندوں، فلسفیوں، پسندیدہ شاعروں اور ناول نویسوں کی کتابیں لایا۔ میں ان کی پُرسکون صحبت میں اپنے آخری ایام آرام سے غوروفکر میں گزارنے کی امید رکھتا تھا تاکہ ان کے مشورے سے اس پریشان کن دنیا سے رخصت کی تیاری کر سکوں۔ لیکن ۱۹۸۰ میں بی سی سی آئی کے آغا حسن عابدی اور ابنِ حسن برنی نے مجھے اس بات پر راضی کر لیا کہ میں اپنا آدھا وقت موت کی تیاری کو اور آدھا وقت او پی پی کو دوں۔

ابتدا ہی سے میں نے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا۔ کراچی کا بڑا شہر کومیلا سے بالکل مختلف تھا۔ لہذا میں نے پہلے اپنے آپ کو تعلیم دی۔ کئی مہینے میں اپنی ٹوٹی پھوٹی جیپ میں اورنگی میں گھوم پھر کر یہاں کی گلیوں کو دیکھتا رہا۔ یہاں کے باسیوں، افسروں، کونسلروں، دلالوں، انجمنوں اور تنظیموں کے سرکردہ لوگوں سے بات چیت کی۔ خوش قسمتی سے میں خودمختار تھا؛ کسی حاکم نے مجھے منصوبہ اور ہدف دے کر نہیں بھیجا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے اندازہ ہوا کہ اورنگی میں کس قسم کے لوگ رہ رہے ہیں؛ ان کے مسائل کیا ہیں؛ وہ ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور ان کو حل کرنے کے لیے کیا کر رہے ہیں۔

اورنگی کے عام باشندے، مزدور پیشہ لوگ، مذہبی اور سیاسی نظریوں کی زیادہ پروا نہیں کرتے

اور نہ ہی اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی۔ ان کو نہ حکومت کے للچا دینے والے وعدوں سے دل چسپی ہے نہ حزبِ مخالف کی بھیانک پیش گوئیوں سے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اورنگی کے لوگوں کی ابتدائی دل چسپی اور ان کی حرکت کا محور چار بنیادی مسائل ہیں، جن پر ان کی بقا اور مستقبل کی ترقی کا انحصار ہے۔ یہ چار بنیادی مسائل یہ تھے: رہائش اور سینی ٹیشن، صحت، تعلیم اور روزگار۔

میں نے دیکھا کہ سرکاری اداروں کی کارکردگی ان مسائل کے حل کے سلسلے میں بے حد ناکافی تھی۔ جب میری بوڑھی آنکھوں نے، جو ۱۹۷ء میں کھلی تھیں، سرکاری اداروں کی چوری اور کام چوری کو دیکھا تو میں نے خیال کیا گویا میں بیرونی سامراج کی چھوڑی ہوئی اداراتی میراث کی موت کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ سرکاری اداروں کے مقابلے میں اورنگی کے مہاجروں کی کوشش جو وہ اپنے گھروں، اسکولوں، شفاخانوں اور گھریلو کارخانوں کی تعمیر میں صَرف کر رہے تھے، بڑی جاندار تھی۔ مجھے ایسا لگا گویا میں ایک نئی حیات کے نمو کو دیکھ رہا ہوں اور امید بندھی کہ او پی پی اس حیاتِ نو کی دائی بن جائے گی۔

غریب باشندوں کو زندہ رہنے کا فن آتا ہے، لیکن اُن کو معاشرتی اور تکنیکی رہنمائی درکار تھی تاکہ ان کی اپنی تحریک زیادہ کارآمد ہو سکے۔

مثال کے طور پر جب او پی پی کے سماجی کارکنوں اور کاریگروں نے گلیوں اور گھروں میں جدید سینی ٹیشن کا خود کفیل نظام ــــ زیرِزمین سینی ٹیشن اور فلش لیٹرین ــــ اپنے زیرِانتظام قائم کرنے کے لیے معاشرتی اور تکنیکی نقشے اور تخمینے فراہم کیے تو اورنگی کی سیکڑوں گلیوں اور ہزاروں گھروں میں یہ نظام وجود میں آ گیا۔ اس کی وجہ سے مکانوں اور گلیوں میں گندے پانی اور فضلے سے نجات مل گئی اور گندگی سے صحت کو جو نقصان پہنچ رہا تھا، لوگ اس سے بچ گئے۔ جب گاڑیوں میں بیٹھ کر صحت کی کارکن لڑکیاں ان صاف ستھری گلیوں اور گھروں میں گئیں اور گھریلو خواتین کو جمع کر کے ان کو عام بیماریوں سے بچاؤ کی تدابیر، بچوں کو متعدی امراض کے ٹیکے لگانے اور خاندانی منصوبہ بندی کی تعلیم دی تو وہ بڑے ذوق و شوق سے ان گھریلو جلسوں میں شریک ہوئیں اور کارکنوں کے مشوروں کو قبول کیا۔ اس طرح بہت سے اسکول اس بات پر راضی ہوئے کہ اپنی عمارتی اور تربیتی صلاحیت میں اضافہ کریں۔ اور جب آسانی سے قرض ملنے لگا تو وہ خاندانی گھریلو

کاروبار جو افراطِ زر اور بے روزگاری کے دوہرے چیلنج کے جواب میں وجود میں آئے تھے، تیزی سے پھیلنے لگے۔ کارکنوں کی تعداد اور مال کی پیداوار میں اضافہ ہوا اور آخر کار یہ ایک ایسا مثالی نمونہ بن گیا جس میں خواتین دست نگر نہیں بلکہ ہم پلّہ بن کر شریک ہو گئیں۔

۱۹۸۶ء تک اورنگی کے باشندے سیکڑوں گلیوں کو بہتر کرنے میں مصروف تھے۔ وہ ان گلیوں میں سینی ٹیشن، صحت، تعلیم اور روزگار کو ترقی دے رہے تھے اور او پی پی دائی بن کر ان کی خدمت کر رہی تھی کہ تشدّد کے طوفان نے کراچی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بشریٰ زیدی کی ہلاکت اور سہراب گوٹھ کے جبری انہدام کے بعد یہ طوفان اورنگی میں خوف اور نفرت کی چنگاری لے کر آیا اور مہاجر اور پٹھان پڑوسی آپس میں دست و گریباں ہو گئے۔ نفرت پھیلانے والے ہیرو بن گئے، وہ ہر جگہ جہاد اور آخری آدمی تک جنگ کا پرچار کرنے لگے۔ چند ہی دن میں بہت سے پڑوسی قتل ہوئے، بہت سے گھر، دکانیں اور لاریاں جلائی گئیں اور مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ ہمارا سارا کام جل کر خاک ہو جائے گا اور اورنگی بیروت کا نقشِ ثانی ثابت ہو گا۔

او پی پی نے امن بحال کرنے کی کوشش شروع کی۔ پہلا قدم یہ تھا کہ جلے ہوئے مکانوں اور دکانوں کو دوبارہ تعمیر کیا جائے اور مقتول اور لٹے ہوئے لوگوں کا تاوان ادا کیا جائے تاکہ لوگوں کی توجہ انتقام سے ہٹ کر بحالی کی طرف مرکوز ہو۔ میرے پرانے دوست منظور الحسن، اسپیشل ریلیف کمشنر کراچی، نے اس وسیع، دشوار اور متنازعہ کام کو نہایت تیزی سے اور جامع انداز میں نہ صرف اورنگی بلکہ پورے کراچی میں مکمل کیا۔ انھوں نے عملاً ثابت کیا کہ ہمارے انتظامی محکمے، اگر ان کا سربراہ مستقل مزاج ہو، سلطنت کے زمانے کی مستعدی دکھا سکتے ہیں۔ جیسے جیسے تعمیر کا کام اورنگی میں بڑھتا گیا، ہم نے دیکھا کہ انتقام کی خواہش اور غصّہ ٹھنڈا ہوتا گیا اور نفرت اور خوف کم ہوا۔ تین ماہ کے اندر اندر لڑنے والے پھر سے اچھے پڑوسی بن گئے۔

ریلیف کمشنر نے انتقام کے جذبے کو سرد کیا، جبکہ گلیوں کے منتظموں، صحت کی کارکنوں، اسکول اور گھریلو کارخانوں نے خوف کے ذہنی انتشار اور نفرت کو کم کیا۔ او پی پی کا ان تمام اداروں سے قریبی تعلق رہا۔ ہر گلی کوچے میں ہم نے حافظ شیرازی کے ایک شعر کو نعرے کے طور پر استعمال کیا۔ حافظ نے پانچ سو سال پہلے امیر تیمور کے ظلم اور جبر کے مظاہر اپنی

آنکھوں سے دیکھے تھے۔ ان کے اس شعر میں امن کے فوائد بڑی خوب صورتی سے بیان کیے گئے ہیں:

درختِ دوستی بنشاں کہ کامِ دل بہ بار آرد
نہالِ دشمنی برکن کہ رنجِ بےشمار آرد

(دوستی کا درخت اگاؤ، اچھے پھل دے گا۔
دشمنی کے پودے کو اکھاڑ دو، یہ تم کو بےشمار رنج پہنچائے گا۔)

ہم کو بہت جلد اندازہ ہوا کہ حافظ کی اچھی نصیحت، یعنی پُرامن طریقے سے رہنا، اورنگی کے باشندوں ــــ گلیوں کے منتظموں، اسکول کے نگرانوں، صحت کی تنظیموں اور گھریلو کارخانوں ــــ کو قبول تھی۔ نفرت پھیلانے والوں کے دائمی نفرت، تفریق اور جنگ کے نعروں کے مقابلے میں تمام گلیوں کے منتظم ــــ پٹھان، بہاری اور بلوچ ــــ اس بات پر متفق ہو گئے کہ تشدد ہر ایک کے لیے نقصان دہ اور انتشار کا باعث ہے۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی اپنی گلی میں تشدد کو روکیں گے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر رابعہ کا معاملہ لیں۔ ان کا اسکول "ملت کیئر" علی گڑھ کالونی میں تھا جو سب سے بڑی قتل گاہ تھی۔ ان کے سات سو طلبہ میں سے دو سو پٹھان تھے۔ گو نفرت پھیلانے والے باربار اعلان کر رہے تھے کہ کوئی پٹھان علی گڑھ کالونی میں کبھی داخل نہیں ہو گا، ڈاکٹر رابعہ اپنے پٹھان شاگردوں کو واپس لے آئیں۔ یہ ایک خوب صورت منظر تھا کہ یہ تنومند، گورے چٹے، ولایتی شکل و صورت والے بچے اپنے کالے ساتھیوں کے ساتھ محبت سے بیٹھتے تھے۔ ڈاکٹر رابعہ نے کہا کہ اسکول میں ہم کیسے تفریق کر سکتے ہیں۔ زاہدہ بیگم نے اپنے گھریلو کارخانے میں، جو سیکٹر پانچ میں واقع ہے اور جہاں پچاس پٹھان کارکن خواتین سلائی کے لیے آتی تھیں، یہ جان لیا کہ ان کے کارخانے کو پٹھان خواتین سے قطعِ تعلق نہیں کرنا چاہیے۔ پٹھان لاری والوں، ہوٹل کے مالکوں، چپل بنانے والوں، پھیری والوں اور مزدوروں کو معلوم تھا کہ مہاجر ان کے قیمتی گاہک ہیں، اس لیے ان کی خاطرداری کرنا چاہیے نہ کہ ان کو مارنا پیٹنا۔ مختصراً اورنگی کے باشندوں کو، جو پس ماندہ قبائلی علاقوں میں نہیں بلکہ ایک صنعتی اور شہری ماحول میں رہ رہے ہیں، اپنے قدرتی طور پر ساتھ ساتھ رہنے اور مل جل کر کام کرنے کا احساس ہے۔ نفرت پھیلانے والے

اپنے مفاد کی خاطر کچھ دیر کے لیے خوف، نفرت اور تشدّد کی فضا پیدا کر سکتے ہیں لیکن ساتھ رہنے کی اس بنیادی خواہش اور رشتے کو تشدّد اور فساد کی نذر نہیں کر سکتے۔

لہذا اورنگی کے روشن خیال باسیوں نے امن و امان دوبارہ بحال کر دیا اور دوبارہ اپنی توجہ مکانوں کی بہتری، سینی ٹیشن، صحت، تعلیم، اور روزگار پر مرکوز کر لی۔ پھر ۱۹۹۰ء میں ایک دہشت گرد گروہ نے بلوچ کالونی میں ۶۸ گھر جلا دیے۔ یہ واقعہ حیدر آباد کے کسی سانحے کے ردِ عمل کے طور پر ہوا جو کراچی سے ایک سو میل دور واقع ہے۔ اس دفعہ پہلے جیسے نفرت کے مظاہر دیکھنے میں نہیں آئے لیکن اورنگی کے ۱۴۰۰ بلوچ بھاگ کر حب دریا کے بلوچوں کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ یہ لوگ اپنے قبائل کو اورنگی پر حملے کی ترغیب دے رہے تھے۔ ۱۹۷۶ء کی طرح او پی پی نے پھر حکومت کو آمادہ کر لیا کہ وہ اپنا فرض نبھائے اور بلوچوں کے مکانوں کی تعمیر کرے اور ان کو دوبارہ بسائے، اور بہاری پڑوسیوں کو راضی کیا کہ وہ مجروح بلوچوں کو یقین دلائیں کہ اُن کی جان، مال اور آبرو پر آنچ نہیں آئے گی۔ کمشنر اور ڈی سی نے فوری عمل کیا اور سات لاکھ روپے او پی پی کو گھروں کی تعمیر کے لیے دیے۔ اس کام کو او پی پی نے دو ماہ میں مکمل کیا۔ بہاری پڑوسی جا کر ۱۴۰۰ بلوچوں کو واپس لائے تاکہ وہ اپنے پرانے گھروں کو دوبارہ آباد کریں۔ اس طرح اورنگی انتقامی حملوں سے محفوظ رہا جو تباہ کن ثابت ہوتے کیوں کہ بلوچوں کے پاس راکٹ لانچر، گرینیڈ اور مشین گنیں بھی تھیں۔

ابھی حال ہی میں دوسرے قسم کا تشدّد ظاہر ہوا ہے؛ یہ کسی سیاسی یا فرقہ وارانہ نفرت پر مبنی نہیں ہے۔ یہ لوگوں کو گروہی خون اور نفرت میں اُلجھانے کی کوشش ہے۔ اسلحہ بردار بے روزگار گروہوں کی شکل میں بازاروں اور محلّوں پر قبضہ جمانے کی خاطر جنگ میں مصروف ہیں، تاکہ ان جگہوں سے ناجائز طور پر بھتا وصول کر سکیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ٹھگوں اور پنڈاریوں کا وہی دور واپس آ گیا ہے جو مغل دور کے آخری برسوں میں ہمارے بزرگوں کو دہشت زدہ رکھتا تھا اور جس کو آخر میں فرنگی حکمرانوں نے بزورِ شمشیر ختم کیا تھا۔ ہم کو دیکھنا ہے کہ ان نئے پنڈاریوں سے کراچی کی حکومت اور اورنگی کے باشندے کس طرح نمٹتے ہیں۔

کم لاگت سینی ٹیشن

گندے پانی کی نکاسی اور سینی ٹیشن کا مسئلہ

گندے پانی کی نکاسی اور سینی ٹیشن کا مسئلہ کچی آبادیوں میں دوہری مشکل پیش کرتا ہے۔ ایک طرف فلش لیٹرین اور زیرِزمین نکاسیِ آب کی پائپوں کے نہ ہونے کے باعث صحت اور مکانوں دونوں کو نقصان پہنچتا ہے اور دوسری طرف کچی آبادی کے باشندے بازار اور سرکاری نرخ پر سینی ٹیشن نظام کا خرچ برداشت نہیں کرسکتے۔

یہ دوہری مشکل بیرونی امداد سے حل نہیں کی جاسکتی۔ خوش فہم منصوبہ بندوں کی یہ امید کہ کچی آبادیوں کی حالت بیرونی امداد سے بدلی جاسکتی ہے، اس بات کو نظرانداز کردیتی ہے کہ کچی آبادی کے مکین کبھی بھی اس قابل نہیں ہوں گے کہ بازار یا حکومت کے نرخ پر بیرونی امداد سے تیار ہونے والے سینی ٹیشن نظام کی قیمت، جو بیرونی منصوبوں میں اور زیادہ ہو جاتی ہے، برداشت کرسکیں۔ اس کے علاوہ بیرونی عطیہ دینے والے بھی اب اس نظام کا پورا خرچ برداشت نہیں کرسکتے کیوں کہ اس نے آسمانی حد چُھولی ہے۔

اورنگی میں سینی ٹیشن کا مسئلہ ـــــ ۱۹۸۰ء

گندے محلّوں کی بنیادی خصوصیت وہاں سینی ٹیشن کی خراب حالات ہے۔ ۱۹۸۰ء میں اورنگی کے گھروں میں یا تو کونڈے کے پاخانے تھے، یا سوک پٹ، اور گلیوں میں گندے پانی اور فضلے کے نکاس کے لیے کھلی ہوئی نالیاں۔ ہم اس نظام کو قرونِ وسطیٰ کا سینی ٹیشن نظام کہہ سکتے ہیں۔

سینی ٹیشن کا یہ قدیم نظام صحت کے لیے مضر تھا۔ معیادی بخار، دست، بدہضمی، پیچش، ملیریا اور خارش وبا کی شکل میں عام تھے۔ خاص طور پر بچے ان امراض کا شکار ہوتے کیوں کہ وہ گندی

گلیوں میں کھیلتے ہیں، چناں چہ لوگوں کی آمدنی کا بڑا حصہ علاج معالجے پر خرچ ہوتا تھا۔ نکاسیِ آب کی خراب حالت کی وجہ سے زیرِزمین پانی کی سطح بلند ہو رہی تھی، اور اس کی وجہ سے مکانوں کی قیمت برابر گھٹ رہی تھی۔

ہماری تحقیق سے اندازہ ہوا کہ اورنگی کے باشندوں کو سینی ٹیشن اور نکاسیِ آب کے مسئلے کا احساس تھا۔ ان کو اپنی صحت اور ملکیت میں زیاں کے اسباب صاف نظر آرہے تھے۔ پھر آخر وہ نکاسیِ آب اور سینی ٹیشن کے سلسلے میں اُس طرح کام کیوں نہیں کر رہے تھے جیسا وہ مکانوں کی تعمیر میں کرتے تھے؟ ان لوگوں نے اورنگی میں اپنے خرچ سے ۹۴۰۰۰ مکان تعمیر کیے تھے۔
ہماری تحقیق سے ظاہر ہوا کہ اس کوتاہی کی وجہ چار رکاوٹیں ہیں:

۱۔ نفسیاتی رکاوٹ: اورنگی کے باشندوں کو یقین تھا کہ سرکاری ادارے ان کی گلیوں میں زیرزمین نکاسیِ آب کی پائپ لائنیں مفت لگائیں گے، اور ان کے لیڈر ان کے اس یقین کو نہ صرف تقویت دیتے تھے بلکہ اس کی توثیق کرتے تھے کہ ان کے سینی ٹیشن کا کام مفت ہوگا، یا بقول امریکیوں کے ان کو مفت لنچ ملے گا۔

۲۔ معاشی رکاوٹ: حکومت کی معرفت یا ٹھیکے داروں کے ذریعے نکاسیِ آب کی زیرِزمین پائپ لائن بچھانے اور فلش لیٹرین تعمیر کرنے کا خرچ ان کی ادائیگی کی قوت سے بہت زیادہ تھا۔

۳۔ تکنیکی رکاوٹ: غریب مکینوں نے بلاشبہ مقامی راج مزدوروں کے مشورے سے اپنے مکانوں خود تعمیر کیے تھے، اور کونڈے والے پاخانے اور سوک پٹ بھی خود بنائے تھے لیکن نہ تو یہ لوگ اور نہ ان کے مشیر وہ تکنیکی صلاحیت رکھتے تھے جو زیرِزمین نکاسیِ آب کے نظام کی تعمیر کے لیے ضروری تھی۔

۴۔ معاشرتی رکاوٹ: زیرِزمین نکاسیِ آب کے نظام کی تعمیر کے لیے نہ صرف بلند پایہ تکنیکی مہارت کی ضرورت ہے بلکہ اس کے لیے ایک منظم معاشرتی نظام درکار ہے تاکہ مل جل کر کام کیا جا سکے۔ یہ نظام ۱۹۸۰ء میں اورنگی کی گلیوں میں موجود نہیں تھا۔

او پی پی کا ابتدائی کام یہ تھا کہ ان چار رکاوٹوں کو ہٹائے۔ پہلے قدم کے طور پر چند سماجی تنظیم کاروں اور تکنیکی کارکنوں پر مشتمل ایک دفتر قائم کیا گیا۔ او پی پی نے دراصل یہ فرض کر لیا کہ وہ کے ایم سی اور کے ڈی اے کے توسیع اور تحقیق کے بازو کا کام انجام دے گی، اس امید کے ساتھ کہ آگے چل کر ایک دن ایسا آئے گا کہ نہ صرف کے ایم سی بلکہ تمام بلدیاتی ادارے یہ تسلیم کریں گے کہ ان کو کم آمدنی والے علاقے میں ایک تحقیقی اور توسیعی بازو کی ضرورت ہے۔

تحقیق اور توسیع کا طریقہ چھوٹے کسانوں کے سلسلے میں بے حد مفید رہا ہے۔ اس کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ چھوٹے کسان اپنے کھیتوں کا مالی اور تکنیکی انتظام خود انجام دے سکتے ہیں اور انھیں انجام دینا چاہیے، لیکن ان کو اس کام میں تین قسم کی رہنمائی اور امداد کی ضرورت ہے:

(الف) تحقیق: مثال کے طور پر زیادہ پیداوار والی فصل، بہتر کاشت کا طریقہ اور اچھے اوزار، فصل کا کیڑوں سے بچانا اور مویشیوں کی بہتر دیکھ بھال۔

(ب) توسیع: یعنی جدید علم کو کسانوں تک پہنچانا، اور تجربے کر کے اُن کو دکھانا کہ تحقیق کے کیا فوائد ہیں۔

(ج) وافر مقدار میں کم قیمت (بعض اوقات امدادی قیمت پر) بیج اور کھاد اور زرعی ماہروں کی خدمت کی فراہمی۔

کچی آبادیوں میں کم آمدنی والے مکان مالکوں کی حالت چھوٹے کسانوں سے ملتی جلتی ہے، اس لیے اوپر کے مفروضے ان کے مسائل کے سلسلے میں بھی درست ہیں۔

او پی پی نے تحقیق اور توسیع کے طریقے کو کم لاگت سینی ٹیشن اور کم لاگت مکانوں کی تعمیر کے لیے اورنگی میں کامیابی سے متعارف کیا۔

سینی ٹیشن کے درجے

جدید سینی ٹیشن کے چار درجے ہیں:

۱۔ مکان کے اندر فلش لیٹرین۔

۲۔ گلی میں زیرِزمین گندے پانی کی پائپ لائن، مین ہول اور پائپ کو گھر سے منسلک

کرنے کا نظام۔

۳۔ رابطے کے بڑے، زیرزمین یا زمین کی سطح پر قائم نالے۔

۴۔ نکاسیِ آب کے مرکزی نالے اور گندے پانی کو صاف کرنے والے بڑے تالاب۔

او پی پی نے معلوم کیا کہ گھروں کے مالک ذہنی طور پر تیار ہیں اور چھوٹے کسانوں کی طرح یہ ذمے داری اٹھانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں کہ اپنے خرچ پر، اپنے زیرِانتظام، سینی ٹیشن کی پہلی تین سطحوں کی تعمیر اور دیکھ بھال کا کام انجام دیں۔ یہ تین سطحی نظام سینی ٹیشن کے پورے نظام کا ۹۰ فیصد حصہ ہے۔ سڑکوں اور پانی کے مرکزی پائپوں کی طرح مرکزی نالوں اور صفائی کے تالابوں کی تعمیر کسی مرکزی سرکاری ادارے کی ذمے داری ہونی چاہیے۔

لاگت میں کمی

تحقیق اور توسیع کے ذریعے لاگت کو بہت کم کرنا ممکن ہوا، اور یہ بھی کہ مکین تعمیر اور دیکھ بھال کی پوری ذمے داری قبول کرلیں۔ تحقیق میں حسبِ ذیل امور شامل تھے:

۱۔ ڈیزائن کو آسان کرنا۔

۲۔ مین ہول کے لیے ایک ہی قسم کے لوہے کے سانچے تیار کرنا۔

۳۔ گلیوں کی پیمائش کر کے اس کے نقشے بنانا۔

۴۔ نمونے کی گلیاں تیار کرنا اور ان کے سلائڈ اور فلم بنانا۔

۵۔ ہدایات کو تحریری طور پر شائع کرنا۔

توسیع کے کام میں مندرجہ ذیل باتیں شامل تھیں:

۱۔ گلیوں میں فعال کارکن ڈھونڈنا۔

۲۔ گلیوں میں راج مزدوروں اور منتظموں کی تربیت۔

۳۔ صحیح نقشے اور تخمینوں کی فراہمی۔

۴۔ اوزار اور لوہے کے سانچے بطور قرض فراہم کرنا اور

۵۔ معاشرتی اور تکنیکی مشوروں اور نگرانی کی مفت فراہمی۔

معاشی رکاوٹ کا خاتمہ

چار رکاوٹوں میں سب سے زیادہ مشکل رکاوٹ معاشی تھی، یعنی روایتی سینی ٹیشن نظام اور فلش لیٹرین کی بے حد بڑھی ہوئی قیمت۔ لیکن گنجان آباد علاقوں میں جدید سینی ٹیشن کے نظام کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ اس بات پر اصرار کہ ذیلی گندے علاقوں کے مکین قرونِ وسطیٰ کے سینی ٹیشن نظام (کونڈے کے پاخانے، سوک پٹ اور کھلی ہوئی نالیوں) پر راضی ہو جائیں، ان کے لیے سخت نقصان دہ ہونے کے علاوہ ذلت آمیز بھی ہے۔ اس میں بھی شبہ ہے کہ یہ نظام کم آبادی والے علاقوں میں بھی بغیر کسی بڑے نقصان کے جاری رکھا جا سکتا ہے؛ پھر اس فرسودہ نظام کو اورنگی اور بلدیہ جیسے گنجان آباد علاقوں میں رائج کرنا گویا صحت اور مکانوں کو تباہ کرنے کی دعوت دینا ہے۔

پورے ایک سال او پی پی کی تحقیق کا محور یہ بنیادی سوال تھا: کیا سینی ٹیشن کی زیرِزمین پائپ لائنوں، مین ہول اور فلش لیٹرین کی تعمیر کی لاگت اس حد تک کم کی جا سکتی ہے کہ اورنگی کے مکانوں کے غریب مکین اسے برداشت کر سکیں؟ ایک سال بعد یہ پتا چلا کہ (۱) نقشے کی ترتیب اور تعمیر کے طریق کار کو تبدیل کر کے اور (۲) گلیوں کے منتظموں کو مفت تکنیکی مشوروں کی فراہمی کے ذریعے ٹھیکے داروں کے مروجہ طریقے کی رشوت اور بے جا نفع اندوزی کا خاتمہ کر کے، یہ لاگت حیرت انگیز طور پر کم کی جا سکتی ہے۔

مثال کے طور پر آسان نقشوں اور لوہے کے سانچوں کی تیاری نے فلش لیٹرین اور مین ہول کا خرچ ایک چوتھائی کر دیا اور ٹھیکے دار کے بڑھے ہوئے نفع کی کمی سے مزدوری اور سامان کا خرچ بھی گھٹ کر ایک چوتھائی ہو گیا۔

اس تحقیق کے نتیجے میں او پی پی، اورنگی میں ایک سو مربع گز کے مکان کے مالک کو مشورہ دے سکتی تھی کہ وہ صرف ایک ہزار روپے خرچ کر کے اپنے گھر کے اندر فلش لیٹرین اور گلی میں زیرِزمین پائپ لائن بچھا سکتا ہے۔ خرچ کے تخمینے کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱۔ فلش لیٹرین	۳۰۰ روپے
۲۔ مکان میں کنکشن کا خرچ	۲۰۰ روپے
۳۔ زیرِزمین پائپ کا حصہ	۴۵۰ روپے

۴۔ رابطے کے بڑے نالے ۵۰ روپے

اورنگی میں ایک عام خاندان نے اپنے مکان کی تعمیر پر ۲۰ سے ۲۵ ہزار روپے خرچ کیے تھے، لہٰذا ایک ہزار روپے کا اضافی خرچہ اُن کے لیے بہت زیادہ نہیں تھا۔

او پی پی اب اس کے بعد دوسری رکاوٹوں کو دور کرنے پر توجہ دے سکتی تھی۔ خرچ میں غیر معمولی کمی کے بغیر کم آمدنی والے خاندان کو اس بات پر آمادہ کرنا ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے خرچ پر اپنے زیرِانتظام گلیوں میں سینی ٹیشن کے زیرِزمین نظام کی تعمیر اور دیکھ بھال کی ذمے داری قبول کریں۔ قیمت میں غیر معمولی کمی اس وقت ممکن ہوتی جب خود اپنے خرچ پر، اپنے زیرِانتظام، بغیر کسی درمیانی منافع خور کے کام ہو۔ لوگوں کو ٹھیکے دار پر اس لیے انحصار کرنا پڑتا تھا کہ اُس کے پاس تکنیکی مہارت اور اوزار تھے۔ او پی پی نے گلیوں میں منتظموں کو تربیت دی اور ان کو اوزار اور لوہے کے سانچے فراہم کیے، اس طرح ان کو رشوت اور بے جا منافع سے بچا لیا۔

ذہنی رکاوٹ کا دور کرنا

ذہنی رکاوٹ کو دور کرنا، یعنی اس غلط مفروضے کا خاتمہ کہ لوگ سینی ٹیشن کا نظام مفت حاصل کرسکتے ہیں، اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا جیسا شروع میں معلوم ہو رہا تھا۔

پہلی وجہ تو یہ ہوئی کہ مکانوں کے مالک، منصوبہ بندوں کے فرسودہ خیال کے برخلاف، مفلس نہیں تھے۔ بے شک ان کی آمدنی کم تھی، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے مکانات اپنی بچت سے تعمیر کیے تھے۔ ان کا مکان ان کا سب سے قیمتی اثاثہ تھا اور وہ اس کی حالت کو بہتر کرنا چاہتے تھے۔ سوک پٹ کا استعمال اور گلیوں میں جمع گندا پانی زیرِزمین پانی کی سطح میں بلندی کا باعث بن رہے تھے جس سے مکان کی بنیاد کمزور ہو رہی تھی اور اُس کی قیمت میں کمی آرہی تھی۔ ہماری تحقیق سے معلوم ہوا کہ مکان مالکوں کا سب سے بڑا محرک اپنے مکانوں کو بہتر کرنے کی خواہش تھی۔

ایک دوسرا طاقتور محرک اپنی اور بچوں کی صحت کی حفاظت تھا۔ ماؤں نے بہت آسانی سے یہ دیکھ لیا کہ گندگی اور بیماری میں کیا تعلق ہے۔ فلیش لیٹرین اور گندے پانی سے پاک گلیاں بیماری میں کمی کا باعث ہوں گی، اور یوں علاج کا خرچ گھٹ جائے گا۔ ایک اور بڑا محرک اُبلتے ہوئے

سوک پٹ اور کام چور بھنگیوں سے چھٹکارا تھا۔

جب گھر والوں کو اندازہ ہوا کہ صرف ایک ہزار روپے خرچ کر کے، جو ان کی ایک ماہ کی آمدنی تھی، ان کو صحت اور ملکیت کی مد میں اتنی سہولتیں مل جائیں گی، تو وہ موہوم وعدوں کے وفا ہونے کے انتظار کی بجائے فوراً اپنا کام خود کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے اپنے لیے مکانوں کی تعمیر کا انتظار نہیں کیا تھا، جس کا ان کے ہم درد لیڈروں نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ رہنے کے لیے مکان ان کی فوری ضرورت تھی اور وہ اس کی تعمیر کو اپنی ذمے داری سمجھتے تھے۔ اب ان کو بتایا گیا کہ گلیوں کی صفائی ستھرائی بھی ان کی اپنی ذمے داری ہے۔ ان کو گلیوں کو اپنے مکانوں ہی کی توسیع سمجھنا چاہیے۔ ان کو گلیوں کو خود ہی اس طرح تعمیر کرنا ہے اور ان کی دیکھ بھال کرنی ہے جیسے وہ مکانوں کی تعمیر اور دیکھ بھال کرتے ہیں۔ شروع میں کچھ بڑبڑاہٹ سننے میں آئی لیکن جلد ہی یہ پیغام قابلِ قبول ہو گیا۔

سماجی تنظیم کاروں اور تکنیکی کارکنوں کا کردار

اورنگی میں اور دوسری جگہوں میں بھی بہت سی سماجی انجمنیں، ایسوسی ایشنیں، سوسائٹیاں اور کلب وغیرہ ہیں۔ ان میں سے بیشتر تنظیمیں سرکاری محکموں پر دباؤ ڈال کر یا بحث مباحثے سے قائل کر کے سہولتیں حاصل کرنے کے خیال سے بنائی گئی ہیں نہ کہ تعمیری کام کی غرض سے۔ ان میں سے کوئی بھی تنظیم نکاسیِ آب کی زیرِزمین لائنیں تعمیر کرنے کی ذمے داری نہیں اٹھا سکتی تھی۔ اس لیے ایک نیا نظام ترتیب دیا گیا۔ ہر گلی کو تعمیر کی اکائی شمار کیا گیا۔

او پی پی کے تکنیکی ماہروں نے ہر گلی کی پیمائش کی، اس کی سطح کا نقشہ بنایا، منصوبے اور تخمینے تیار کیے، اور سماجی تنظیم کاروں نے مکانوں کے مالکوں کو سمجھایا کہ اپنی صحت اور بہتری کی خاطر ان کو اپنے خرچ پر سینی ٹیشن نظام تعمیر کرنا ہوگا۔ ان کو اوزار، سانچے اور تکنیکی مشورہ او پی پی سے مفت مل جائے گا، لیکن سب سے پہلے خود انھیں گلی کی سطح پر خود کو منظم کرنا ہوگا۔ عام طور پر ہر گلی میں کوئی سرگرم کارکن ایسا مل گیا جو بعد میں گلی کا منتظم بن گیا اور جس نے گلی میں میٹنگ کر کے ہم خیالی پیدا کی، جھگڑے چکائے، مالکوں سے ان کا حصّہ خرچ کے لیے وصول کیا اور تعمیری

کام کی نگرانی کی۔

اورنگی میں کم لاگت سینی ٹیشن کے نظام کی تعمیر:

۱۹۸۱ء سے فروری ۱۹۹۵ء تک

اپنے خرچ پر اور اپنی نگرانی میں زیرزمین گندے پانی کی نالیوں اور مکانوں میں فلش لیٹرین پر مشتمل سینی ٹیشن کے نظام تعمیر کرنے کے او پی پی کے پروگرام کو اورنگی کے لوگوں کے سامنے ۱۹۸۱ء میں پیش کیا گیا۔ یہ کس طرح سے لوگوں میں مقبول ہوا، اس کا اندازہ حسبِ ذیل نقشے سے لگایا جاسکتا ہے۔ او پی پی کی سرپرست بی سی سی آئی فاؤنڈیشن نے ۱۹۸۲ء میں یو این سی ایچ ایس (Habitat) کو دعوت دی تھی کہ وہ اورنگی میں سینی ٹیشن پروگرام شروع کریں۔ لہذا او پی پی کا سینی ٹیشن پروگرام اورنگی کے آدھے علاقے میں محدود رہا۔ ۱۹۹۰ء میں یہ قدغن اٹھالی گئی۔ شروع میں حسب ذیل تقسیم تھی:

	او پی پی کا علاقہ	دوسرا علاقہ	کل
۱۔ سیکٹر	66	44	110
۲۔ گلیاں	3,389	2,958	6,347
۳۔ مکانات	49,941	44,181	94,122

فروری ۱۹۹۵ء میں کم لاگت سینی ٹیشن کے نظام کی تعمیر کی پیش رفت یہ تھی:

فلش لیٹرین اور سینی ٹیشن لائنوں کی تعمیر۔

	او پی پی کا علاقہ	دوسرا علاقہ
کل گلیاں	3,389	2,958
سینی ٹیشن کے ساتھ گلیاں	3,316	1,940
فیصد تکمیل	97.84	65.58
کل مکانات	49,941	44,181
فلش لیٹرین والے مکانات	49,272	31,231
فیصد تکمیل	98.66	70.68

لوگوں کا سینی ٹیشن پر خرچ

اوپی پی کا علاقہ

	تعداد	رقم	اوسط
سینی ٹیشن لائن	3,316	1,07,96,202روپے	3,255
رابطے کے نالے	283	14,91,860	5,271
فلش لیٹرین	49,272	2,48,72,600	504
کل خرچ		3,71,60,662روپے	

دوسرا علاقہ

	تعداد	رقم	اوسط
سینی ٹیشن لائن	1,940	84,07,442	4,333
رابطے کے نالے	395	3,17,193	2,833
فلش لیٹرین	80,503	1,68,53,500	539
کل خرچ		2,55,78,135روپے	
میزان		6,27,38,797روپے	

عملی تجربے کے اثرات

عملی تجربے کے اثرات ہر طرف نمایاں ہیں۔ گلیوں کی زیرِزمین نالیاں اور فلش لیٹرین جو لوگوں نے اپنے خرچ پر، اپنے زیرِانتظام تعمیر کیے ہیں ان کی وہ خود دیکھ بھال کرتے ہیں۔ وہ اب بہتر صفائی ستھرائی کے عادی ہو گئے ہیں جس کو قائم رکھنے کے لیے وہ اپنی جیب سے خرچ کرنے پر آمادہ ہیں۔ راج مزدوروں کی بہتر تربیت کی وجہ سے سینی ٹیشن کی مد میں، اور گلیوں کے منتظموں کی تربیت کی بنا پر تکنیکی صلاحیت میں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ اب یہ لوگ اوپی پی سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ دوسری کچی آبادیوں کے مقابلے میں یہ فرق اب یہاں کا دورہ کرنے والوں کو صاف نظر آتا

ہے۔
تجربے سے اس بات کا ثبوت مل گیا ہے کہ کچی آبادی میں جدید سینی ٹیشن کی دوہری مشکل کو لوگوں کو منظم کر کے، ان کے انتظام اور معاشی وسائل کو یک جا کر کے تحقیق اور توسیع کے ذریعے ان کو معاشرتی اور تکنیکی مشورے دے کر حل کیا جاسکتا ہے۔
یہ بھی ثابت ہوسکتا ہے کہ کچی آبادی کے کم آمدنی والے مکین خوشی سے اس بات پر راضی ہیں اور اُن میں صلاحیت بھی ہے کہ اپنے گھروں میں فلش لیٹرین اور گلیوں میں زیرِزمین پائپ لائن اور رابطے کے نالے تعمیر کریں، اندورنی صفائی ستھرائی کا خرچ کل خرچ کا تقریباً ۸۰ فیصد ہے چناں چہ بلدیاتی اداروں کے لیے باہری بڑے نالوں اور گندے پانی کو صاف کرنے والے تالابوں کی تعمیر آسان ہوجاتی ہے۔
یہ ثابت ہوگیا ہے کہ کم آمدنی والے مکین اپنے خرچ پر خود تعمیر کردہ نالیوں کی بہتر دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ان ہزاروں نالیوں کی مناسب دیکھ بھال بلدیہ کے لیے ناممکن ہے۔

نقشِ ثانی

اپنے خرچ پر، اپنے زیرِانتظام، کم لاگت سینی ٹیشن کا نظام تعمیر کرنے کے اورنگی کے طریقے کی نقل بہت سے غیر سرکاری تنظیموں اور امدادی اداروں (یونیسیف اور ورلڈ بینک) کی زیرِنگرانی ۱۹۹۰ء سے شروع ہوئی اور بعض سرکاری محکموں مثلاً تسنیم احمد صدیقی کی سربراہی میں سندھ کچی آبادی اتھارٹی نے دو سال ہوئے اس پروگرام کو سرکاری پالیسی کا حصّہ بنالیا ہے۔
او پی پی ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹیٹیوٹ کو یونیسیف، ورلڈ بینک، کچی آبادی ڈائریکٹریٹ اور کے ایم سی نے سینی ٹیشن کے شعبے میں اپنا مشیر مقرر کیا ہے۔ آر ٹی آئی اب ان شہروں میں سینی ٹیشن پروگرام کا نقشِ ثانی تیار کر رہی ہے: سکھر (یونیسیف)، حیدرآباد (ورلڈ بینک)، پشاور (یونیسیف)، لاہور (دو غیر سرکاری تنظیمیں) اور فیصل آباد (کاری ٹاس)۔
کراچی میں آر ٹی آئی، سندھ کچی آبادی اتھارٹی، کے ایم سی اور دوسری این جی اوز سے مل کر گیارہ بستیوں میں مصروف ہے: منظور کالونی، پیر آباد، مسلم آباد محمد پور، اسلامیہ کالونی، بھٹائی

کالونی، ویلفیر کالونی، مجاہد کالونی، جمالی کالونی اور مدینہ کالونی۔

او پی پی آر ٹی آئی گلشنِ بہار کے منصوبے کے لیے بھی ایشین ڈولپمنٹ بینک اور کے ایم سی کی مشیر تھی۔

کچی آبادی کے مکینوں کا اندورنی ترقی میں حصّہ لینا اور کام کی ذمےداری قبول کرنا اخراجات میں کمی اور رشوت کے خاتمے کا باعث ہوتا ہے اور اس سے کام میں تیزی آتی اور دیکھ بھال یقینی ہو جاتی ہے۔

کم لاگت مکانوں کی تعمیر

غریبوں کو رہائش فراہم کرنے کی سرکاری پالیسیاں

کراچی میں ۱۹۶۰ء سے اب تک کم آمدنی والوں کی رہائشی ضروریات پوری کرنے کے لیے سرکاری طور پر تین قسم کی تدابیر اپنائی گئیں:

(الف) رہائشی کالونیوں کی تعمیر: حکومت نے کراچی کے مضافات (لانڈھی اور کورنگی) میں ہر قسم کی سہولیات کے ساتھ بڑی بڑی کالونیوں کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ اندرونِ شہر کی بےقاعدہ بستیوں کے باشندوں کو وہاں سے اٹھا کر ان کالونیوں میں بسایا گیا۔ ان بڑی بڑی اسکیموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے حکومت کو کم سود پر قومی اور باہری اداروں سے قرض لینا پڑا۔ توقع تھی کہ ان کالونیوں سے فائدہ حاصل کرنے والے پندرہ یا پچیس سال میں یہ قرض لوٹائیں گے۔

اس قسم کی دوسری کالونیوں کو اس وجہ سے تعمیر نہیں کیا جا سکا کہ کچی آبادیوں میں رہنےوالوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، نئی کالونیوں میں بسائے جانے والوں نے بہت تھوڑی رقم واپس کی اور ضرورت کے مطابق بیرونی امداد فراہم نہیں ہوئی۔

(ب) زمین اور سہولیات کی فراہمی کا پروگرام (میٹرووِل): اس بات کے احساس کے بعد کہ غریب شہریوں کے لیے مکانات کی تعمیر مشکل ہے، منصوبہ سازوں نے فیصلہ کیا کہ ان کو سرکاری اداروں کے تیار کیے ہوئے پلاٹ، سہولیات کے ساتھ، فروخت کیے جائیں۔

میٹرووِل پروجیکٹ اس وجہ سے ناکام ہو گیا کہ جن لوگوں کے لیے اسے تعمیر کیا گیا تھا، وہ ۹۰ گز کے ڈویلپ کیے ہوئے پلاٹ کو بھی خریدنے کو تیار نہیں ہوئے جس کی قیمت صرف

۶۰۰ روپے تھی۔ شاید یہ قیمت ان کی قوتِ خرید سے زیادہ تھی یا وہ قیمت ادا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ نتیجے کے طور پر میٹرووِل کے پلاٹ یا تو بہت دن تک خالی رہے یا ان کو سٹے بازوں یا متوسط طبقے کے لوگوں نے خرید لیا۔ یہ بات اورنگی کے میٹرووِل میں دیکھی جا سکتی ہے، جہاں ۱۹۷۳ء میں ۱۳۱۴ پلاٹ تیار کیے گئے تھے۔ یہ پلاٹ ۱۹۷۸ء تک خالی رہے جبکہ میٹرووِل کے آس پاس تیس ہزار مکان غریب لوگوں نے اپنے خرچ پر خود تعمیر کر لیے۔

(ج) سرکار بطور ڈویلپر: جدید ترین حکمت عملی یہ ہے کہ حکومت خود زمین کو ڈویلپ کر کے پلاٹ بنانے لگے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نئے منصوبوں کا اعلان ان کی تعمیر سے پہلے ہوتا ہے (جیسے سرجانی ٹاؤن، اور شاہ لطیف ٹاؤن) اور پبلک کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ پلاٹ کی قیمت پیشگی رقم اور آسان قسطوں کی صورت میں ادا کرے۔

ڈویلپمنٹ کا یہ طریقہ بظاہر غریبوں کے لیے ایجاد ہوا ہے لیکن حقیقت میں ان کے لیے نہیں ہے کیوں کہ:

(۱) وہ زمین پر قبضہ فوری طور پر چاہتے ہیں اور اپنے رہائشی مسئلے کے حل کے لیے کئی سال انتظار نہیں کر سکتے۔

(۲) ان کو یہ معلوم نہیں کہ سرکاری افسروں سے کس طرح معاملہ کیا جاتا ہے اور سرکاری قواعد اور طریق کار کی پابندی کیسے کی جاتی ہے۔ سرجانی ٹاؤن اور شاہ لطیف ٹاؤن کے پلاٹ جو ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۳ء میں لوگوں کے نام کیے گئے تھے ان کا قبضہ انہیں ابھی تک نہیں ملا ہے۔

سرکاری اداروں کی ناکامی

کراچی میں دو سرکاری ادارے رہائش کے معاملات سے متعلق ہیں: ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن اور کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی۔ کے ڈی اے، زمین کو ڈویلپ کر کے لوگوں کو پلاٹ فروخت کرتا ہے اور ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن قرض فراہم کر کے مکانوں کی تعمیر میں معاونت کرتی ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے غیر سرکاری کاروباری ادارے ہیں جو پلاٹ ڈویلپ کر کے اور مکان بنا کر

قسطوں پر دیتے ہیں۔

کے ڈی اے اور دوسرے ٹھیکے داروں نے کراچی میں تعمیر کا بہت سا کام کیا ہے لیکن یہ کام غریب طبقے کے رہائشی مسائل حل کرنے کے لیے نہیں تھا۔ اسی طرح ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن نے اربوں روپے قرض دیے ہیں لیکن اس رقم کا بہت کم حصہ کچی آبادیوں میں پہنچ سکا ہے۔ نچلے طبقے کے لوگوں کو بھی مکانوں کی ضرورت ہے، چناں چہ انھوں نے اپنے لیے کراچی کی کچی آبادیوں میں (جن کی تعداد ۴۰۰ ہے) اپنے خرچ پر مکان تعمیر کر لیے۔ اب ہماری مہربان حکومت ان کچی آبادیوں کو باقاعدہ کرنے پر آمادہ ہے۔ درحقیقت ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ منصوبہ سازوں کے نزدیک غریبوں کے رہائشی مسائل کے حل کی تدبیر یہ ہے کہ وہ لوگ خود اپنی کوشش سے پہلے کچی آبادی بنائیں اور پھر وہاں اپنے خرچ سے مکانات تعمیر کریں۔

مکانوں کی تعمیر: غریبوں کی تنظیموں کے ذریعے

اورنگی کی کچی آبادی میں پچھلے بیس سال میں ۶۳۴۷ گلیاں وجود میں آئیں، جہاں ۹۴۱۲۲ مکان تعمیر ہوئے۔ ان مکانوں کے مالک بیشتر مزدور پیشہ ہیں یہ بڑا کام سرکاری اداروں (کے ڈی اے، ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن یا ٹھیکے داروں) کی مدد سے نہیں بلکہ غیر سرکاری تنظیموں کے ذریعے سے ہوا۔

اورنگی کے کم آمدنی والے خاندانوں کے لیے کے ڈی اے کا کام دلالوں نے کیا۔ انھوں نے پہلے سرکاری زمین پر ناجائز قبضہ کیا، اس کو ڈویلپ کر کے پلاٹ بنائے اور پلاٹ کو لوگوں کو قیمتاً دیے۔ نہ صرف یہ، بلکہ انھوں نے پانی کی فراہمی، رسل و رسائل اور پولیس سے تحفظ کا بندوبست بھی کیا۔ ٹھلے والوں نے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن اور ٹھیکے داروں کا فرض اپنے ذمے لیا، اور قرض پر عمارتی سامان (سیمنٹ، سریا وغیرہ) فراہم کیا اور تکنیکی مشورے بھی دیے۔ راج مزدوروں نے آرکیٹیکٹ اور ٹھیکے دار کے فرائض انجام دیے۔

دلّال

دلّالوں کے کردار کی خاکہ کشی دل چسپی کا باعث ہو گی کیوں کہ ان کو صحیح معنی میں کچی آبادی کا ترقیاتی ادارہ کہنا چاہیے۔

دلال نجی شعبے میں کام کرنے والے تاجر پیشہ افراد ہیں جنھوں نے ہمارے لالچی سیاست دانوں اور راشی سرکاری اہلکاروں سے سازباز کا فن سیکھ لیا ہے۔ اپنے سرپرستوں کو مہنگے داموں خوش کر کے یہ دلال سرکاری زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے ناجائز طور پر حاصل کرتے ہیں، قیمت ادا کر کے بے دخلی کے خلاف تحفظ خریدتے ہیں اور پانی اور ٹرانسپورٹ کی سہولتیں مہیا کرتے ہیں۔

دلالوں کی منصوبہ بندی، جہاں تک ممکن ہو، کے ڈی اے کے ضوابط کے مطابق ہوتی ہے تاکہ بعد میں کچی آبادی کی باقاعدگی میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ دکانوں کے اور دوسرے قیمتی تجارتی پلاٹ بعد میں منافع اندوزی کے لیے بچا کر رکھ لیے جاتے ہیں۔ بعض صورتوں میں یہ پلاٹ مددگار سرکاری اہلکاروں کے نام ہوتے ہیں۔

رہائشی پلاٹوں کی قیمت اتنی کم رکھی جاتی ہے کہ غریب شخص یک مشت ادا کر کے اسے خرید سکے۔ اس بات کو ممکن بنانے کے لیے، دلال کبھی کبھی اپنا نفع تک اس امید پر چھوڑ دیتا ہے کہ آگے چل کر تجارتی پلاٹوں سے زیادہ نفع حاصل کرے گا۔

دلال غریب لوگوں کو پلاٹ، بے دخلی سے حفاظت اور ٹرانسپورٹ کی سہولت کے ساتھ، فوری طور پر فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مکان تعمیر کرنے کی آسانی کے لیے وہ تھلا بھی فراہم کرتے ہیں۔

اس پورے عمل کے دوران دلالوں کو سیاسی قوّت حاصل ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے سیاست دان ان کی خوشامد کرنے لگتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ الیکشن سے پہلے نئی کچی آبادیوں میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔

ٹھلے والے

ایک طرف دلال زمین حاصل کر کے اس کو ڈویلپ کرتے، پلاٹوں میں تقسیم کرتے اور بیچتے ہیں، اور دوسری طرف ٹھلے والے عمارت کی تعمیر کے لیے اوزار اور دوسرا عمارتی سامان، قرضہ اور تکنیکی مشورے فراہم کرتے ہیں۔ اورنگی میں ۲۰۰ سے زیادہ ٹھلے ہیں۔ ٹھلے والے سیمنٹ اور سریے کے تھوک فروشوں کے ایجنٹ بھی ہیں۔ ان کا لوہے کے جنگلے، کھڑکیاں اور دروازے بنانے والے لوہاروں سے اور راج مزدوروں سے قریبی رابطہ ہے۔ وہ اوزار اور دوسرا تعمیری سامان ادھار فراہم کرتے ہیں۔

قرض، تکنیکی رہنمائی اور تعمیری سہولتوں کے اس اجتماع کی بدولت ٹھلے والے مکان تعمیر کرنے کے خواہش مند غریبوں کو بہتر معاونت فراہم کر سکتے ہیں، اور ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن یا ٹھیکے داروں کے مقابلے میں بہت کم خرچ پر۔ اسی طرح راج مزدوروں کی خدمات کسی انجنیئر یا آرکیٹیکٹ سے کہیں زیادہ سستی ہیں۔

اورنگی کے مکانوں کے نقائص

تجزیے سے پتا چلا کہ:

۱۔ ٹھلے پر بغیر مشین کے تیار کیے گئے سیمنٹ بلاک بھربھرے تھے کیوں کہ انھیں پوری طرح ٹھونک کر مضبوط نہیں کیا گیا تھا اور نہ اچھی طرح ترائی کی گئی تھی۔

۲۔ راج مزدوروں کا کام نقشے اور پیمائش کے اعتبار سے عیب دار تھا، لائن درست نہیں تھی اور بنیاد ناقص تھی۔

۳۔ کمزور بلاکوں اور ان کی غلط چنائی کی وجہ سے ۴۰ فیصد دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ ان پر سیلن کا حملہ بھی ہوا تھا۔

۴۔ راج مزدوروں کو مکان میں روشنی اور ہوا کی آمد کا صحیح ادراک نہیں تھا۔

۵۔ مالکوں نے اپنا مکان تھوڑا تھوڑا کر کے تعمیر کیا تھا۔ پہلے ٹین کی چھت والا ایک کمرہ

بنایا جاتا، بعد میں جب اس کو دو منزلہ کرنے کی نوبت آتی تو پورے مکان کو توڑ کر دوبارہ بنانا پڑتا۔

۶۔ سب سے بڑا مسئلہ سیم اور تھور کا تھا جو ابلتے ہوئے سوک پٹ، بُودار کونڈے والے پاخانوں اور گلیوں میں گندے پانی کی نالیوں کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

او پی پی کا تحقیقی اور توسیعی طریقہ

ابتدا میں مکانوں کی ساخت میں بہتری کے مقابلے میں سینی ٹیشن کو زیادہ اہم مسئلہ سمجھا گیا۔ سیم زدہ گلیاں اور سوک پٹ مکینوں کی صحت کو خراب اور ان کے مکانوں کی قیمت کو کم کر رہے تھے۔ او پی پی نے فیصلہ کیا کہ دقیانوسی اور خطرناک سینی ٹیشن نظام (کونڈے والے پاخانوں اور سوک پٹ اور کھلی نالیوں) کی جگہ اورنگی کو جدید سینی ٹیشن (فلش لیٹرین اور زیرِزمین گندے پانی کی پائپ لائن) کی ضرورت ہے۔

سینی ٹیشن پروگرام کی کامیابی کے بعد او پی پی نے ۱۹۸۶ء میں مکانوں کی اصلاح کا پروگرام شروع کیا۔ اس پروگرام میں بھی وہی پرانا تحقیق اور توسیع کا طریقہ اپنایا گیا۔ تجزیے سے پتا چلا کہ اورنگی کے غریبوں کے مکانوں میں حسبِ ذیل خرابیاں ہیں:

۱۔ غیر معیاری تعمیری تکنیک، جس کی وجہ راجوں کی کم علمی اور ناتجربہ کاری ہے۔

۲۔ ناکافی ہوا اور روشنی۔

۳۔ کم لاگت چھت اور بغیر سریے کے چھت کا بوجھ اٹھانے والی دیواروں کی ضرورت۔

دو سال تحقیق میں صَرف ہوئے اور ان مسائل کا حل دریافت کر لیا گیا۔ پھر اگلے دو سال اس تحقیق کے علم کو توسیع کے ذریعے لوگوں تک پہنچانے میں لگے۔ تحقیق میں حسبِ ذیل امور شامل تھے:

۱۔ ٹھلوں کی کارکردگی کو بہتر کرنا۔

۲۔ ایک نیا قابلِ قبول تعمیری نقشہ اور معیاری تکنیک۔

۳۔ لوہے کی معیاری شٹرنگ اور سانچوں کی فراہمی۔

۴۔ کام کے دستور العمل اور ہدایت ناموں کی تیاری۔

۵۔ کام کے طریقے کی فلم۔

۶- کام کے تجربے کے لیے عملی نمونے کی تیاری۔
توسیع مندرجہ ذیل اجزا پر مشتمل تھی:
۱- ایسے ٹھلے والے دریافت کرنا جو تحقیق اور توسیع کے طریقے اپنانے کو تیار ہوں۔
۲- راج مزدوروں کی تربیت۔ ان کو نئے معیاری نقشوں سے آگاہ کرنا اور بہتر تعمیر کے طریقے اور اوزاروں کا استعمال سکھانا۔
۳- اوزار اور شٹرنگ ادھار دینا۔
۴- صحیح نقشے اور تخمینے فراہم کرنا۔
۵- تکنیکی مشورے اور تعمیر کی نگرانی مفت فراہم کرنا۔
تحقیق اور توسیع سے اورنگی میں مکانوں کی تعمیر کا معیار بہتر ہوا ہے اور لاگت میں کمی آئی ہے۔

ٹھلے میں بنے ہوئے بلاکوں کو بہتر کرنا

اورنگی میں دو سو ٹھلے والے تھے جو سیمنٹ اور بجری کے بلاک ہاتھ سے بنا کر بیچتے تھے۔ کم دباؤ، ترائی کی کمی، اور سیمنٹ اور بجری کے غلط تناسب کے باعث ان کے تیار کیے ہوئے بلاک بُھر بُھرے اور کمزور رہ جاتے تھے اور ان پر سلفیٹ کا اثر بھی جلد ہوتا تھا۔ یہ غیر معیاری بلاک صرف ۱۰۰ پاؤنڈ فی مربع انچ دباؤ برداشت کر سکتے ہیں جو معیاری تعمیر کے مطلوبہ معیار کا صرف ۱/۸ حصہ ہے۔ چوں کہ اورنگی میں مکانوں کی تعمیر کا یہ سب سے بڑا جز تھا اس لیے پہلے قدم کے طور پر اس کا معیار بہتر کیا گیا۔ سیمنٹ اور بجری کو صحیح تعداد میں ملانے، صحیح دباؤ ڈالنے اور ترائی کو بہتر کرنے کے لیے مشینی طریقہ اپنایا گیا۔ چھ ماہ کی مسلسل تحقیق کے بعد بلاک بنانے کی ایک اچھی مشین ۱۹۸۷ء میں تیار ہوئی۔ بڑے پیمانے پر بلاک بنانے کی جگہ او پی پی نے چھوٹے پیمانے پر مشینی بلاک تیار کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ یہ طریقہ اورنگی کے ٹھلوں میں عام کیا جا سکے۔ اس کام کے لیے تمام مشینیں ــــ بجری اور سیمنٹ مکسر، گیلی بجری کو بلاک کے سانچے میں بلانے والی مشین، پمپ اور سانچے ــــ اورنگی میں تیار ہوئیں۔ پہلے ٹھلے کی ان مشینوں پر ۷۵ ہزار روپے لاگت

آئی۔ مشین سے بنے ہوئے بلاک ہاتھ کے بنے بلاکوں سے چار گنا زیادہ مضبوط تھے لیکن ان کو اُسی قیمت پر بیچا گیا، کیوں کہ مشینی طریقے سے بنانے میں پیداوار تین گنا زیادہ ہو گئی۔ مشین کے ذریعے دن بھر میں ۳۳۰۰۰ بلاک تیار کیے جاسکتے ہیں جب کہ ہاتھ سے ۸۰۰ ۷ بلاک بنائے جاتے تھے، اور وزن برداشت کرنے کی صلاحیت ۱۰۰ کے مقابلے میں ۸۰۰ سے ۱۰۰۰ پاؤنڈ فی مربع انچ تک ہو گئی۔

او پی پی نے اپنا تھلا قائم نہیں کیا بلکہ نجی تھلوں کو اپنا تحقیقی تجربہ مفت فراہم کیا۔ ۱۹۸۷ء میں چار تھلوں میں او پی پی کے قرض اور مفت نگرانی کے تحت مشینیں لگائی گئیں۔ فروری ۱۹۹۵ تک ان تھلوں سے ایک کروڑ ۳ لاکھ ۷۰ ہزار مشینی بلاک فروخت ہو چکے ہیں۔ جن میں سے ۶۰ فیصد بلاک اورنگی سے باہر کے گاہکوں کو بیچے گئے۔ ان چار مشینی تھلوں کی کارکردگی سے متاثر ہو کر اورنگی میں دوسرے تھلے والے بھی مشینی بلاک بنانے لگے۔ ان لوگوں نے او پی پی سے قرض نہیں لیا بلکہ اپنے سرمائے سے مشینیں خریدیں۔ پہلے چار تھلے والوں نے او پی پی سے جو ۲ لاکھ ۷۵ ہزار روپے قرض لیے تھے، تین سال میں ادا کر دیے۔

چھتوں کا متبادل ڈیزائن

بلاکوں کا معیار بہتر کرنے کے بعد تحقیق کا رُخ چھتوں کے ڈیزائن کو بہتر کرنے پر مرکوز ہو گیا، اور سیمنٹ اور سریے کی پٹی، ٹائل یا سلیب کے ذریعے نئی قسم کی چھت کا ڈیزائن تیار کیا گیا۔ مکان کو قسط وار تعمیر کرنے کی وجہ سے غریبوں کے مکانوں کی تعمیر کے باعث ایک خاص قسم کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ پہلے مکان کا ایک کمرہ بناتے ہیں اور اس پر ٹین کی چھت ڈالتے ہیں۔ پھر اگر وسائل ہوں اور مکان میں اضافے کی ضرورت پڑے تو پرانے مکان کو توڑ کر نئے سرے سے تعمیر کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دومنزلہ عمارت کی آر سی سی چھت کا بوجھ پرانی بنیاد اور دیواریں برداشت نہیں کر پاتیں۔

پورا ایک سال انجینئروں کو تحقیق میں صَرف کرنا پڑا۔ اس عرصے میں وہ پنجاب کی سیمنٹ اور سریے کی پٹی، ٹائل اور سلیب بنانے کی فیکٹریوں میں بھی گئے تاکہ بلاک بنانے کے مشینی

طریقے کی طرح پٹی اور سیلب کی چھت تیار کرنے کے کام کو بھی آسان کیا جا سکے۔ آخر کار ایک متبادل ڈیزائن تیار کر لیا گیا جس کے ذریعے چھت بنانے پر صرف ۶۰ ہزار روپے کی لاگت آئی۔ اس رقم سے لوہے کے سانچے، بجری ہلانے کی مشین اور ترائی کا تالاب خریدا گیا۔ اس اضافی خرچ سے ٹھلے والوں کو ایک نیا نفع بخش اضافی کام مل گیا۔ وہ اب اپنے ٹھلے میں سیمنٹ کی پٹیاں اور سلیب بنا کر چھتوں کے لیے بیچ سکتے تھے۔ پٹی اور سلیب سے تیار ہونے والی چھت آر سی سی کی چھت سے آدھی قیمت میں تعمیر ہوتی ہے (۲۷ روپے بمقابلہ ۵۰ روپے) اور اس کی تعمیر آر سی سی والی چھت کے مقابلے میں آسان بھی ہے اور وقت کم لگتا ہے۔

پہلے ٹھلے نے، جس کو او پی پی نے مشین اور سانچے فراہم کرنے کے لیے ۵۵ ہزار روپے قرض دیے، مارچ ۱۹۹۰ء میں پیداوار کی ابتدا کی اور جون ۱۹۹۰ء تک ۱۰۱۷ ۲ فٹ پٹیاں اور ۹۵۵۸ مربع فٹ سلیب فروخت کیے۔

تھوڑی سی تقویت سے پرانی دیواریں اس قابل ہو گئیں کہ پٹی اور سلیب کی چھت کا بوجھ برداشت کر سکیں۔ بہت سے غریب خاندان اب اس بات کے خواہش مند ہیں کہ تکلیف دہ گرم ٹین کی چھت کو آرام دہ پٹی اور سلیب کی چھت سے بدل دیں اور اپنے مکان کو دو منزلہ کر لیں۔

پہلے سے ڈھالا ہوا سیمنٹ کا زینہ

پٹی اور سیلب کی چھت کے ساتھ ساتھ ایک ایسے زینے کا ڈیزائن بنایا گیا جو پہلے سے ڈھالے ہوئے سلیب سے تیار ہوا تھا۔ اس کے اجزا کی مجموعی قیمت ۲۰۰۰ روپے ہے جب کہ آر سی سی کے زینے پر ۴۰۰۰ روپے لاگت آتی ہے۔ پہلے سے تیار کیے ہوئے سلیب کا زینہ کم جگہ گھیرتا ہے اور اس کو جوڑنے میں تین دن لگتے ہیں جب کہ آر سی سی کا زینہ ۱۵ دن میں تیار ہوتا ہے۔

نئی تعمیری تکنیک: بوجھ اٹھانے والی دیواریں

اس طرح چار سال کے عرصے میں اورنگی میں مکانوں کے معیار میں بہتری اور لاگت میں کمی کے سلسلے میں تحقیق اور توسیع کا پہلا مرحلہ مکمل ہوا۔ او پی پی کی جانب سے مکانوں کی تعمیر کے لیے

دیے جانے والے حالیہ مشوروں کی تفصیل یہ ہے:

اورنگی میں ضرورت کے مطابق سی ٹو کی بنیاد پر دومنزلہ عمارت کا نقشہ۔

چھ انچ موٹے مشینی بلاک کی دیوار، جو چھت کا بوجھ اٹھا سکے۔

پٹّی اور سلیب کی چھت۔

پہلے سے ڈھالا ہوا زینہ۔

اس تعمیری تکنیک سے آر سی سی کے مقابلے میں ایک تہائی کے برابر لاگت آتی ہے۔

ہوا اور روشنی کی مناسب فراہمی۔

فلش لیٹرین اور زیرزمین پائپ لائن۔

فروری ۱۹۹۵ء تک ۱۲۶ نمونے کے تجرباتی مکان تعمیر ہو چکے تھے اور غریب باشندوں کی طرف سے مکانات تعمیر کرنے کی نئی درخواستیں بڑے پیمانے پر وصول ہو رہی تھیں۔

راج مزدوروں کی تربیت

راجوں کی تربیت، کلاسوں، جلسوں، ہدایت کے کتابچوں کی اشاعت، اشتہاروں کی تقسیم اور نگرانی پر او پی پی نے بہت وقت اور رقم خرچ کی۔ اب تک ۹۳ راجوں کی تربیت مکمل ہوئی ہے اور مزید زیرِ تربیت ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اورنگی میں راج مزدور اب بہتر تکنیکی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کو سطح کی پیمائش کی اہمیت کا احساس ہے، بنیاد کو خوب ٹھونک کر اس کا دباؤ برداشت کرنے کی قوت بڑھانے کے طریقوں سے آگاہی ہوئی ہے۔ اور وہ جان گئے ہیں کہ دیواروں کی بلاکوں سے چنائی کے وقت جوڑوں کو درست رکھنا اور زیرِ زمین پانی سے بنیاد کو بچانا کس قدر اہم ہے۔

نتیجہ

او پی پی نے پہلے اورنگی میں سینی ٹیشن کے نظام کو بہتر کیا، اس کے بعد ٹھلّے اور راج مزدوروں کی تکنیکی صلاحیت میں اضافے پر توجہ دی۔

او پی پی کے پاس اگر اور زیادہ وسائل ہوتے تو وہ ٹھلّے والوں کو قرض فراہم کرنے کی

صلاحیت میں اضافہ کرتی، اور راج مزدوروں کو ٹھیکے دار بنا دیتی۔

او پی پی نے جان بوجھ کر خود کو دلالوں سے دور رکھا، کیوں کہ وہ ہمارے حکمرانوں کے خفیہ ساتھی ہیں اور اس لیے بھی کہ ایک غیر سرکاری ادارے کے لیے یہ بات خطرے سے خالی نہیں کہ وہ ترقیاتی اداروں کے معاملات میں بےجا دخل دے، چاہے وہ ادارے سرکاری ہوں یا غیر سرکاری۔

صحت اور خاندانی منصوبہ بندی

اورنگی میں صحت کی خرابی کے دو اسباب

۱۹۸۴ء میں او پی پی نے کم آمدنی والی گھریلو عورتوں کو صحت کی بنیادی تعلیم اور ہدایت دینے کے لیے ایک آزمائشی منصوبہ شروع کیا۔ جنوری ۱۹۸۵ء میں اوڈی اے کی ڈاکٹر شیلا میکرا کے اصرار پر اس منصوبے میں خاندانی منصوبہ بندی کی تعلیم کو بھی شامل کر لیا گیا۔

ہمیں تحقیق سے پتا چلا کہ اورنگی میں بیماری کی بہت کثرت ہے۔ میعادی بخار، ملیریا، پیچش، دست، بدہضمی اور خارش عام ہے، لیکن خسرہ، ٹی بی اور پولیو بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ نوزائیدہ بچوں کی اموات کا تناسب دوسری جگہوں سے زیادہ ہے۔

بیماری کی موجودگی کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ اوّل، سینی ٹیشن کا نہ ہونا، کھلی ہوئی گندی نالیاں، اُن میں بہتا ہوا فُضلہ اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر جراثیم کی افزائش کا سبب تھے؛ یہ پانی اور کھانے کو آلودہ کرتے اور مچھر اور مکھیوں کی پیدائش میں معاون تھے۔ دوسری اہم وجہ پردہ نشیں، ناخواندہ یا نیم خواندہ عورتوں کی صحت کے اصولوں سے ناواقفیت تھی۔ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ جدید حفظانِ صحت کے اصول کیا ہیں، بیماری کیوں پھیلتی ہے اور اس سے بچاؤ کا کیا طریقہ ہے۔

اورنگی کے کم آمدنی والے خاندان جدید صحت کے اصولوں سے ناواقفیت اور جدید سینی ٹیشن کے نہ ہونے کی بہت بڑی قیمت ادا کر رہے تھے۔ بیماری کا علاج اورنگی ہی میں نہیں بلکہ کراچی کی دوسری بستیوں میں بھی بے حد مہنگا ہے۔ ایک بچے کے میعادی بخار کے علاج پر خاندان کی ایک ماہ کی آمدنی خرچ ہو جاتی ہے۔ اور اورنگی میں بچوں اور میعادی بخار دونوں کی کثرت تھی۔

ایک عجیب بات جو سروے سے ظاہر ہوئی یہ تھی کہ جہاں تک شفاخانوں کا تعلق ہے (نجی ڈاکٹر، ہومیو پیتھ، حکیم اور عطائی ڈاکٹر) اُن کی تعداد اورنگی کی کچی آبادی میں کراچی کی دوسری بستیوں سے زیادہ تھی۔ ایک نمونے کے سروے سے پتا چلا کہ ۵۰۰ خاندانوں کا، جن میں سروے کیا گیا، آمدنی کا بڑا حصہ "ڈاکٹروں" پر صرف ہوتا ہے۔ یہ عطائی ڈاکٹر اور ان کے شفاخانے اورنگی میں بیماری کا علاج کرنے کی سخت کوشش کرتے تھے اور لوگ اُن کو خوب پیسے دیتے تھے۔ لیکن دوسری طرف بیماری سے بچاؤ یا بیماری کے اسباب کو ختم کرنے کے لیے بہت کم کام ہو رہا تھا۔

او پی پی کے پروگرام نے پہلے تو جدید سینی ٹیشن کو متعارف کرایا اور پھر گھریلو عورتوں کو بیماری کی سائنسی وجوہات، ان کے پھیلنے کے اسباب اور ان سے بچاؤ کے طریقوں کی ضروری تعلیم دی۔

جدید سینی ٹیشن کو مقبول کرنے کی کوشش

جدید سینی ٹیشن کس طرح مقبول عام کیا گیا، یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ کچھ "ماہرین" کا خیال ہے کہ غریبوں کی بستیاں بغیر فلش لیٹرین اور زیرِزمین گندے پانی کی نالیوں کے گزارا کر سکتی ہیں۔ ان ماہروں کے نزدیک کونڈے والے پاخانے، سوک پِٹ اور کھلی گندے پانی کی نالیاں کچی آبادیوں کے باشندوں کے لیے مناسب ہیں۔ یقینی طور پر ان ماہروں کو معلوم ہے کہ انیسویں صدی میں انگریز کی ہندوستانی فوج میں اور لندن اور پیرس میں بیماری کی کثرت کو جدید سینی ٹیشن ہی کے ذریعے روکا گیا تھا۔ کیا ہم لوگ آج اپنے غریب لوگوں کو اس بات پر راضی کر سکتے ہیں کہ وہ تو قرونِ وسطیٰ کے سینی ٹیشن نظام میں زندگی گزار دیں اور ہم اشراف، جدید سینی ٹیشن کے نظام سے فیض اٹھائیں؟ کیا ہم واقعی ان سے کہہ سکتے ہیں کہ تم اپنی پسماندگی میں خوش رہو؟

ہم کو معلوم ہوا کہ اورنگی کے عوام اس بات سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ گندگی اور بیماری میں کیا تعلق ہے۔ اپنی صحت اور مکانوں کی بہتری کا خیال ان کے لیے اپنے خرچ پر، اپنی زیرِ نگرانی، سینی ٹیشن نظام تعمیر کرنے کا طاقتور محرک ثابت ہوا۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ گھریلو عورتوں کو گندگی کا اور زیادہ احساس تھا کیوں کہ بیماری کا بوجھ (مریض کی دیکھ بھال اور دوا کا خرچ)

ان پر پڑتا تھا۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ جہاں خاتونِ خانہ نے اپنے نارضامند خاوند کو مجبور کیا کہ وہ سینی ٹیشن نظام کی تعمیر کے لیے اپنا حصہ ادا کرے۔

بیماری کی پیشگی روک تھام کے تصوّر کو عام کرنے کی مشکلات

اورنگی کی ناخواندہ یا نیم خواندہ عورتیں دو معاملات میں ہماری آزاد پڑھی لکھی خواتین سے مختلف ہیں: ان خواتین کے برخلاف وہ بنیادی طور پر روایتی اور پردہ نشین ہیں۔

روایتی اندازِ فکر یہ ہے کہ بیماری ایک پُراسرار شے ہے یا پھر اُس کا تعلق ارواح سے ہے۔ اورنگی کی عورتیں بیماری میں یا تو ڈاکٹر کے پاس دوڑ کر جاتی ہیں یا کسی جھاڑ پھونک کرنے والے کے پاس یا پھر کسی مُردہ یا زندہ پیر کی امداد طلب کرتی ہیں، لیکن بیماری کے اصل سبب یا اس سے بچاؤ کے تصور سے ناواقف ہیں۔

عورتوں اور بچوں کے بارے میں روایتی تصور یہ ہے کہ عورتوں کو پردے میں رہنا چاہیے اور خاوند کو اُس کے نان نفقے کا کفیل ہونا چاہیے۔ بیوی کو اپنے خاوند کو مجازی خدا سمجھنا چاہیے۔ اس کا کام زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنا، اور یہ عقیدہ رکھنا ہے کہ رازق اللہ ہے۔

روایت پردہ عائد کرتی ہے اور پردہ روایت پرستی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ پردے کی وجہ سے نیم خواندہ اور ناخواندہ عورتوں تک تبدیلی کے عاملوں کی پہنچ ناممکن ہے۔ روایت پرستی اور پردے کا رواج دونوں مل کر انھیں تبدیلی کے عاملوں کو شک کی نظر سے دیکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

بےشک نئے معاشرتی اور معاشی تقاضوں اور شہری زندگی کے دباؤ کے باعث پردے کا رواج اور روایت پسندی رفتہ رفتہ کم یا ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اورنگی کی خواتین دوہری مشکل کا شکار ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کے لیے روایتی اندازِ فکر پر عمل مشکل ہوتا جا رہا ہے، لیکن جب وہ اپنا پُرانا انداز بدلتی ہیں تو ان کو گناہ کا شدید احساس ہوتا ہے۔

اس دوران، جب وہ ایک حالت سے دوسری حالت میں جا رہی ہوں، کسی بھی ایسے پروگرام کو جس میں نئے اندازِ فکر اور نئے عمل شامل ہوں، روایت کی پابند پردہ نشیں غریب عورتوں میں

مقبول کرنے کے لیے دو سوالوں کا سامنا کرنا ہو گا۔ پہلا یہ کہ ان عورتوں تک رسائی کیسے ہو؟ اور دوسرا یہ کہ ان کا اعتماد کیسے حاصل کیا جائے؟ ایسے پروگرام میں جہاں مشوروں اور ہدایات کے ساتھ رسد اور خدمات بھی شامل ہوں، ایک تیسرا سوال بھی پیدا ہوتا ہے: ان پردہ نشین روایت پسند عورتوں کے لیے آسان رسد کا نظام کس طرح وضع کیا جائے؟

اوپی پی خوش نصیب ہے کہ ایسے مخیر عطیہ دینے والوں کی مدد سے جو نئی راہ والی تحقیق کے حق میں ہیں، اس نے ان پریشان کن سوالات کے جواب دریافت کر لیے۔ اس تحقیق کی پوری کہانی تو اوپی پی کی سہ ماہی رپورٹ میں پڑھی جا سکتی ہے؛ یہاں میں چند نکتے پیش کرتا ہوں۔

پروگرام کے مفروضے

صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام حسب ذیل مفروضوں کی بنیاد پر شروع ہوا:

۱۔ پردہ نشیں عورتوں کے اندازِ فکر کے تبدیلی کے عمل میں سب سے بڑا مسئلہ تبدیلی کے باہری حامل کا ان سے رابطہ ہے۔ روایت کا تقاضا ہے کہ پردہ نشیں عورت گھر ہی میں رہے۔ وہ صرف انتہائی ضرورت کے وقت یا تقریب میں باہر نکلتی ہے۔

ہمیں معلوم ہوا کہ "ویلفیئر سنٹرز" (فلاحی مراکز) روایتی پردہ نشینی کی وجہ سے غیر موثر ہو گئے۔ یہ مراکز پردہ نشین عورتوں کے لیے اس وقت سودمند ہو سکتے ہیں جب کہ اُن کو صرف بیس یا تیس گلیوں کی ذمے داری دی جائے۔ اس کے معنی ہیں کہ اورنگی کی ۶۰۰۰ گلیوں کے لیے کم از کم ۲۰۰ سے ۳۰۰ مراکز خاندانی منصوبہ بندی کے لیے درکار ہوں گے۔

۲۔ ایک جگہ پر قائم مرکز یا شفاخانے کی جگہ اوپی پی نے گشتی تربیتی پروگرام شروع کیا جس کے عناصر یہ تھے: (الف) گشتی تربیتی ٹیم، (ب) ہر دس یا بیس گلیوں کے لیے چنی گئی کارکن خاتون یا کارکن خاندان، (ج) اس کارکن یا کارکن خاندان کے گھر پر پہلے سے طے کردہ وقت پر باقاعدہ میٹنگ اور (د) ہر محلے میں ہمدردوں کے ایک حلقے کی تشکیل۔

ہر گشتی ٹیم کو گاڑی دی گئی تھی اور اُس کی نگراں ایک لیڈی ڈاکٹر ہوتی تھی۔ یہ ٹیم اس آسانی کی وجہ سے دن میں ایک سے زیادہ میٹنگ میں شریک ہو سکتی تھی۔

۳- ابتدا میں یہ مناسب سمجھا گیا کہ خاندانی منصوبہ بندی کے لیے الگ میٹنگ ہو، کیوں کہ شروع میں یہ دیکھا گیا کہ صحت کے عام مسائل کے بارے میں ہونے والی میٹنگ میں بھی گو خواتین خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی تھیں لیکن بعض دوسرے لوگ یا تو اس کے مخالف تھے یا ان کو اس مسئلے سے دل چسپی نہیں تھی۔ یہ لوگ مذہبی اعتراضات کر کے ضرورت مند خواتین کو خاموش کر دیتے تھے۔ ہمارے ملک میں احتیاط بہادری کے طرزِ عمل کا بنیادی جز ہے، اس لیے ہم نے جنگ جُو مردوں سے جھگڑنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ ان کو ان کی بیویوں کے سپرد کر دیا۔

آگاہی

(الف) تنظیم:

۱- جیسا کہ شروع میں فرض کیا گیا تھا، سب سے اہم بات یہ تھی کہ پردہ نشین خواتین سے رابطہ پیدا کیا جائے۔ ایک سال کے تجربے سے معلوم ہوا کہ نہ صرف صحت کے امور سے واقفیت کی ضرورت موجود تھی بلکہ اس کا احساس بھی تھا۔ بڑی رکاوٹ تبدیلی کے محرکوں اور نئے طریقے اپنانے کے خواہش مندوں کے درمیان رابطے کی کمی تھی۔

۲- آپس میں اعتماد کا رشتہ قائم کرنا بھی رابطے کی طرح اہم تھا۔ اورنگی کی پردہ نشیں عورتوں کا اندازِ فکر صنعتی انقلاب سے پہلے والا تھا۔ اُن کو ذاتی تعلق اور ذاتی مشورے بے حد عزیز تھے۔

۳- اعتماد کا رشتہ قائم کرنے کے لیے تربیت دینے والی کارکنوں، محلّے کی سرگرم خاتون کارکن، محلّے کے ہمدرد گروپ اور پردہ نشیں عورتوں کے درمیان بار بار ملاقات کی ضرورت تھی۔

۴- محلّے کی سرگرم خاتون کارکن اس کام میں سب سے کارآمد رشتہ تھی۔ ایک ہمدرد پڑوسی کی حیثیت سے وہ خواتین کی قابلِ اعتماد مشیر اور معاون ثابت ہوتی تھی۔ وہ تربیتی اجلاس میں تربیت دینے والی ٹیم کا خیر مقدم کرتی اور ان کے ساتھ کام میں شرکت کرتی۔ یوں محلّے کی میٹنگ روایتی پردہ نشینی کے لیے کوئی بڑی للکار نہیں بنی۔

(ب) خاندانی منصوبہ بندی

۱- چھ ماہ بعد خاندانی منصوبہ بندی کا ذکر ان اجلاسوں میں عقیدے کے اعتبار سے غیر متنازعہ ہو گیا، اور خواتین ہی کے اصرار پر اس کا الگ اجلاس بلایا جانا ترک کر دیا گیا۔ اب عام اجلاسوں میں خاندانی منصوبہ بندی کا ذکر کھلے طور پر ہونے لگا۔

۲- پھر اس بات کی ضرورت ہوئی کہ مانعِ حمل اشیا کی رسد کا غیر مرکزی نظام قائم کیا جائے۔ مردوں کے لیے دواؤں کی دکانیں موجود تھیں۔ وہاں نقد قیمت لے کر یہ دوائیں فراہم کی جاتی تھیں۔ لیکن خواتین ان دکانوں پر پردے کی وجہ سے نہیں جا سکتی تھیں۔ اس لیے محلّے کی سرگرم کارکن ان کی نمائندہ بن گئی۔ وہ ان کی ہم راز پڑوسن تھی، اس لیے ان اشیا کی رسد کا ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوئی۔

آئی یو ڈی اور جراحی کی ذمے داری لیڈی ڈاکٹر اور صحت کی کارکنوں نے قبول کی۔

۳- تبدیلی کا سب سے بڑا محرک وہ عورتیں ثابت ہوئیں جو کامیاب آئی یو ڈی یا جراحی کروا چکی تھیں۔ وہ اپنے پڑوس میں پُرجوش انداز میں خاندانی منصوبہ بندی کی وکالت کرتی تھیں۔

ترمیم شدہ ماڈل: ۱۹۹۱ء

او پی پی کا بنیادی صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کی تعلیم اور سہولتوں کا پروگرام ابتدا میں ۳۰۰۰ خاندانوں تک محدود تھا تاکہ تجربے سے پردہ نشیں عورتوں کے ردعمل کا مطالعہ کیا جا سکے۔ اس مطالعے سے کئی اہم باتیں معلوم ہوئیں: اُن تک کیسے رسائی ہو، اعتماد کا رشتہ کیسے قائم کیا جائے، مانعِ حمل اشیا کی رسد کا نظام کیوں کر قائم کیا جائے، اور خاندانی منصوبہ بندی اور بیماری سے بچاؤ سے متعلق تعلیم اور تربیت کا دائرہ روایت پسند پردہ نشیں عورتوں میں کیسے وسیع کیا جائے۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ عورتوں کے بڑے حلقے تک اس پروگرام کو کیسے پہنچایا جائے۔

۱۹۹۱ء کے تجزیے کی بنا پر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ گشتی کارکن خواتین کی ٹیم اور سرگرم خاتون کے گھر پر گروپ کا اجلاس بہت کارآمد طریقے ہیں۔ آغا خان میڈیکل یونیورسٹی کی ڈاکٹر فوزیہ کے کیے ہوئے سروے کی رپورٹ کے مطابق نمونے کے ۳۰۰۰ خاندانوں میں ۹۰

فیصد بچوں کو موذی بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے لگائے گئے ہیں، ۴۴ فیصد خاندان خاندانی منصوبہ بندی کے اصول اپنا رہے ہیں۔ وبائی امراض قابو میں ہیں اور جدید حفظانِ صحت کے اصولوں کو اپنانے سے عورتوں اور بچوں کی صحت پہلے سے بہتر ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح فلش لیٹرین اور زیرِزمین گندے پانی کی نکاسی سے باہری حالت تبدیلی ہوئی ہے، اِسی طرح جدید حفظانِ صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کی تعلیم سے ۳۰۰ خاندانوں کی ذہنی فکر میں تبدیلی آئی ہے۔ ہمارے لیے سودمند ہوگا اگر ہم ان خاندانوں کی ذہنی کیفیت اور طریقوں کا موازنہ اُن خاندانوں کی ذہنی کیفیت اور طریقوں سے کریں جہاں سینی ٹیشن اور صحت کی تعلیم کا نظام نہیں ہے۔

اپنے تجربے کی بنا پر ہم نے اپنے نمونے میں تبدیلی کی تاکہ ہمیں زیادہ خاندانوں تک رسائی حاصل ہو۔ بجائے اس کے کہ ہم اُنہی خاندانوں سے طویل عرصے تک بار بار رابطہ کریں، ہم نے چھ ماہی تعلیم کا نصاب تیار کیا جس میں اورنگی میں بیماری سے بچاؤ، خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں، جدید حفظانِ صحت کے اصولوں، بہتر غذا اور گھروں میں ترکاریاں اگانے کے موضوعات پر تربیت دی جائے۔

ہر چھ ماہ بعد ۲۰ گھریلو کارکن خواتین کا انتخاب کیا جاتا ہے اور ان کے گھر پر ان کے محلے کی عورتوں کے لیے ہفتہ وار تربیتی جلسے کیے جاتے ہیں۔

دوسری تبدیلی

۱۹۹۴ء تک ہم کو معلوم ہوا کہ ہزاروں باقاعدہ اجلاسوں کی وجہ سے صحت اور صفائی ستھرائی کے اصولوں سے واقفیت خاصی عام ہوئی ہے۔ اورنگی کی گھریلو عورتیں اب پوری طرح آمادہ تھیں کہ بچوں کو موذی بیماری سے بچاؤ کے ٹیکوں، مانعِ حمل اشیا اور دوسری خدمات کے اخراجات خوشی سے برداشت کریں۔ ایک سروے سے معلوم ہوا کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر اورنگی میں ۶۴۶ نئے نجی شفاخانے کھل گئے ہیں۔ یہ تعداد مکانوں کی تعمیر کی سہولتیں بہم پہچانے والے ۲۰۰ نجی ٹھلوں، اور بچوں کی تعلیم کے لیے قائم کیے گئے ۵۰۹ اسکولوں کے مقابلے میں نہایت

مناسب ہے۔ یہ ایک قائم رہنے والی ترقی کی رفتار کا پیش خیمہ ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے او پی پی تھلوں اور اسکولوں کی کارکردگی بہتر کرنے کی کوشش کر رہی ہے، اس نے نجی شفاخانوں کو ترقی دینے کا بھی اقدام کیا۔ آئندہ کوشش کی جائے گی کہ ان شفاخانوں میں تربیت کا انتظام کیا جائے تاکہ ٹیکے لگانے والے، دائیاں، مددگار کارکن اور ڈاکٹر بہتر تربیت حاصل کریں اور ان شفاخانوں میں حفاظتی ٹیکوں اور مانع حمل اشیا کی رسد بہتر بنائی جائے اور ان کو جدید آلات کی خریداری اور عمارت کو بہتر کرنے کے لیے قرض فراہم کیا جائے۔

ایک تقابل

نومبر ۱۹۹۱ء میں ایک تقابلی سروے کیا گیا جس میں اورنگی کے ۱۶۵ خاندان اور ٹھکری کے ۱۶۵ خاندان شامل تھے۔ اورنگی کے خاندانوں کو جدید سینی ٹیشن اور تعلیم کی سہولت حاصل تھی، ٹھکری کے خاندان ان سہولیات سے محروم تھے۔ دونوں کی حالت میں فرق بےحد نمایاں تھا:

	اورنگی ٪	ٹھکری ٪
۱۔ بیماری سے بچاؤ	85.6	8.9
۲۔ نمکول (او آر ایس) کا استعمال	91.5	8.4
۳۔ خاندانی منصوبہ بندی کا استعمال	53.9	6.6
۴۔ نوزائیدہ بچوں کی اموات	1	5.1
۵۔ پچھلے تین ماہ میں بیماری کا تناسب	1	2.3
۶۔ تین ماہ میں بیماری پر خرچ	12.674روپے	73.713روپے
۷۔ بیماری سے بچاؤ کے ٹیکے	88.6	41.5

۴ اور ۵ میں اورنگی اور ٹھکری کے اعدادوشمار کو باہمی تناسب کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس طرح اورنگی کے مقابلے میں ٹھکری میں بچوں کی اموات کا تناسب ۵.۱ گنا اور بیماری کا تناسب ۲.۳ گنا ہے۔

اورنگی کے اسکول

نومبر ۱۹۸۹ء میں ایک سروے کیا گیا جس سے یہ معلوم ہوا کہ اورنگی میں ۱۱۰ محلے، ۶۳۴۷ گلیاں اور ۹۴۱۲۲ مکانات ہیں۔

ایک دوسرے سروے سے پتا چلا کہ یہاں ۲۰۳ پری پرائمری اسکول، ۲۶۱ پرائمری اسکول اور ۱۲۱ سیکنڈری اسکول ہیں۔ ان سب اسکولوں میں حکومت کے منظور شدہ شدہ نصاب کی مدد سے باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ ان اسکولوں کے علاوہ دینی مدرسے اور غیر نصابی تعلیمی مراکز اور تکنیکی انسٹی ٹیوٹ بھی موجود ہیں۔ ان کی صحیح تعداد کا تعین نہیں کیا گیا، لیکن اندازاً ان کی تعداد کئی سو ہوگی۔

سرکاری اور نجی اسکول

کل ۵۸۵ تسلیم شدہ اسکولوں میں سرکاری اسکولوں کی بہت کم تعداد ہے، باقی تمام اسکول نجی ادارے چلاتے ہیں۔

اسکول	سرکاری	٪	نجی	٪
پری پرائمری	0	0	203	100٪
پرائمری	56	21.5%	205	78.5%
سیکنڈری	20	16.5%	101	83.5%
کل تعداد	76	11.0%	509	89.0%

ان اعدادوشمار سے عیاں ہے کہ اورنگی کے کم آمدنی والے لوگوں کو ہماری مہربان حکومت نے صرف ۱۱ فیصد سرکاری اسکول دیے ہیں جب کہ انھوں نے خود اپنے خرچ پر ۸۹

فیصد تسلیم شدہ اسکول قائم کیے ہیں۔ اور سیکڑوں دینی مدرسے، ٹیوشن کے مراکز اور تکنیکی تعلیم کے مراکز ان کے علاوہ ہیں۔ تعلیم کے میدان میں نجی شعبے کی فعالیت اُس صورتِ حال سے ملتی جلتی ہے جو مکانوں کی تعمیر اور صحت اور روزگار کی سہولتوں کی فراہمی کے سلسلے میں سامنے آئی۔

اسکولوں کے طلبا

آئیے، اب ان ۵۸۵ تسلیم شدہ اسکولوں کے طالب علموں پر نظر ڈالیں۔

اسکول	کل تعداد	سرکاری	%	نجی	%
پری پرائمری	5,602	0	0	5,602	100%
پرائمری	46,049	16,787	39.9%	25,262	59.1%
سیکنڈری	32,940	9,473	28.7%	23,467	71.3%
کل	80,591	26,620	32.5%	54,331	67.5%

ہم کو یہ بات پوری طرح معلوم نہیں کہ اورنگی کے کتنے بچے تسلیم شدہ اور غیر تسلیم شدہ اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں لیکن یہ بات بالکل عیاں ہے کہ یہ لوگ نجی اسکولوں کی فیس دینے پر آمادہ ہیں۔ اسی وجہ سے وہ اسکول کامیابی سے چل رہے ہیں۔

اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی خواہش بہاریوں اور مہاجروں میں زیادہ نمایاں ہے کیوں کہ وہ یہاں آنے سے پہلے شہری پس منظر رکھتے تھے، لیکن اب دیہات سے ہجرت کر کے آنے والے بھی اس خواہش کو اپنا رہے ہیں۔ اسکولوں کا گھروں کے قریب پڑوس میں ہونا اس خواہش کو مزید تقویت دیتا ہے۔

طالب علم لڑکے اور لڑکیاں

اورنگی کے کم آمدنی والے باشندے اپنی لڑکیوں کو بھی لڑکوں کی طرح اسکولوں میں تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔

اعدادوشمار کے حسبِ ذیل گوشواروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تسلیم شدہ اسکولوں میں پڑھنے

والے لڑکوں اور لڑکیوں کا تناسب بالترتیب ۵۴ اور ۴۵ فیصد ہے۔ بچیوں کو تعلیم دلانے کا یہ نیا روّیہ اورنگی میں ایک نئے معاشرتی اور معاشی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔

	اسکول	طالب علم	لڑکے	%	لڑکیاں	%
پری پرائمری	203	5,602	2,905	51.85%	2,697	48.14%
پرائمری	261	42,049	22,896	54.45%	19,153	45.54%
سیکنڈری	121	32,940	18,491	56.83%	14,449	43.74%
کل	585	80,591	44,292	54.95%	36,299	45.04%

مرد اور خواتین اساتذہ

مرد اور خواتین جو معلّم کی حیثیت سے تسلیم شدہ اسکولوں میں ملازم ہیں:

	اسکول	معلّم	مرد	فیصد	خاتون	فیصد
پری پرائمری	203	253	10	3.95%	243	96.05%
پرائمری	261	980	362	36.9%	618	63.06%
سیکنڈری	121	1156	371	32.1%	785	67.9%
کل	585	2389	743	31.1%	1646	68.9%

اس جدول سے یہ معلوم ہوا کہ اورنگی میں اسکول ۲۳۸۹ اساتذہ کو روزگار فراہم کرتے ہیں۔ یہ تعداد صرف اساتذہ کی ہے، معاون عملہ اس کے علاوہ ہے۔ ہمارے خیال میں یہ تعداد خاصی اطمینان بخش ہے۔

ان اعدادوشمار سے جو حیرت انگیز نتیجہ نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ اساتذہ میں خواتین ۶۹ فیصد اور مرد ۳۱ فیصد ہیں۔ اور یہ بھی کہ سرکاری اسکولوں کے مقابلے میں نجی اسکولوں میں خواتین اساتذہ زیادہ ہیں۔

نجی	اسکول	اساتذہ	مرد	فیصد	خواتین	فیصد
پری پرائمری	203	253	10	3.95%	243	96.0%
پرائمری	205	644	204	31.7%	440	68.32%
سیکنڈری	101	921	243	26.4%	678	73.62%
کل	509	1818	457	25.1%	1361	74.86%

یہ کل اسکولوں کی تعداد کا ۷۵ فیصد ہے، ثانوی اسکولوں میں بھی ۷۴ فیصد ہے۔

سرکاری اسکولوں کا تناسب یہ ہے:

سرکاری	اسکول	اساتذہ	مرد	فیصد	خواتین	فیصد
پری پرائمری	0	0	0	0	0	0
پرائمری	56	336	158	47.2%	187	52.98%
سیکنڈری	20	235	128	54.5%	107	45.53%
کل	76	571	286	50.1%	285	49.91%

خواتین اساتذہ کی اہمیت

یہ امر کہ اورنگی میں خواتین اساتذہ کی تعداد زیادہ ہے، دوہری اہمیت رکھتا ہے۔

۱۔ خواتین اساتذہ کم تنخواہ لینے پر آمادہ ہو جاتی ہیں، اس وجہ سے نجی اسکول کے نگرانوں کے لیے خود کفیل اسکول کو، بغیر کسی بیرونی امداد کے، کم فیس لے کر چلانا ممکن ہے۔ یقینی بات یہ ہے کہ اورنگی کے نجی اسکول خواتین اساتذہ کی مالی قربانی کی وجہ سے چل رہے ہیں، اُسی طرح جیسے سلائی کے مراکز اور قالین بافی کے اڈے، جو کروڑوں روپے کا زرِ مبادلہ ملک میں لاتے ہیں، خواتین کارکنوں کی کم خرچ محنت کا ثمر ہیں۔

۲۔ خواتین اساتذہ کی اتنی بڑی تعداد میں موجودگی نے قدامت پسند مسلم معاشرے میں لڑکیوں کو اسکول میں تعلیم دلانے کے سلسلے میں پائے جانے والے فطری تذبذب کو بڑی حد تک

کم کیا ہے۔

علیحدہ اور مخلوط اسکول

روایتی تذبذب کی عدم موجودگی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اورنگی کے اسکولوں کے طلبا میں ۴۵ فیصد لڑکیاں ہیں۔ اورنگی میں والدین اب اپنی بچیوں کے لیے الگ اسکول کا مطالبہ نہیں کرتے، کیوں کہ سیکنڈری تک کی سطح کے زیادہ تر اسکول مخلوط ہیں۔

علیحدہ	سرکاری	نجی
پری پرائمری (لڑکیوں کے لیے)	0	9
پری پرائمری (لڑکوں کے لیے)	0	10
پرائمری (لڑکیوں کے لیے)	14	9
پرائمری (لڑکوں کے لیے)	13	12
سیکنڈری (لڑکیوں کے لیے)	5	14
سیکنڈری (لڑکوں کے لیے)	13	12
کل	45	66

مخلوط	سرکاری	نجی
پری پرائمری	0	184
پرائمری	29	184
سیکنڈری	2	75
کل	31	443

علیحدہ اور مخلوط اسکولوں کا فیصد تناسب

	سرکاری اسکول		نجی اسکول	
	علیحدہ	مخلوط	علیحدہ	مخلوط
پری پرائمری	0	0	9.3%	90.7%
پرائمری	48.2%	51.8%	1.2%	89.8%
سیکنڈری	90%	10%	25.7%	84.3%
کل	59.2%	39.2%	12.9%	87.1%

اورنگی کی اُستانیاں

اورنگی کی اُستانیاں کم تنخواہ لے کر محنت سے کام کرتی ہیں۔ اُن کی طلبا سے ہم دردی اور نرم مزاجی کو دیکھ کر تعریف کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ اُن میں سے زیادہ تر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہیں، زیادہ بڑی ڈگری اور تدریس کی تربیت کی خواہاں ہیں۔

ان کا اسکولوں میں کام، ان کی تعلیم کی خواہش، طلبا کی اچھی رہنمائی اور اپنی ذاتی آمدنی، ان کو نیا اعتماد اور آزاد حیثیت بخشتی ہے۔ وہ اپنے کم جارحانہ، کم نمائشی، مہذب اور نرم، آزاد رویے کی وجہ سے ایک قدامت پسند ماحول میں قابلِ قبول ہیں۔

پردہ نشینی کے قدیم رواج نے ایک پسماندگی کا دائرہ کھینچ دیا تھا: تعلیم یافتہ لڑکیاں کم تھیں، جس کے باعث خواتین اُستانیاں کم تھیں، زنانہ اسکول کم تھے، مخلوط تعلیم کا وجود نہ تھا، ان سب کے نتیجے میں عورتوں میں خواندگی کی کمی تھی۔ اب نئے رویے نے ایک ترقی کا دائرہ بنایا ہے: بہت ساری پڑھی لکھی لڑکیاں، زیادہ اُستانیاں، زیادہ مخلوط اسکول اور خواندگی میں مسلسل اضافہ۔ اورنگی اسکولوں میں استانیوں کی بڑی تعداد والدین کو اس بات پر آمادہ کر رہی ہے کہ اپنی بیٹیوں کو اسکول میں تعلیم دلائیں، اس صورت میں کہ اسکولوں میں استانیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے، لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ کا خوف بہت کم ہو گیا ہے۔

لڑکیوں میں خواندگی بڑھانے کا بہتر طریقہ علیحدہ اسکول نہیں بلکہ ایسا مخلوط اسکول ہے جس

میں اُستانیاں زیادہ ہوں۔ اس طرح اورنگی کی استانیوں نے لڑکیوں کو تعلیم دلوانے میں حائل دوہری پریشانی کا حل دریافت کر لیا ہے۔

نجی اسکولوں میں فیس کی سطح (۱۹۹۰ء)

۲۴۲ اسکولوں کے ایک سروے میں یہ معلوم ہوا کہ وہاں فیس کی سطح یہ ہے:

فیس	پری پرائمری	پرائمری	سیکنڈری	کل
10-20	2	17	3	22
21-30	72	23	95	190
31-40	1	34	51	86
40سے زیادہ	3	12	24	39

زیادہ تر اسکولوں میں فیس دس سے چالیس روپے ماہوار تک ہے۔ اگر کسی خاندان کے ایک سے زیادہ طالب علم ہوں تو ان کی فیس میں کمی کر دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سی رعایتیں ہیں اور لین دین میں لچک پائی جاتی ہے۔

سالانہ بجٹ

نجی اسکول		سرکاری اسکول	
ابتدائی 332 طالب علم		ابتدائی 230 طالب علم	
عملہ			
10اُستاد	48,000روپے	9اُستاد	1,68روپے
1چپراسی	4,800روپے	1چپراسی	14,400روپے
1آیا	7,800روپے		
1موٹرڈرائیور	9,600روپے		
	70,200روپے		1,82,400روپے

متفرق اخراجات 32,000 روپے	20,000
میزان کل 1,02,400 روپے	2,02,400 روپے
فی طالب علم خرچ 308 روپے	880 روپے

اخراجات کے اس موازنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نجی اسکول سرکاری اسکولوں کے مقابلے میں زیادہ کفایت سے چلائے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ اُن کا انتظام بہتر ہے۔ سرکاری اسکولوں کی عمارتیں مرمت طلب ہیں اور ان میں سفیدی اور صفائی کی ضرورت ہے۔ شاید اس خرابی کی وجہ انتظامی مرکزیت ہے۔

نجی اسکولوں کی مرحلہ وار ترقی

نجی اسکولوں کے قیام کا سلسلہ اورنگی میں پندرہ سال پہلے شروع ہوا۔ ان اسکولوں میں جو پرانے ہیں، وہ خوش حال ہو گئے ہیں اور ان کے اثاثوں میں اضافہ ہوا ہے، مگر یہ ترقی سال بہ سال مرحلہ وار ہوئی ہے۔ معین صدیقی صاحب سے حسبِ ذیل گفتگو نجی اسکولوں کے فروغ کے بارے میں ایک مثالی تحقیق سمجھی جا سکتی ہے۔

جناب معین صدیقی "المعین سوسائٹی" کے بانی ہیں، جس کے تحت سیکٹر ۱۳ ایف اورنگی میں "یوریشیا پبلک اسکول" چل رہا ہے۔ اس اسکول میں ۸۳۰ طالب علم (۴۳۰ لڑکے اور ۴۰۰ لڑکیاں) ہیں اور ۲۵ اساتذہ ہیں: ۲ مرد اور ۲۳ خواتین۔ ان اساتذہ میں سے ۲۰ نے تدریس کے شعبے میں باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے۔ جناب معین صدیقی کا کہنا ہے:

> "میں ایک سرکاری دفتر میں ملازمت کرتا تھا اور اُس وقت میرا اسکول چلانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن میں تیسرے پہر تک کام سے فارغ ہو جاتا تھا، اس لیے میں نے ۱۹۷۷ء میں ایک ٹیوشن سنٹر قائم

کیا۔ اس زمانے میں اورنگی میں صرف ایک پرائمری اسکول تھا جس میں بچوں کو بمشکل داخلہ ملتا تھا۔ میرے ٹیوشن سنٹر کے اوقاتِ کار ۳ بجے شام سے ۱۰ بجے رات تک تھے۔ میں نے ۵ روپے ماہوار فی طالب فیس مقرر کر کے پڑوس سے پانچ بچوں کو داخل کر لیا۔ مجھے حیرت ہوئی جب پہلے ہی مہینے میں طلبا کی تعداد بڑھ کر ایک سو تک پہنچ گئی۔ پھر میں نے دو معلّم ملازم رکھے، ایک مرد اور ایک خاتون۔ مجھے خاتون کو اس لیے رکھنا پڑا کیوں کہ طلبا میں کافی تعداد لڑکیوں کی تھی۔ جیسے جیسے طلبا کی تعداد بڑھی میں نے فیصلہ کیا کہ ایک باقاعدہ اسکول قائم کروں۔"

"۱۹۷۷ء میں ہمارے علاقے میں منشیات کا ایک اڈا تھا۔ اُن لوگوں نے یہ سوچا کہ اگر محلّے میں تعلیم عام ہو گئی تو یہ اڈا چلانا مشکل ہو جائے گا۔ منشیات کے بیوپاریوں نے ہمارے اسکول کی مخالفت کی اور ہم کو دھمکیاں دیں۔ میری ان سے دو بار مار کٹائی ہوئی اور مجھے اندازہ ہوا کہ پولیس والے عام طور پر منشیات کے بیوپاریوں کے ہم درد ہیں۔ لیکن میری خوش قسمتی سے کچھ محلّے والوں نے میرا ساتھ دیا اور ہمارا باقاعدہ اسکول قائم ہو گیا۔

"ہم نے اس نئے اسکول کے لیے مسجد کمیٹی سے چند کمرے کرائے پر لے لیے۔ منشیات کے بیوپاریوں نے مسجد کمیٹی پر دباؤ ڈالا کہ وہ ہم کو اپنی عمارت سے نکال دیں۔ لیکن محلّے والے پھر ہماری مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اسکول چلتا رہا۔ بعد میں محلّے والوں نے مجھے مسجد کمیٹی کا صدر چُن لیا۔

"اب ہمارے محلّے میں سینی ٹیشن کا مناسب نظام ہے، پانی بھی مل رہا ہے اور بچّے اسکول میں خوش خوش تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔"

ایک نئے سیکٹر میں ایک نئے اسکول کی ابتدا (۱۹۹۰ء)

مرحلہ وار ترقی کرنے کا یہی طریقہ، جو "یوریشیا پبلک اسکول" نے ۱۹۷۷ء میں سیکٹر ۱۳ ایف میں اپنایا تھا، اب "دانش پبلک اسکول" نے ۱۹۸۶ء میں منصور نگر میں اپنایا ہے۔ منصور نگر، جو اورنگی کا ایک نیا سیکٹر ہے، اُنہی مشکلات سے دوچار ہے جس سے پُرانے سیکٹر نبرد آزما رہے تھے: پانی کی کمی، سڑکوں اور ٹرانسپورٹ کے ذرائع کا عدم وجود۔ اور منصور نگر کے باسی بھی اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی ویسی ہی سرگرمی سے کوشش کر رہے ہیں اور اُسی طرح نجی اسکولوں سے تعاون کر رہے ہیں۔

زینت عملی میدان میں آنے والی ایک خاتون ہیں جنھوں نے "دانش پبلک اسکول" قائم کیا۔ اُن کی کہانی یہ ہے:

> "میں نے ۱۹۸۳ء میں سائنس کے مضامین کے ساتھ میٹرک کیا اور ۱۹۵۸ء میں ایف ایس سی۔ جب میں نویں جماعت میں تھی تو میں نے اپنے گھر میں ایک ٹیوشن سنٹر قائم کیا۔ میرے اساتذہ نے میری ہمت بڑھائی تاکہ میں ایک اچھی معلّم بن جاؤں۔ میں نے ۱۹۷۷ء میں سیکٹر ساڑھے گیارہ میں ایک اسکول شروع کیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد میں منصور نگر منتقل ہو گئی۔ یہاں کوئی اسکول نہیں تھا۔ ہم نے یہاں پانچ کمروں والی ایک عمارت ۵۰۰ روپے ماہوار کرائے پر حاصل کر لی اور اسکول شروع کیا۔ اب ہمارے اسکول میں ۱۷۵ طالب علم اور ۵ استاد ہیں۔ یہاں نرسری اور کے جی کی فیس ۲۰ روپے ماہوار اور پرائمری کی فیس ۲۵ سے ۳۰ روپے ماہوار ہے۔ والدین نے ہم سے ہر طرح تعاون کیا اور ہماری مدد کی۔ یہاں اور بہت سے اسکولوں کی ضرورت ہے۔ تمام خاندان محنتی اور جفاکش ہیں۔ اُن کے گھروں کے اندر کارخانے ہیں اور پورا خاندان کام میں ہاتھ بٹاتا ہے۔"

اورنگی کے نجی اسکولوں کی دشواریاں اور آسانیاں

اورنگی کے نجی اسکولوں کی دشواریاں تو بالکل عیاں ہیں:

۱۔ عمارتیں معیار سے گری ہوئی ہیں۔

۲۔ اساتذہ کو بے حد کم تنخواہ ملتی ہے۔

۳۔ زیادہ تر اُستاد غیر تربیت یافتہ ہیں۔

۴۔ لائبریریاں، سمعی اور بصری آلات اور کمپیوٹر نہیں ہیں۔

۵۔ کھیل کے میدان مفقود ہیں۔

لیکن ان اسکولوں کی آسانیاں بھی ظاہر ہیں:

۱۔ نجی اسکول کا محلّے والوں سے قریبی رشتہ ہے۔ اُن کو محلّے والوں کی مالی اور اخلاقی مدد ہمہ وقت دستیاب ہے۔

۲۔ اپنی بقا کے لیے نجی اسکولوں کے نگراں محلّے کی امداد پر بھروسا کرتے ہیں، اس لیے وہ سرکاری اسکولوں کے نگرانوں کے برخلاف والدین کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

۳۔ نجی اسکولوں کو اپنی بقا کے لیے مسلسل مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس لیے ان کے نگراں عمارت کی دیکھ بھال اور نصاب کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔

۴۔ نجی اسکولوں کی کارکردگی کا اندازہ والدین اپنے بچوں کی امتحان میں کامیابی سے لگاتے ہیں، اس لیے اساتذہ کو طلبا کو محنت سے پڑھانا پڑتا ہے۔

۵۔ کلاسوں میں بچوں کی تعداد کم ہوتی ہے اور استاد ان کو بہتر انداز میں پڑھاتے ہیں۔ سرکاری اسکولوں میں ایسا نہیں ہوتا۔

۶۔ نجی اسکولوں کی سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ وہ آزاد ماحول میں مقابلہ کر کے ترقی کر سکتے ہیں۔

سرکاری اسکول	تعداد	طالب علم	فی اسکول اوسط
پرائمری	56	16,787	299
سیکنڈری	20	9,473	473

نجی اسکول	تعداد	طالب علم	فی اسکول اوسط
پرائمری	205	25,262	123
سیکنڈری	101	23,467	232

او پی پی کا تعلیمی منصوبہ

او پی پی کی کوشش رہی ہے کہ معاشرتی اور تکنیکی مشورے فراہم کرکے اورنگی کے لوگوں کے اُس کام کو بہتر کرے جو وہ مکانوں کی تعمیر، سینی ٹیشن یا عورتوں کے سلائی مراکز کے سلسلے میں اپنی مدد آپ کے اصول پر خود کر رہے ہیں۔

۱۹۸۷ء میں آغاخان فاؤنڈیشن کی امداد سے او پی پی نے ایک تعلیمی منصوبہ شروع کیا جس کا مقصد اسکولوں کے تعلیمی معیار اور عمارتوں کی حالت کو بہتر کرنا تھا۔ اس منصوبے کے تحت عمارت کی بہتری کے لیے اورنگی ٹرسٹ کے توسط سے قرض اور سینی ٹیشن اور مکانوں کی تعمیر کے پروگرام کی جانب سے تکنیکی فراہم کیا جاتا تھا۔ تعلیم کے معیار کو بہتر کرنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقے تجویز کیے گئے تھے:

۱۔ اساتذہ کی تربیت

۲۔ لائبریری کا قیام

۳۔ سمعی اور بصری آلات کی فراہمی، اور

۴۔ مشوروں کے کتابچوں اور دستورالعمل کی تیاری اور اشاعت۔

آغاخان فاؤنڈیشن نے اپنی امداد ۱۹۹۰ء میں بند کردی اور اس کے بعد او پی پی نے بغیر کسی اضافی عملے کے اسکولوں کی امداد کا پرگرام اپنے طور پر جاری رکھا۔

۱۔ فروری ۱۹۹۵ء تک اسکولوں کو ۹۴ قرضے دیے گئے۔ ان قرضوں کی کل رقم ۲۷ لاکھ ۹۰ ہزار روپے تھی جس میں اب تک ۱۷ لاکھ روپے واپس آچکے ہیں۔

۲۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے اپنے کئی مراکز اورنگی میں قائم کیے، جن میں بہت سے اساتذہ تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ ان اساتذہ نے تربیت حاصل کرنے کے لیے او پی پی سے

قرض لیا ہے۔

۳۔ برٹش کاؤنسل، انگریزی تعلیم کے لیے اورنگی میں اساتذہ کی تربیت کے کورس چلا رہی ہے۔

۴۔ تیس اسکولوں میں کمپیوٹر کی کلاسیں جاری ہیں جن کا انتظام ٹی وی او کی مالی امداد سے او پی پی کی زیرِ نگرانی ہوا ہے۔

۵۔ بہت سے اورنگی کے اسکولوں نے مل کر امدادِ باہمی کی ایک انجمن رجسٹر کروا کر آپس میں قریبی تعاون شروع کیا ہے۔

عورتوں کے سلائی مراکز

بنیادی تحقیق

عورتوں کے سلائی مراکز کا پروگرام مارچ ۱۹۸۴ء میں شروع ہوا۔ پانچ سال کی مسلسل کوشش سے یہ پروگرام مالی اور انتظامی لحاظ سے خود کفیل ہو گیا۔ ان پانچ برسوں کی جدوجہد اور ترقی کی کہانی اُس کتابچے میں بیان کی گئی ہے جو او پی پی کی تین ماہانہ رپورٹوں نمبر ۱۸ سے ۳۹ کا خلاصہ ہے۔ اس کتابچے کا دوسرا باب پروگرام کے مقاصد اور اختیار کردہ طریقوں پر اور ابتدا میں پیش آنے والی دشواریوں اور ناکامیوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ تیسرا باب پروگرام کے مضبوط بنیادوں پر استوار ہونے اور پھیلنے کے مرحلوں سے متعلق ہے، اور اس کے علاوہ ان مسائل اور دشواریوں کا حال بیان کرتا ہے جو دوسرے اور تیسرے سال میں سامنے آئیں۔ چوتھا باب بیان کرتا ہے کہ کس طرح یہ پروگرام چوتھے اور پانچویں سال میں خود کفالت کی طرف گامزن ہوا، اور پانچویں باب میں موجودہ حالت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جب کہ یہ پروگرام پوری طرح خود کفیل اور نفع بخش ہو چکا ہے۔

او پی پی کو معاشی پروگرام چلانے کی اہمیت کا شروع ہی سے احساس تھا، لیکن بنارسی سلک کے کاریگروں کی بحالی کے سلسلے میں ہماری پہلی کوشش بُری طرح ناکام ہوئی کیوں کہ اُس وقت تک ہم اورنگی اور اس کے باسیوں سے پوری طرح واقف نہیں ہوئے تھے۔ سینی ٹیشن پروگرام نے ہم کو اورنگی کے باشندوں کے معاشرتی اور نفسیاتی عوامل سے آگاہ کیا، اور ۱۹۸۴ء میں ہم نے دوبارہ فیصلہ کیا کہ معاشی میدان میں نمونے کے ادارے قائم کرنے پر تحقیق کی جائے۔

اس دفعہ ہم نے بڑی احتیاط سے پہلے مارکیٹ کا سروے کیا۔ ہم کو اندازہ ہوا کہ قدیم پدرانہ نظام، جس میں پورے خاندان کی کفالت کا باپ ذمے دار ہوتا تھا، ٹوٹ پھوٹ رہا ہے کیوں کہ مہنگائی اور روزگار کے مواقع کی بے یقینی نے اس کے برقرار رہنے کو مشکل بنا دیا ہے۔ چناں چہ اورنگی میں بیویوں اور بیٹیوں کو کام میں حصہ لینا پڑا تا کہ خاندان کی آمدنی میں اضافہ ہو۔ ہم کو یہ

بات یقینی طور پر معلوم ہوئی کہ اورنگی کی بستی سستے مزدور بچوں اور عورتوں کا سب سے بڑا مرکز ہے، اور یہاں ہزاروں بچے اور عورتیں قابلِ فروخت سامان تیار کرنے میں مصروف ہیں لیکن ان کی مزدوری بہت کم ہے اور کام کے حالات بہت سخت۔

ہم نے شروع میں سوشل ویلفیئر کے تحت چلائے جانے والے "انڈسٹریل ہومز" کا غور سے مطالعہ کیا جہاں بچیوں کو سلائی اور کڑھائی کی تربیت دی جاتی ہے۔ ہمیں بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ ان کی افادیت محدود ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ نئے ہنر سکھانے یا ان کو اورنگی میں متعارف کرانے سے بہتر یہ ہوگا کہ اُن عورتوں کی امداد کی جائے جو پہلے سے مارکیٹ کے لیے سامان تیار کر رہی ہیں۔ ہمیں ان کو معاشرتی اور تکنیکی مشوروں کے ذریعے وہ تعلیم دینی چاہیے جس سے وہ اپنے مفادات کی حفاظت کر سکیں اور اپنی پیداواری اور انتظامی صلاحیت بڑھا سکیں۔

اورنگی کی درزنیں

اورنگی میں مختلف ہنروں سے وابستہ پس ماندہ کارکن عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ مسئلہ بے حد پھیلا ہوا ہے۔ شروع میں صرف ایک ہی قسم کی عورتوں کو مدد کے لیے چُنا جا سکتا تھا چناں چہ ہم نے ان کی سب سے بڑی قسم یعنی سلائی کرنے والیوں کو چُن لیا۔ اورنگی میں سینکڑوں عورتیں اپنے گھروں میں، دستی سلائی مشینوں پر ٹھیکے داروں کے لیے بہت کم مزدوری پر سلائی کر رہی تھیں۔

بہت بڑی تعداد میں سلے ہوئے سستے کپڑے، مثلاً سودے کے تھیلے، پیلی جھاڑنیں، باورچی خانے کے ایپرن اور تولیے وغیرہ کراچی سے یورپ اور امریکہ برآمد کیے جاتے ہیں۔ برآمد کرنے والے یہ سامان چھوٹے ٹھیکے داروں کی معرفت تیار کراتے ہیں جو بچوں اور خواتین سے مزدوری کرواتے ہیں۔ ہم کو یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ برآمد کرنے والوں کا منافع کتنا ہوتا ہے، لیکن یہ پتا چلا کہ ٹھیکے دار سلائی کرنے والیوں کی آدھی مزدوری رکھ لیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ ٹھیکے دار نہ صرف کم مزدوری دیتے ہیں بلکہ عورتوں کو طرح طرح سے دھوکا دیتے اور بعض اوقات انھیں جنسی طور پر

پریشان بھی کرتے ہیں۔

سلائی کرنے والیوں کی مدد کے لیے امدادی ادارہ

سروے کے ذریعے کی جانے والی تحقیق کے بعد او پی پی نے عملی تحقیق کے ذریعے یہ دریافت کیا کہ ان سلائی کرنے والیوں کی ــــ جو بلاشبہ اورنگی کا غریب ترین اور سب سے پس ماندہ طبقہ ہیں ــــ کیسے مدد کی جائے۔

پہلے ایک امدادی ادارہ قائم کیا گیا جو اب وقف کی صورت میں رجسٹرڈ ہے۔ اس نے ٹھیکے داروں کا کام، بغیر کسی نفع کے، اپنے ذمے لیا۔ یہ ادارہ برآمد کرنے والوں سے آرڈر حاصل کرتا، اس کام کو سلائی کرنے والیوں میں تقسیم کرتا، سلے ہوے مال کی بروقت تیاری اور معیار کی نگرانی اور پک اپ کے ذریعے تیار مال کو برآمد کرنے والوں تک پہنچانے کا انتظام کرتا اور ان سے مزدوری کا حساب کتاب کر کے یہ رقم سلائی کرنے والیوں کو پہنچاتا۔

اس ادارے نے کئی سلائی مراکز بھی قائم کیے جہاں عام مشینوں کے ساتھ صنعتی مشینیں بھی استعمال ہوتی تھیں۔ ادارے نے عورتوں کو سلائی کی تربیت بھی دی اور ان کو سلائی کی نگرانی، حساب کتاب اور انتظام کا طریقہ سکھایا۔ اس کام کے لیے ادارے نے عطیات کے طور پر کافی رقم جمع کی، جو مشینوں کی خریداری، کارخانوں کے قیام، کارکنوں کی تنخواہ اور اوپری اخراجات پر صرف ہوئی۔

عورتوں کے گھروں میں سلائی مراکز

سلائی کرنے والی عورتوں کی تنظیم، تربیت اور سہولتوں کی فراہمی کے لیے سلائی مراکز قائم کیے گئے۔ او پی پی کے یہ مراکز سوشل ویلفیئر اور مخیر حضرات کے قائم کردہ انڈسٹریل ہومز سے بالکل مختلف تھے۔ او پی پی کے سلائی مرکز کا انتظام کوئی کارکن خاندان اپنے طور پر چلاتا تھا۔ ہمارا سلائی مرکز کسی کارکن عورت کے اپنے گھر میں ہوتا تھا۔ او پی پی، جو امدادی ادارہ تھا، اس عورت کو تنخواہ یا مکان کا کرایہ ادا نہیں کرتا۔ ہماری شروع ہی سے یہ کوشش تھی کہ ہر مرکز خود کفالت کی بنیاد پر

قائم ہو۔

او پی پی کے کارکن برآمد کنندگان سے کام لا کر سلائی مرکز کو دیتے جس کا انتظام چلانے والے خاندان کو کام کی نگرانی اور اخراجات کے لیے قلیل کمیشن لینے کی اجازت تھی۔ او پی پی کا اصرار تھا کہ اس خاندان کی بیشتر آمدنی اس کمیشن پر منحصر نہ ہو بلکہ اس خاندان کے ارکان خود مشینوں پر کام کر کے اپنی روزی کمائیں۔

ہر مرکز میں عام سلائی مشینیں اور صنعتی مشینیں ہوتی تھیں جن پر ۱۰ سے ۱۵ سلائی کرنے والیاں کام کر سکیں۔ اس کے علاوہ اس مرکز کا سب سے اہم کام سلائی کے کام کو محلے میں سلائی کے لیے تقسیم کرنا، اس کو معیار پر پرکھنا، اس کی جانچ پڑتال، اس کو درست کر کے پیک کرنا اور پھر پک اپ کے ذریعے برآمد کرنے والے کو پہنچانا تھا۔ یہ اصل میں ایک ایسی مرکزی جگہ تھی جہاں کام کے ساتھ ساتھ سیکھنے کا انتظام تھا۔ اس مرکز میں محلے کی سینے والی عورتیں خام مال لینے آتی تھیں۔ وہ اس خام مال سے فارغ وقت میں اپنے گھر میں اپنی مشین پر مطلوبہ اشیا تیار کرتی تھیں اور مقررہ وقت پر لے آتی تھیں۔ اس طرح وہ بہت سی پریشانیوں سے بچ جاتی تھیں۔ او پی پی کے کارکن باقاعدہ حساب کتاب کو دیکھتے اور سلائی کے معیار کی نگرانی کرتے تھے۔ مرکز میں ہر کاریگر کے پاس ایک کارڈ ہوتا جس پر اس کی سلائی کی مزدوری درج کی جاتی تھی۔ اس کارڈ کی وجہ سے سلائی کرنے والیوں کو ان کی پوری مزدوری ایمان داری سے اور وقت پر مل جاتی تھی۔ شروع میں ادارہ برآمد کرنے والوں سے معاوضہ وصول کر کے مرکز کو دیتا تھا لیکن بعد میں مراکز کا انتظام کرنے والے خود ہی ان سے معاوضہ وصول کرنے لگے۔ ہر مرکز میں سلائی کرنے والی عورتوں کی تعلیم اور صحت کے سلسلے میں میٹنگز بھی ہوتی تھیں۔

مسائل اور دشواریاں

عورتوں کے سلائی مراکز کا یہ پروگرام چلانا آسان نہیں تھا۔ اس کو بہت مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک نازک مسئلہ یہ تھا کہ خیرات اور سرپرستی کے خطرات سے کس طرح بچا جائے۔ علاقے میں خیرات اور آسانیوں کی بے حد مانگ تھی۔ او پی پی کا اعلان تھا کہ وہ نفع کمانے والا ادارہ

نہیں ہے؛ تاہم نہ اس کے پاس اتنے وسائل تھے اور نہ خواہش کہ خیرات بانٹے۔ ہم نے یہ بات شروع ہی میں جتلادی تھی کہ عورتوں کے سلائی مراکز ویلفیئر کے انڈسٹریل ہومز کی طرح دائمی پنشن پانے والے ادارے نہیں ہوں گے بلکہ ان کو تجارتی بنیاد پر مقابلہ کر کے اور برآمد کرنے والوں کی بروقت اور بہتر خدمت کر کے زندہ رہنا ہوگا۔ یہ ایسا سیدھا سا پیغام تھا جو اکثر ناخوشی کا باعث ہوتا تھا۔

سلائی کرنے والی عورتوں کی صلاحیت میں اضافہ اور ان سے وقت پر کام لینا بےحد مشکل تھا۔ نئی سلائی کرنے والیاں کام میں سُست اور پھوہڑ ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کو ہمیشہ مزدوری کی کمی کی شکایت رہتی۔ نہ تو ان میں اپنے ادارے سے وفاداری کا احساس تھا، نہ کام میں تربیت یا ضابطوں کی پابندی۔ او پی پی کو اپنے فلاحی ادارہ ہونے کی وجہ سے کام میں بہت دشواری ہوتی تھی۔ شروع میں اچھے کارکن ان مراکز میں نہیں آئے بلکہ اپنے پرانے ٹھیکیداروں سے رشتہ جوڑے رہے۔ او پی پی کو کسی ماہرِ نفسیات کی طرح علاج کرنا پڑا۔ کم سیکھے ہوؤں کی صلاحیت تربیت کے ذریعے بہتر کرنا، کمزوروں کو قوی کرنا اور ایسے لوگوں سے کام لینا جن میں پہل کی کمی تھی؛ یہ نہ صرف مشکل کام تھا بلکہ اس میں روپے کا کافی زیاں ہوا۔ رفتہ رفتہ شکوہ شکایت اور نقصان کم ہوتا گیا اور سلائی کرنے والی عورتوں کا ایک تربیت یافتہ، نظام کا پابند عملہ وجود میں آنے لگا۔

ہماری تیسری مشکل ہمارے سرپرستوں، یعنی برآمد کرنے والوں اور ٹھیکیداروں کا ہمارے ساتھ سلوک تھا۔ وہ عام طور پر ہمارے ادارے کو کم مزدوری دیتے اور ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو او پی پی سے وہی برتاؤ کرتے جیسا ایک عیار آدمی کسی بےوقوف سے کرتا ہے۔ وہ طرح طرح کے حیلے بہانے تراشتے، کام میں بجا اور بےجا عیب نکالتے اور مزدوری کی رقم دیر کر کے دیتے۔ جیسے جیسے سلائی مرکز تجربےکار اور کام میں ماہر ہوتے گئے، ہم نے عیاروں کی جگہ قابلِ اعتماد پارٹیوں سے لین دین شروع کیا۔

ایک اور خطرناک مشکل کراچی کے فسادات تھے۔ اورنگی خاص طور پر ایک دھماکاخیز علاقہ تھا، کیوں کہ یہاں بڑی تعداد میں پٹھان، مہاجر، بہاری، پنجابی، بلوچ اور سندھی آباد تھے۔ خانہ جنگی میں سب سے زیادہ غریبوں کا نقصان ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں ایک مددگار ادارے کی موجودگی ان

لوگوں کے لیے خدا کی نعمت ثابت ہوئی۔ او پی پی کے منتظمین اور ان کی گاڑیاں کرفیو کے وقفوں میں دوڑ دوڑ کر مال لاتی اور لے جاتی تھیں۔ وہ فساد کے باوجود مراکز کے لیے آرڈر لیتے اور سلائی کا سامان مراکز تک پہنچاتے رہے۔ کراچی میں فساد اور کرفیو کا خطرہ اب بھی موجود ہے اور اورنگی کے لوگوں کو انھی حالات میں زندہ رہنا ہے۔

مضبوطی اور پھیلاؤ

او پی پی کا مقصد سلائی کرنے والی عورتوں کی حالت بہتر کرنا تھا۔ یہ مقصد مارکیٹ سے قریبی رشتہ قائم کرانے ہی سے ممکن تھا، خیرات اور وظیفے مہیا کرنے سے نہیں۔ ان سینے والیوں کی مستقل روزی کا انحصار اس بات پر تھا کہ ان کو بغیر کسی رکاوٹ کے سلائی کا کام اور مزدوری کی رقم ملتی رہے۔ اگر سلائی کا کام اور مزدوری کی رقم رک جاتی تو پھر کچھ بھی ممکن نہیں تھا۔

بازار کی حالت سلائی کرنے والیوں کے لیے سازگار نہیں ہے۔ یہ کام موسمی ہے اور کام کی مقدار اور مزدوری کی رقم کا تعلق بدلتی ہوئی بیرونی تجارت سے ہے۔ اس کے علاوہ اس کام میں بے حد سخت مقابلہ ہے۔ اسی وجہ سے اتنی ساری سلائی کرنے والیوں کو زرِمعاونت اس طرح دینا ممکن نہیں تھا، جیسا انڈسٹریل ہوم کی کارکنوں کو ملتا ہے۔ بچاؤ اور بقا کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ یہ لوگ مقابلہ کریں اور مل جل کر کام کریں۔

اسکیم کے تیسرے سال سلائی مراکز کا ایک ایسا حلقہ وجود میں آگیا جو مارکیٹ میں مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا اور جہاں اچھی نگراں اور سینے والیاں جمع ہو گئی تھیں۔ یہ سلائی مراکز آخر کار ایک کامیاب معاشی اکائی بن گئے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اِن میں اوپری اخراجات بہت کم تھے: جگہ کا کرایہ نہیں دینا پڑتا تھا، پورا خاندان پیداوار اور نگرانی میں شریک تھا۔ سلائی کرنے والیاں زیادہ تر محلے ہی میں رہتی تھیں، اس لیے کام کے اوقات حالات کے پیشِ نظر لچک دار ہو سکتے تھے۔ بعض اوقات رات کو دیر تک کام ہوتا تھا۔ ایک ایسا سلائی مرکز جو ایک ذمے دار خاتون کے زیرِ نگرانی اپنے اور پڑوسیوں کے نفع کی خاطر کام کر رہا ہو، ایک اچھا تجارتی نمونہ ہے۔ کسی بڑے کارخانے یا ٹھیکے دار کے اڈے کے مقابلے میں یہ مرکز پردہ نشیں عورتوں کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ یہ مراکز

اورنگی کے سب سے کم زور اور غریب طبقے کی مدد کر رہے تھے۔ پوچھ گچھ سے معلوم ہوا کہ پہلے جن سَو تھیلوں کی سلائی کا معاوضہ ٹھیکے دار ۱۵ روپے دے رہے تھے، مراکز ۲۰ روپے دیتے ہیں۔ اور کیس اسٹڈی سے، جو ہمارے اردو رسالے میں شائع ہوئی، معلوم ہوا کہ بعض سلائی کرنے والیاں اپنے پورے خاندان کی کفیل ہیں، کیوں کہ ان کے خاوند یا تو بے روزگار، یا منشیات کے عادی یا اپاہج ہیں، یا مر چکے ہیں۔

خود کفالت

چوتھے سال تک سلائی مراکز مقابلہ کر کے نفع کمانے والے ادارے بن گئے۔ انھیں کافی آرڈر ایسے برآمد کرنے والوں سے مل رہے تھے جو وقت پر رقم ادا کرتے تھے۔ منتظموں کو کارکن عورتوں کی نگرانی کا سلیقہ آ گیا تھا اور خراب سلائی کی وجہ سے ہونے والا نقصان اب بہت کم ہو گیا تھا۔ اب ہم نے کوشش شروع کی کہ تمام مراکز خود کفیل ہو جائیں۔ لین دین اور انتظام کے سلسلے میں ہم نے ان کو سمجھایا کہ اب وہ اس قابل ہو گئے ہیں کہ اپنا بوجھ خود اپنے کندھوں پر اٹھا سکیں، اس لیے ان کو او پی پی پر انحصار کم کرنا چاہیے کیوں کہ وہ ان کو ہمیشہ آسانیاں فراہم نہیں کر سکتا۔ ہم نے مشورہ دیا کہ آپس میں مل کر، ایک نگراں کمیٹی بنا کر او پی پی کی ذمے داری خود سنبھال لیں۔ او پی پی کی ذمے داری کی کمی کی تجویز اور خود کفالت کا مشورہ شروع میں خوشی سے قبول نہیں کیا گیا، کیوں کہ یہ ہمارے جاگیردارانہ تمدن کے قدیم رویے کے خلاف تھا جس میں ہاری ہمیشہ وڈیرے کا دست نگر رہتا ہے۔ اسی مستقل مزاجی سے، جس سے ہم نے تین سال ان مراکز کی امداد کی تھی، چوتھے اور پانچویں سال ہم نے ان کو خود کفالت کی طرف ڈھکیلا۔ چھٹے سال مدد کرنے والے ادارے کو ختم کر دیا گیا اور ہر قسم کی آسانیاں روک دی گئیں۔

۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۹ء تک مراکز کی مزدوری کی مد میں آمدنی

او پی پی کے سلائی مراکز رفتہ رفتہ قائم کیے گئے، لیکن ان میں مسلسل ترقی ہوتی رہی ہے۔ ذیل کی جدول مارچ ۱۹۸۴ء سے جون ۱۹۹۰ء تک مزدوری کی مد میں سالانہ آمدنی کا نقشہ پیش کرتی ہے:

سال	مزدوری کی رقم
1984	40,615روپے
1985	4,21,880روپے
1986	10,58,360روپے
1987	16,03,271روپے
1988	14,24,112روپے
1989	24,11,000روپے
1990 چھ ماہ	12,05,700
کل	81,24,823روپے

سلائی کے پروگرام کی موجودہ حالت

اس وقت سلائی کے پروگرام کی امداد کے لیے کوئی بجٹ، اسٹاف، گاڑی یا مالی امداد کی سہولت موجود نہیں ہے، لیکن مشینوں اور دوسرے سامان کی خریداری کے لیے یہ مراکز او سی ٹی (اورنگی چیریٹیبل ٹرسٹ) سے قرض لے سکتے ہیں۔

پانچ سال بعد او پی پی کے قائم کردہ ان مراکز کے انتظامی اور مالی اثاثے خاصے بڑھ گئے ہیں۔ ان کی بازار میں ساکھ اچھی ہے اور وہ برآمد کرنے والوں سے خود آرڈر لے رہے ہیں۔

اس پروگرام کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اورنگی میں باصلاحیت خاتون منتظمین بڑی تعداد میں سامنے آئی ہیں۔

دوسرا اچھا اثر یہ ہے کہ اورنگی میں جگہ جگہ گھروں میں سلائی مراکز قائم ہوئے ہیں۔ فروری ۱۹۹۵ء تک ۳۲۵ ایسے مراکز قائم ہوئے جن کو ۴۴ لاکھ ۹۰ ہزار روپے قرض دیا گیا جس میں سے انھوں نے ۳۱ لاکھ ۴۰ ہزار روپے لوٹا دیے۔ ان میں ۵۹ ایسے ہیں جن کو عورتیں خود چلا رہی ہیں۔ یہ اب تک ۱۱ لاکھ ۲۰ ہزار روپے قرض لے چکی ہیں اور ان سے یہ تمام رقم واپس وصول کی جا چکی ہے۔

پرانے سلائی مراکز قائم کرنے میں او پی پی کی کافی محنت اور رقم صرف ہوئی۔ نئے مراکز او پی پی سے نہ وقت اور نہ مالی امداد چاہتے ہیں۔ وہ او پی پی سے آرڈر کے سلسلے میں معاونت کے طالب نہیں اور نہ سامان لانے لے جانے کے لیے گاڑی مانگتے ہیں۔ وہ مشینیں بھی مفت نہیں چاہتے اور نہ نقصان کے لیے زرِ تلافی۔ وہ صرف قرض حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں، جس کی اقساط وہ باقاعدہ ادا کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ پڑوسیوں کے لیے وہ ٹھیکے داری کے فرائض دوستانہ اور ہمدردانہ انداز میں ادا کرتے ہیں اور پڑوس کی عورتیں دھوکا دہی اور چھیڑ چھاڑ سے محفوظ رہتی ہیں۔ ان مراکز میں خواتین منتظموں کی موجودگی، ان کا گھروں میں ہونا، اپنے ہی محلّے میں سلائی کے کام کو باوقار بنا رہا ہے جب کہ یہی کام چند سال پہلے حقیر خیال کیا جاتا تھا۔

اورنگی میں چھوٹے کاروباری قرضے

(۱۹۸۷-۹۵ء)

اورنگی پائلٹ پروجیکٹ نے اورنگی میں اپریل ۱۹۸۰ء سے کام شروع کیا۔ اورنگی کراچی کی سب سے بڑی کچی آبادی ہے۔ یہ اندرونی شہر کا کوئی قدیم پسماندہ علاقہ نہیں بلکہ کراچی کے مضافات میں واقع ایک نئی آبادی ہے جو ۲۵ سال پہلے وجود میں آنا شروع ہوئی۔ ۱۹۸۹ء کے ایک سروے سے اندازہ ہوا کہ ۲۵ سال میں یہاں بنگلہ دیش، شمال مغربی سرحدی صوبے، ہندوستان اور پنجاب سے آنے والوں کے علاوہ بلوچوں اور سندھیوں نے تقریباً ۹۵ ہزار مکان خود اپنے خرچ سے تعمیر کیے ہیں۔ ان لوگوں کی اکثریت مزدور پیشہ غریب طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ او پی پی کو بہت جلد اندازہ ہوا کہ یہ نئی بستی مہم جوئی کی صفت سے مالامال ہے، یعنی اُس صفت سے جو عام طور پر ہجرت کرنے والوں میں پائی جاتی ہے۔ ان لوگوں نے بغیر کسی سہولت یا مالی امداد کے اپنے مکان خود تعمیر کیے اور تھوڑی سی تکنیکی مشاورت سے، جو او پی پی نے فراہم کی، اپنے خرچ پر، اپنی زیرِ نگرانی علاقے کی ۵۲۳۳ گلیوں میں زیرِزمین نکاسیِ آب کی پائپ لائنیں ڈالی ہیں اور مکانوں کے اندر ۸۰ ہزار فلش لیٹرین بنائے ہیں۔ وہ دیگر شہری سہولتوں کی قیمت بھی بڑی خوشی سے ادا کرنے پر آمادہ ہیں، اس لیے بیوپاریوں نے علاقے میں ۵۰۹ پرائمری اور سیکنڈری اسکول اور ۶۴۶ شفاخانے قائم کیے ہیں اور پبلک ٹرانسپورٹ کی سیکڑوں گاڑیاں چلائی ہیں۔

پہل کاری کی اس صلاحیت کا سب سے بڑا اظہار اس علاقے میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے کارخانوں کا قیام ہے۔ یہاں دکانوں، کارخانوں، ٹھیلوں اور خوانچہ فروشوں کی شکل میں ۱۱۰۰۰ سے زیادہ ایسی کاروباری اکائیاں کام کر رہی ہیں جنھیں خاندان کے افراد مل جل کر چلاتے ہیں۔

مہنگائی اور کساد بازاری کے دوہرے چیلنج کے جواب میں ہجرت کر کے شہر آنے والوں نے کام کرنے والے خاندان کے نظریے کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے اپنے گھروں کو کارخانوں میں بدل لیا اور عورتوں کو دست نگر کی جگہ ایک کار آمد معاشی کارکن بنا کر اس قابل کر دیا کہ وہ گھریلو آمدنی میں معاونت کر کے پُرانے پدرانہ تمدّن کو تیزی سے بدل دیں۔

او پی پی کی تحقیق سے دو اہم جُز سامنے آئے۔ پہلا یہ کہ اِن گھریلو کارخانوں کے تیار کردہ سامان اور فراہم کردہ سہولتوں کی بازار میں بے حساب کھپت ہے۔ (اسے کثیر آبادی کا ایک مثبت پہلو سمجھا جا سکتا ہے)۔ دوسرے یہ کہ گھریلو کاروبار مقابلے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں کیوں کہ ان کے اوپری اخراجات بہت کم ہیں اور ان کے اپنے گھریلو کارکن سستے اور وفادار ہیں۔ یہ گھریلو کاروبار کراچی کی وسیع منڈی سے پوری طرح منسلک ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان میں بعض کارخانے ایسے بھی ہیں جو نامی گرامی کارخانوں کو سامان بنا کر دیتے ہیں اور وہ لوگ اس مال پر اپنا لیبل لگا کر زیادہ داموں پر بیچتے اور خوب نفع کماتے ہیں۔ تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر ان کو قرض آسانی سے ملنے لگے تو یہ کاروباری اکائیاں پیداوار اور روزگار کی فراہمی میں اور زیادہ ترقی کر سکتی ہیں، کیوں کہ ان کے مال کی بازار میں کھپت ہے اور اورنگی میں مزدور بہت ہیں۔ لیکن ان کو بینک سے قرض اس لیے نہیں ملتا کہ ان کی وہاں تک پہنچ نہیں؛ نہ ہی ان کے پاس رہن رکھنے کو کوئی اثاثہ ہے۔ قرض کم شرح سود پر نہ ملنے کی وجہ سے یہ لوگ مال زیادہ قیمت پر خریدتے اور تیار مال کم قیمت پر بیچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ترقی کی رفتار سست ہے۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ کاشتکار اور مچھیرے بھی بینک سے قرض لینے والوں میں شامل نہیں ہیں، اور وہ بھی اورنگی کے مزدوروں کی طرح پریشان حال ہیں۔

۱۹۸۲ء میں جب ہمیں اورنگی کے بارے میں قریبی واقفیت ہو گئی تو او پی پی نے فیصلہ کیا کہ گھریلو کاروبار کو آسان قرض دینے کے لیے اورنگی چیریٹبل ٹرسٹ کے نام سے ایک وقف رجسٹر کرایا جائے۔ یہ قرض بغیر زرِ ضمانت، رہن کے کاغذات، رشوت یا سرخ فیتے کے دیا جاتا ہے، اور اس کے مارک اپ کی شرح وہی ہے جو بینک کے قرض پر ہوتی ہے۔ صرف گاہکوں کا چناؤ سختی سے ہوتا ہے اور قرض کی واپسی پر اصرار اور نگرانی سخت ہوتی ہے۔ یہ بنیادی فیصلہ شروع ہی

میں کر لیا گیا تھا: کسی قسم کی کوئی امدادی رقم نہیں دی جائے گی، اور قرض کی واپسی پر اصرار کیا جائے گا۔ ہم کو معلوم تھا کہ اس سے پہلے غریبوں کی امداد کے بہت سے پروگرام اس لیے ناکام ہوئے کہ ان میں بہت بڑی امدادی رقم شامل تھی اور ان کی نگرانی پر پوری توجہ نہیں دی گئی۔ ہمارا دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ بنگلہ دیش کے گرامین بینک کی مثال پر عمل کرنے اور بیرونی امداد پر انحصار کرنے کے بجائے ہم مقامی بینکوں سے بازار کے نرخ پر قرض لے کر یہ پروگرام چلائیں گے۔

او سی ٹی نے مقامی بینکوں سے بازار کے نرخ پر بغیر کسی رعایت کے قرض لیا اور گھریلو کاروباریوں کو بغیر رہن کی شرط اور سرخ فیتے کی مداخلت کے، صرف محلّے کے دو آدمیوں کی ضمانت پر، دینا شروع کیا۔ ٹرسٹ یہ خطرہ اس لیے مول لے سکا کہ وہ کوئی تجارتی ادارہ نہیں ہے اور نہ وہ بینک کی طرح رقم جمع کرتا ہے، نہ اس کے حصّے دار ہیں جن کو نفع کما کر دینا پڑے۔ بلکہ اس کو کچھ رقم بطور عطیات مخیر اداروں سے ملی جو سرمائے کی شکل میں بڑھ کر ۹۴-۱۹۹۳ء تک آڈٹ کی رُو سے ایک کروڑ ۹۶ لاکھ ۹۰ ہزار روپے ہو گئی۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ او سی ٹی وہ تمام قرض جو اس نے بینکوں سے لیا تھا، وقت پر ادا کرنے میں کامیاب رہا۔ ۹۵-۱۹۸۷ء کے درمیان او سی ٹی نے نیشنل بینک سے دو کروڑ ۹۷ لاکھ ۰۷ ہزار روپے، حبیب بینک سے ایک کروڑ ۸۲ لاکھ ۵۰ ہزار روپے اور فرسٹ ویمن بینک سے آٹھ لاکھ روپے قرض لیے تھے۔ یہ تمام قرضے مارک اپ کے ساتھ ادا کر دیے گئے۔ دو عنصر اس خوش قسمتی کا سبب بنے: اقساط کی وقت پر واپسی (۱۹۸۷ء سے اب تک تین کروڑ ۱۸ لاکھ ۵۰ ہزار روپے) اور سرمائے کی مد میں انفاق فاؤنڈیشن (۱۴۲۶۰۰۰۰ روپے) اور ورلڈ بینک (۲۷۰۰۰۰۰ روپے) کا ریوالونگ فنڈ۔ ۱۹۸۸ء کے بعد سے سوئس سفارت خانے نے سالانہ ۲ لاکھ روپے کی امداد سالانہ اخراجات کے لیے دینا شروع کی، جسے ۱۹۹۴ء میں بڑھا کر ساڑھے چار لاکھ روپے کر دیا گیا۔

ایک بوڑھے آدمی کی حیثیت سے (میں ۱۹۸۷ء میں ۷۱ سال کا تھا) مجھے ان دو خطرات کا خوب اندازہ تھا جو پاکستان میں کسی بھی قرض کے پروگرام کو درپیش ہوتے ہیں: بینکوں اور مالیاتی اداروں میں کرپشن اور قرض لینے والوں کی بددیانتی۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بہت دن

ہوے، کنفیوشس نے کہا تھا کہ جب ہوا چلتی ہے تو گھاس جھک جاتی ہے۔ اور ایک عرب کہاوت ہے کہ الناس علی دین ملوکھم، یعنی عوام بادشاہ کا دین اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے اس بات کی فکر تھی کہ او سی ٹی میں مینیجر اور کارکن بے ایمان نہ ہوں۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ چوری اور کام چوری کو، جو ہماری قوم میں عام ہیں، جڑ سے اکھاڑ دیں گے۔ او سی ٹی نے کڑی نگرانی اور سخت خود تنقیدی کا طریقہ اختیار کیا۔ یہ اس لیے زیادہ مشکل نہیں تھا کہ او سی ٹی میں اسٹاف کی تعداد ایک درجن سے نہیں بڑھی۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے اسٹاف میٹنگ ہوتی اور حساب کتاب کے گوشوارے ماہوار شائع ہوتے۔ اس طرح قرضوں کی واپسی پر مستقل نظر رکھی جاتی تھی۔ ان تمام کے باوجود غلطیاں ہوئیں۔ ایک کارکن چوری کی وجہ سے رخصت ہوا، دو نااہلی کی وجہ سے اور ایک کام چوری کی وجہ سے۔ یہ خاصی بڑی تعداد ہے، لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے، کام کو بار بار پرکھنے اور تنقیدی نظر سے دیکھنے کی وجہ سے ادارے میں ایمان داری کا اچھا معیار قائم ہوا ہے۔

چوری اور کام چوری کو او سی ٹی کے مختصر سے اسٹاف میں ختم کرنا بہت زیادہ دشوار نہیں تھا۔ اس سے کہیں دشوار اس امر کو یقینی بنانا تھا کہ قرض لینے والے قسط کی ادائیگی میں ناغہ نہ کریں، دھونس دھمکی سے کام نہ لیں اور ایک حلقہ ایسے قابلِ اعتماد گاہکوں کا منظم ہو جائے جو ایمان دار اور اپنے کام کے ماہر ہوں۔ او سی ٹی کو اس خطرے کا پورا احساس تھا جو چھوٹے بیوپاروں کو بلا رہن قرض دینے میں اس کو درپیش تھا۔ اس کو یہ بھی احساس تھا کہ دھونس، دھمکی اور قرض ہڑپ کر جانا ہمارے تمدن کا مقبول طریقہ ہے۔ اس کے باوجود ہمیں یقین تھا کہ اگر او سی ٹی نے ایمان داری اور شرافت سے برتاؤ کیا تو وقت کے ساتھ ساتھ اس کے گاہک بھی ایمان داری سے پیش آئیں گے۔ ہمیں یہ بھی یقین تھا کہ آہستہ آہستہ، گو خاصی تکلیف کے بعد، ہمارے مینیجر اچھے گاہک چننے کا فن سیکھ لیں گے اور ان سے رقم واپس لے سکیں گے اور اس طرح او سی ٹی کے لیے اچھے گاہکوں کا ایک بڑا قابلِ اعتماد حلقہ وجود میں آ جائے گا۔

پہلے دو سال واقعی تکلیف دہ تھے۔ کافی رقم ڈوبی؛ دھمکی اور دھونس کا بازار گرم رہا۔ مثال کے طور پر پہلے سال ۱۰۶ گاہکوں کو ۱۱ لاکھ ۵۵ ہزار روپے قرض دیے گئے۔ ان میں سے ۳۸

(یعنی ۳۵٫۸۵ فیصد) نادہند نکلے اور دو لاکھ ۳۹ ہزار روپے (یعنی کل رقم کا ۲۰٫۷۵ فیصد) ڈوب گئے۔ دوسرے سال ۹۵ گاہکوں کو ۱۱ لاکھ ۱۷ ہزار روپے قرض دیے گئے جس میں سے ۲۳ گاہک (یعنی ۲۴٫۲۱ فیصد) نادہند تھے اور ایک لاکھ ۵۳ ہزار روپے (یعنی ۱۳٫۷۰ فیصد) ڈوب گئے۔ او سی ٹی نے کوشش جاری رکھی، دھونس اور دھمکی کے باوجود گاہکوں کے چناؤ کو بہتر کیا، نگرانی تربیت اور ایمان داری پر زور دیا، چناں چہ تیسرے سال بہاؤ کا رُخ تبدیل ہونا شروع ہوا اور اب سال بہ سال قرضے کی مقدار میں اضافہ ہو رہا ہے اور نادہندوں کی تعداد میں کمی۔ ۳۱ جنوری ۱۹۹۵ء تک ۳۰۸۸ گاہکوں کو ۴ کروڑ ۷۲ لاکھ ۲۰ ہزار روپے دیے گئے۔ ان میں وہ قرضے جو وصول نہیں ہوئے اور جن کو رائٹ آف کیا گیا (یہ عمل ہر چھ ماہ بعد کیا جاتا ہے) ان کی رقم ۱۹ لاکھ ۹۲ ہزار روپے (یعنی کل قرض کا ۴٫۲۲ فیصد) ہے۔ ۳۰۸۸ گاہکوں میں سے ۲۷۳ (یعنی ۸٫۸۴ فیصد) نادہند نکلے۔

گھریلو کاروباری اکائیوں کو قرض دینے کا پروگرام اس لیے شروع کیا گیا تھا کہ غریب بیوپاریوں کو بلا رہن قرض کی فراہمی کا ایک خود کفیل نمونہ دریافت کیا جائے۔ او سی ٹی نے بڑی توجہ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ قرض واپس نہ ملنے کی کیا وجہ ہے۔ اس نے تحقیق اور تجزیے کی روشنی میں اپنے چناؤ کے طریقوں اور تقاضے کے انداز کو بدلا تو تجربے سے معلوم ہوا کہ قرضے کے ڈوبنے یا رکنے کی تین بڑی وجوہات ہیں: (۱) گاہک کی بے ایمانی (۲) اس کی نااہلی جس کی وجہ سے اس کا دیوالیہ نکل جاتا ہے اور (۳) اس کی بد قسمتی، بیماری، موت، فسادات، کرفیو یا اپاہج ہو جانا۔ ہمارے ۲۷۳ ڈوبے ہوئے قرضوں میں ۸۳ (یعنی ۲٫۶۵ فیصد) بے ایمانی کی وجہ سے، ۱۱۱ (یعنی ۳٫۵۹ فیصد) نااہلی کی وجہ سے اور ۷۷ (یعنی ۲٫۴۹ فیصد) بد قسمتی کی بنا پر واپس نہ کیے گئے۔ اس طرح بے ایمانی کا نقصان ۷ لاکھ ۷۹ ہزار ۲۵۵ روپے، نااہلی کا ۶ لاکھ ۹۳ ہزار ۲۰۴ روپے اور بد قسمتی کا نقصان ۵ لاکھ ۱۴ ہزار ۹۳۳ روپے ہوا۔

۱۹۸۷ء میں جب پروگرام شروع ہوا تو گاہکوں میں وفاداری کی کمی تھی، اس لیے نقصان زیادہ ہوا۔ سات سال بعد ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے غریب گاہکوں نے ہم کو بہت زیادہ مایوس نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے اس یقین کو تقویت پہنچائی کہ اگر او سی ٹی ان

کی ایمان داری اور اخلاص سے خدمت کرے تو آخر کار ان کا ایک مخلص، ایمان دار اور اہل حلقہ وجود میں آ جائے گا اور رفتہ رفتہ بڑھتا جائے گا۔ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے اب تک ۳۰۸۸ گاہکوں کو قرض دیا جن میں سے ۱۵۶۷ گاہکوں نے پورا قرض (یعنی اصل ۲ کروڑ ۴۳ لاکھ ۹۰ ہزار روپے اور مارک اپ ۳۰ لاکھ ۳۳ ہزار روپے) ادا کر دیا۔ کرنٹ اکاؤنٹ کی مد میں ۱۵۲۱ گاہکوں نے اب تک ۱۳ لاکھ ۴۰ ہزار روپے اصل اور ۳۸ لاکھ روپے مارک اپ ادا کیے ہیں۔ ان گاہکوں میں سے صرف ۲۰۰ کو (جو تمام گاہکوں کا ۱۳۰۱۴ فیصد ہے) یاد دلانا پڑتا ہے جب کہ باقی ۱۳۲۱ (یعنی ۸۶۰۸۵ فیصد) باقاعدہ وقت پر خود قسط ادا کرتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو دفتر میں آ کر پیسے جمع کراتے ہیں۔ بلاشبہ سات سال میں ۲۷۳ گاہک (یعنی کل تعداد کا ۸۰۸ فیصد) نادہند ثابت ہوئے،، جن کی وجہ سے او سی ٹی کو قرض کی کل رقم کا ۴۰۱۲ فیصد نقصان ہوا۔

اب تک ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ او سی ٹی کو جو نقصان ہوتا ہے اس میں ۱۰ فیصد غلط چناؤ کا اور ۵ فیصد گاہکوں کی بے ایمانی، نااہلی اور بد قسمتی کا عمل دخل ہے۔ او سی ٹی ایک محروم طبقے کو بلارہن قرض دیتا ہے اور ہماری اس خواہش کے پیشِ نظر کہ ہم اِن لوگوں کی زیادہ سے زیادہ مدد کریں، یہ خطرہ مناسب بھی ہے اور قابلِ برداشت بھی۔

اورنگی کی طرح کچی آبادیوں میں رہنے والے سرکاری اداروں سے بہت کم امداد حاصل کر سکتے ہیں۔ انھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھنا پڑتا ہے۔ او سی ٹی کو یہ بھی معلوم ہوا کہ بددیانت نادہندوں اور دھونس دھمکی سے کام لینے والوں کے سلسلے میں کوئی قانونی چارہ کار موجود نہیں ہے۔ مگر ہمیں اس بات پر حیرت ہے کہ ٹرسٹ کے بعض ایمان دار گاہک، قرض ادا نہ کرنے والوں کے خلاف خود رائے عامہ کو منظم کر رہے ہیں۔

معقول شرح سود پر ملنے والے قرض سے گھریلو کاروباری اکائیوں کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ ۳۱ جنوری ۱۹۹۵ء تک ۳۰۸۸ غریب گاہکوں نے او سی ٹی سے ۴ کروڑ ۲۷ لاکھ ۲۰ ہزار روپے قرض لیا۔ ان کو اگر پیشے کے حساب سے تقسیم کیا جائے تو ان کی ۶۳ اقسام ہیں۔ ان لوگوں نے ابھی تک ۳ کروڑ ۹۷ لاکھ روپے اصل اور ۷۱ لاکھ ۷۰ ہزار روپے مارک اپ کی مد میں

ادا کیے ہیں۔ ان میں زیادہ تر بیوپاری خوش حال ہو گئے ہیں۔ ان کے گھریلو کارخانے زیادہ سامان بنا رہے ہیں اور وہاں نئے کارکن روزگار حاصل کر رہے ہیں۔ اب یہ کامیاب گاہک نئے گاہکوں کے چناؤ میں ہماری مدد کرتے ہیں اور دوسروں کے لیے ایک مثالی نمونہ بن گئے ہیں۔

اورنگی کے گھریلو کاروبار کا انقلابی اثر یہ ہوا کہ عورتیں مردوں کی معاشی شریک بن گئی ہیں۔ ان کارخانوں میں آدھے کارکن مرد اور آدھی عورتیں ہیں۔ ۳۰۸۸ گھریلو بیوپاریوں میں، جو اب تک قرض لے چکے ہیں، ٦۰۱ خواتین ہیں جو کل کا ۱۹٫۴ فیصد ہے۔ یہ عورتیں ۴۴ اقسام کے کام کرتی ہیں، اور تمام امور کی منتظم ہیں۔ انھوں نے اب تک ۸۵ لاکھ ۳۰ ہزار روپے قرض لیے ہیں جس میں سے ۳۷ لاکھ ۳۰ ہزار روپے اصل اور ۱۵ لاکھ ۴۰ ہزار روپے مارک اپ ادا کر چکی ہیں۔

او سی ٹی نے کوشش کر کے شرحِ سود میں رعایت اور بیرونی امداد پر انحصار سے اپنے آپ کو بڑی حد تک بچایا ہے۔ اس نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ اوپر کے اخراجات کم سے کم ہوں تاکہ ان کا بوجھ آسانی سے برداشت کیا جا سکے۔ ۱۹۸۷ء سے ۳۱ جنوری ۱۹۹۵ء تک او سی ٹی کے نگرانی کے اخراجات ۳۱ لاکھ ۹۰ ہزار روپے ہوئے جو قرضوں کی کل مالیت (۴ کروڑ ۲۷ لاکھ روپے) کا ۷٫۵ ٦ فیصد ہے۔ او سی ٹی نے اس دوران میں ۷۱ لاکھ ۷۰ ہزار روپے مارک اپ کی مد میں حاصل کیے جو مجموعی نگرانی کے خرچ کا ۲۲۴٫۷ ٦ فیصد ہے۔

میں اس سے زیادہ اعداد و شمار بیان نہیں کرنا چاہتا۔ وہ حضرات جن کو دل چسپی ہے او پی پی اور او سی ٹی کی سہ ماہی رپورٹ پڑھ سکتے ہیں جس میں تمام ضروری معلومات تفصیل سے بیان کی جاتی ہیں۔ اس سے کہیں بہتر یہ ہوگا کہ وہ لوگ اورنگی آ کر بچشم خود کام کو دیکھیں۔ میں اس گفتگو کو اپنی دو آرا پر ختم کرتا ہوں۔ پہلی رائے یہ ہے کہ سات سال کی مسلسل تحقیقی جستجو کے بعد ہم نے شہری اور دیہی علاقوں میں گھریلو کاروباری اکائیوں کو قرض دینے کی ایک مثالی تنظیم کی بنیاد ڈالی ہے جو ملک کے حالات سے ہم آہنگ، کم خرچ اور خود کفیل ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ہمارے خیال میں اس نمونے کو بہت آسانی سے دوسری جگہوں پر آزمایا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ ہم کسی ایسے ادارے کو جو ہمارے انداز میں قرض دینے کی کوشش کرے گا، تربیت دینے کو تیار ہیں۔

گریجویٹ بیوپاری

ایڈورڈ کونز (Edward Conze) ایمان کی یوں تعریف کرتا ہے:

"ایمان کا مطلب بہادری کے ساتھ مستقل بالارادہ عمل ہے۔ یہ مستقل ارادے اور کام کو پورا کرنے کی خواہش کا ایک ساتھ جمع ہونا ہے۔ فرض کرو کہ دریا کے ایک کنارے پر رہنے والوں کو دشمن کے حملے، بیماری یا قحط سے مرنے کا خطرہ لاحق ہے۔ صاحبِ ایمان وہ شخص ہو گا جو بہادری سے دریا میں کود کر تیرتا ہوا اس پار نکل جائے، تمام خطروں کا مقابلہ کر کے وہ اپنے آپ کو بچائے اور دوسروں کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال قائم کرے۔ جن لوگوں میں ایمان کی کمی ہے وہ اسی کنارے پر بے یقینی کی کیفیت میں وقت گزار دیں گے۔ ایمان کے اس پہلو کا الٹ ہچکچاہٹ، بُزدلی، خوف، بے یقینی اور منتشر، کم حوصلہ اور حساب کتاب کرنے والی فطرت ہے۔ ایمان کا بہت گہرا رشتہ قوت فیصلہ سے ہے یعنی کسی شخص کا پورے غور و فکر کے بعد کسی مقصد کو حاصل کرنے کا پختہ عزم کرنا، اور اپنے بالارادہ عمل پر پورا یقین رکھنا۔ یہ کسی ہچکچانے والے بچے کے کھسکنے سے بالکل مختلف ہے جب وہ یہ سوچتا رہا ہو کہ میں ایسا کروں یا نہ کروں۔"

("ہندوستان میں بدھ فکر"، مشیگن یونیورسٹی، صفحہ ۴۸)

معاشیات کے میدان میں ایمان کا مطلب ہے پہل کاری، نئے کام کی ابتدا، خطروں کا سامنا کرنا، دقتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنا، نقصان اٹھانا اور نفع کمانا۔ بہت دن ہوے، میں نے پڑھا تھا کہ

ایمان کی قوت پہاڑوں کو ہلا دیتی ہے۔ عام آدمیوں سے تعلق کے درمیان میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ پہل کاری کا جذبہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔ ان پاکستانیوں کی مثال لیجیے جو ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں: کس طرح وہ خود بھی امیر ہو گئے اور اپنے سرمائے سے اپنے ملک کو بھی امیر کر رہے ہیں۔ اگر وہ اپنی رقم یہاں نہ بھیجیں تو ہمارے بین الاقوامی لین دین کا خسارہ ہم کو دیوالیہ کر دے؛ اس بہت بڑے سرمائے کی آمد کے بغیر ہمارے بڑے بڑے شہر خوش حال نہ ہو پاتے۔ یا پھر ان لوگوں کی مثال لیں جو، "کنارے پر ہچکچانے" یعنی دیہات کی پس ماندہ جھونپڑیوں میں پڑے رہنے کے بجائے شہروں کی طرف ہجرت کر رہے ہیں، زمیندار کی بیڑیاں کاٹ کر شہروں میں کچی بستیاں آباد کر رہے ہیں، غیر رسمی سیکٹر کو وسعت دے رہے ہیں اور حقیقت میں ایک نیا، زیادہ منصفانہ معاشرہ تعمیر کر رہے ہیں۔ بیرونِ ملک یا اندرونِ ملک سے ہجرت کر کے آنے والے لوگ چھوٹے کاروباری ہیں۔ ان کی کامیاب کوششوں کا ہمارے قومی منصوبوں کی ناکامی سے موازنہ کیجیے۔ اس نمایاں فرق کی کیا وجہ ہے؟ کیا یہ تو نہیں کہ ہمارے حکمرانوں میں یقین کی ان چھوٹے آدمیوں کے مقابلے میں کمی ہے؟

ہمارے حکمران روزانہ دعوے کرتے ہیں کہ وہ بے گھر انسانوں کو نئے مکان تعمیر کر کے دیں گے۔ ترقیاتی ادارے بہت بڑے بجٹ والے بڑے بڑے منصوبوں کا اعلان کرتے ہیں۔ پھر یقینی طور پر تین باتیں ہوتی ہیں: پہلے تو تعمیر ۱۰ سے ۲۰ سال تک رینگتی رہتی ہے؛ دوسرے، ان مکانوں کی قیمت ادا کرنا غریب آدمی کی استطاعت سے باہر ہے چنانچہ آخر کار یہ مکان سٹے بازوں یا امیروں کے ہاتھ لگ جاتے ہیں؛ تیسرے، اسی مدت میں غریب لوگ اس سرکاری تعمیر کے ساتھ کچی آبادیوں میں ہزاروں مکان خود تعمیر کر کے ان میں آباد ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ، بغیر کسی سرکاری ادارے (ترقیاتی ادارے، سرکاری یا غیر سرکاری فنانس کارپوریشن) کی جائز مالی امداد کے، صرف دلالوں کی جائز یا ناجائز مدد، اور تھلوں کی مالی اور تکنیکی امداد سے اتنا بڑا تعمیری کام انجام دیتے ہیں۔ صرف اورنگی میں پچھلے ۲۵ سال میں تقریباً ایک لاکھ مکانات اسی طرح تعمیر ہوئے اور ان مکانوں کے مالک مزدور پیشہ، کاریگر، چھوٹے بیوپاری، کلرک، دکاندار اور ٹھیلے والے ہیں۔ پھر ہر روز ہمارے حکمران بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے کا وعدہ کرتے ہیں، اور اس سلسلے میں بھی

بڑے بڑے منصوبوں کا اعلان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ایسا وعدہ ہے جو پورا کیا ہی نہیں جا سکتا، کیوں کہ اول تو ہماری معیشت رشوت اور بدانتظامی کی وجہ سے کساد بازاری کا شکار ہے؛ جائز کاروبار اگر سکڑ نہیں رہے تو ان میں اضافہ بھی نہیں ہو رہا۔ اس کے برخلاف ہماری بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے لاکھوں نوجوان روزگار چاہتے ہیں۔ پھر تعلقات کے ناجائز استعمال نے معیشت کو مسخ کر دیا ہے۔ سرکاری ادارے، کارپوریشن، بلدیات، بینک اور کارخانے ضرورت سے زیادہ ملازم رکھے ہوئے ہیں اور نقصان پر چل رہے ہیں۔ ہر جگہ مفت خوری کا رویہ عام ہے۔ سوچ میں توازن کی کمی ہے کیوں کہ حکومت صرف بے روزگار پڑھے لکھے نوجوانوں کے بارے میں فکرمند ہے جس کی وجہ سے ایک بہت چھوٹی اقلیت ہی اس کی توجہ کا مرکز ہے۔ سرکاری بیانات پڑھ کر یا اخباروں کا شور سن کر ایسا لگتا ہے کہ ہماری توجہ کا مرکز لاکھوں ناخواندہ مزدور نہیں بلکہ کالج سے فارغ ہونے والے صرف چند ہزار نوجوان ہیں، جن کو کسی بھی طرح تنخواہ والی نوکری چاہیے۔

جس طرح مزدور پیشہ عوام نے سرکاری مکانوں کا انتظار نہیں کیا اور اپنے مکان خود تعمیر کر لیے، بالکل اسی طرح پڑھے لکھے جوان سرکاری نوکریوں کا انتظار نہیں کرتے اور اپنا روزگار خود حاصل کرتے ہیں۔ میں نے اورنگی میں دریافت کیا کہ ان لوگوں نے افراطِ زر اور کساد بازاری کے دوہرے چیلنج کا جواب گھریلو بیوپار کی صورت میں دیا ہے؛ انھوں نے گھروں کو کارخانہ، اور اپنی عورتوں کو مردوں کی دست نگر اور مجبور فرد کی بجائے ایک برابر کا شریک معاشی کارکن بنا دیا ہے۔ ہم نے اس قسم کے ہزاروں گھریلو کارخانوں کو خودرو درختوں کی طرح اگتے ہوئے دیکھا جو اپنے مال کی کھپت کے لیے کراچی کی بہت بڑی منڈی سے منسلک ہیں۔ ان کی خدمات اور پیداوار کی بے حد مانگ ہے۔ سستی مزدوری اور اوپر کے اخراجات کی کمی کی بنا پر ان کا تیار کیا ہوا مال سستا ہے، اور اگر ان کو سرمائے کے لیے بطور قرض آسان شرائط پر رقم مل جائے تو ان کارخانوں میں ترقی کی بے حد گنجائش ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ چھوٹے بیوپاری باصلاحیت ہیں۔ ان کی محنت، اپنے اوپر کم خرچ، ہوشیاری اور عمدہ انتظام نے ہم کو بے حد متاثر کیا اور ہم نے ۱۹۸۷ء میں ایک وقف (اورنگی چیریٹیبل ٹرسٹ) رجسٹر کروایا تاکہ ان کو ترقی کے لیے قرض دیا جائے۔ ہم کو ان کی صلاحیت کے بارے میں تو کوئی شبہ نہیں تھا لیکن ان کے خلوص کے بارے میں یقین

نہ تھا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ رقم جو بطور قرض وہ لیں گے اس کی وقت پر واپسی بھی کریں گے۔ ہمارے ملک میں قرض لے کر نہ لوٹانے کا جو وتیرہ عام ہو گیا ہے، ہم کو خوف زدہ کرتا تھا۔ اس کے باوجود ہم کو قوی امید تھی کہ اگر وقف نے ان سے بہتر سلوک کیا اور ان کے ساتھ ایمان داری سے معاملہ کیا تو وقت کے ساتھ ساتھ قابلِ اعتماد گاہکوں کا ایک حلقہ وجود میں آ جائے گا۔ شروع کے دو سال میں بہت سے قرضے ڈوبے، دھونس اور دھمکی کا بھی سامنا کرنا پڑا، لیکن آہستہ آہستہ ایمان داری اور وفاداری نے جڑ پکڑ لی اور ہم کو خوشی ہے کہ ہمارا یقین، کہ چھوٹے بیوپاری ایمان دار ہیں، صحیح ثابت ہوا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مزدور پیشہ افراد محنت اور مہم جوئی کی عادت زندگی کے بے رحم مدرسے میں حاصل کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف کالج کی تعلیم ہم کو (میں بھی انھیں میں سے ہوں) نرم و نازک بناتی ہے۔ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ہم کو محفوظ اور بااختیار ملازمت ملے۔ ہم محنت اور خطرے سے منھ چراتے ہیں، مفت خوری کے قائل ہیں اور یہی مفت خوری ہماری رشوت اور کام چوری کی بڑی وجہ ہے۔

ہمارے پاس یہ کہنے کے بہت سے سبب ہیں کہ ہمارے مزدور پیشہ خاندان مہم جُو ہیں۔ لیکن ہم کو اس وقت زیادہ تعجب ہوتا ہے جب ہمارے گاہکوں میں کالج کے تعلیم یافتہ ایسے نوجوان بھی شامل ہو جاتے ہیں جو سختی برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ وہ خطرے کا مقابلہ کر کے اپنے گھریلو بیوپار کو منظم کرتے ہیں۔ یہاں ان چند تعلیم یافتہ بیوپاریوں کے مختصر خاکے پیشِ خدمت ہیں:

محمد جمیل، گلشن بہار، اورنگی سیکٹر ۱۶، میں رہتے ہیں۔ وہ بہاری مہاجر ہیں، اردو بولتے اور بنگال سے ہجرت کر کے کراچی آئے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۷۶ء میں بی اے پاس کیا اور کافی عرصے ملازمت کی تلاش میں مصروف رہے۔ وہ آٹھ افراد کے خاندان کے کفیل تھے، اس لیے آخر کار بیوپاری بن گئے۔ وہ اس روایتی دریا میں کود کر تیرتے ہوئے اس پار نکل گئے۔ چند سو روپے کے سرمائے سے، جس کو وہ مشکل سے جمع کر سکے تھے، انھوں نے ترکاری بیچنے کا کام شروع کیا۔ روزانہ صبح چار بجے اٹھ کر وہ سبزی منڈی اپنا سامانِ تجارت خریدنے جاتے ہیں، گھر کی

خواتین ترکاری صاف کرتی ہیں اور اس کو دھو کر الگ الگ ترتیب دیتی ہیں۔ مارچ ۱۹۹۱ء میں جمیل نے اپنے کام کو وسعت دینے کے لیے اورنگی وقف سے ۶۰۰۰ روپے قرض لیے۔ اب ان کی روزانہ آمدنی ۲۰۰ روپے ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی نے حال میں ایک اور دکان کھولی ہے؛ ان کی آمدنی ۱۰۰ روپے روز ہے۔ جولائی ۱۹۹۳ء تک محمد جمیل نے ۴۰۰۰ روپے مع ۷۰۰ روپے مارک اپ ادا کیے ہیں۔

مجدد طفیل، اورنگی کے سیکٹر ۱۴ ای میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بی اے کا امتحان ۱۹۸۹ء میں پاس کیا اور اس کے بعد ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ لیکن ان کو نوکری نہیں ملی، اور وہ تین مشینیں خرید کر کے پلاسٹک مولڈر بن گئے، لیکن یہ کام نہیں چلا۔ پھر فروری ۱۹۹۱ء میں اورنگی وقف سے دس ہزار قرض لے کر وہ گیس سلنڈر کی ایجنسی کے مالک ہو گئے۔ اب اس کام میں ان کی اچھی آمدنی ہے۔ شام سے پہلے وہ وکالت کرتے ہیں اور شام کو اپنی دکان پر بیٹھتے ہیں۔ وہ اب تک ۵۰۰۰ اصل اور ۱۶۰۰ روپے مارک اپ ادا کر چکے ہیں۔

محمد اسلم، سہراب جوکھیو گوٹھ، گڈاپ، میں رہتے ہیں۔ وہ سندھی ہیں۔ انھوں نے بی اے کی ڈگری ۱۹۹۰ء میں حاصل کی اور بہت دن سفید کالر والی نوکری کے لیے چکر کاٹے مگر ناکام رہے۔ ان کے والد نے، جو ایک ہوٹل اور دو ٹرکوں کے مالک ہیں، ان کو اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت بھی دی، مگر یہ کام محمد اسلم کو اپنی شان کے منافی لگا۔ بعد میں، کافی دھکے کھانے کے بعد، وہ اپنے ہوٹل میں کام کرنے لگے اور ٹرک چلانا سیکھ لیا۔ ۱۹۹۳ء میں انھوں نے اپنے ٹرک کی مرمت کے لیے وقف سے ۵۰ ہزار روپے قرض لیے۔ اب وہ بہت خوش ہیں کہ وہ ایک ٹرک کے مالک اور ہوٹل مینیجر ہیں۔ ان کی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے اور وہ چھ ماہ میں ۱۷ ہزار روپے اصل اور ۳۰۰۰ روپے مارک اپ ادا کر چکے ہیں۔

برنس سلیمان، بہاری مارکیٹ کے علاقے میں رہتی ہیں۔ وہ مہاجر ہیں۔ انھوں نے ہندوستان سے ۱۹۷۶ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور شادی کے بعد پاکستان آئیں۔ ان کے میاں بے روزگار تھے۔ برنس نے آرائشِ حسن کا کورس کیا اور سلائی کی تربیت بھی حاصل کی اور اپنے گھر میں چھوٹے پیمانے پر کام شروع کیا۔ ۱۹۹۲ء میں انھوں نے وقف سے ۱۵ ہزار

روپے قرض لے کر ایک زگ زیگ مشین خرید لی۔ پھر گھر ہی میں بیوٹی پارلر قائم کیا۔ اب ان کے پاس سلائی کے بہت سے گاہک ہیں اور آرائشِ حسن کے لیے بہت سی خواتین۔ وہ صبح کے وقت ایک اسکول میں استانی ہیں اور ان کے خاوند فوٹو گرافر۔ انھوں نے اب تک ۳۵۰۰ روپے اصل اور ۵۰۰ روپے مارک اپ ادا کیے ہیں۔

بدر جمال نے ۱۹۸۹ء میں بی اے کی ڈگری لی۔ تھوڑے ہی دن کے بعد ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ کیوں کہ وہ سب سے بڑی لڑکی تھیں، ان کو اپنی والدہ اور پانچ بھائی بہنوں کی دیکھ بھال کی ذمے داری قبول کرنی پڑی۔ ان کو کوئی نوکری نہیں ملی، اس لیے انھوں نے آرائشِ حسن کا کام سیکھا۔ انھوں نے ۱۵ ہزار روپے وقف سے قرض لے کر اپنے گھر پر ہی بیوٹی پارلر قائم کیا۔ ان کی دو چھوٹی بہنیں اس کام میں ان کی معاون بن گئیں۔ ان کا پارلر کامیاب ہے۔ اس کی آمدنی سے انھوں نے اپنی دو بہنوں کی شادی کی اور اب تک اصل رقم ۱۴۳۰۰ مارک اپ ۲۸۰۰ روپے کے ساتھ ادا کر چکی ہیں۔

رضوان میر، اورنگی کے سیکٹر ۷ ای میں رہتے ہیں۔ ان کے والد کا منافع بخش کاروبار تھا۔ جب ۱۹۸۳ء میں ان کا انتقال ہوا تو خاندان کے حالات خراب ہو گئے۔ مہم جُو والدہ نے سلائی کر کے خاندان کا خرچہ چلایا۔ بعد میں بڑی بہن سلمیٰ نے ایم اے پاس کر کے محکمۂ صحت میں لیڈی ہیلتھ ورکر کی نوکری کر لی۔ رضوان نے ۱۹۸۰ء میں بی ایس سی پاس کر لیا تھا لیکن ان کو ملازمت نہیں ملی۔ آخر میں ایک دوست کی شراکت میں اپنے ہی گھر میں کٹے پھٹے چمڑے کے ٹکڑوں کو جوڑ کر کار آمد بنانے کا کارخانہ قائم کیا۔ جولائی ۱۹۹۱ء میں رضوان نے اورنگی وقف سے ۴۵۰۰۰ روپے قرض لیے۔ اس قرض سے انھوں نے اپنے مکان میں ایک اور کمرہ تعمیر کیا اور کچھ نئی مشینیں خریدیں۔ کاروبار میں ترقی ہوئی اور اب اس کارخانے میں دس مزدور کام کرتے ہیں اور ۱۸ جزوقتی خواتین کارکن سلائی میں مدد دیتی ہیں۔ اس کارخانے میں چمڑے کے بٹوے اور تھیلے تیار ہوتے ہیں۔ رضوان کے دو چھوٹے بھائی، جو کالج میں پڑھ رہے ہیں، سلائی میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ رضوان نے ابھی تک اصل ۱۱۵۰۰ روپے اور مارک اپ ۴۵۲۰ روپے ادا کیے ہیں۔

محمد امجد، اورنگی کے سیکٹر ۱۵ ای میں رہتے ہیں۔ ان کی والدہ ایک مہم جُو خاتون ہیں۔ وہ

اورنگی کی پہلی پردہ نشیں خاتون ہیں جو او پی پی کی درخواست پر اپنے گھر میں ۱۹۸۴ء میں عورتوں کا پہلا سلائی مرکز قائم کرنے پر راضی ہوئیں۔ شروع میں ان کو قدامت پسند خواتین کی طرف سے بہت سے طعنے سننے پڑے، لیکن ان کی مستقل مزاجی سے یہ مرکز کاروباری اعتبار سے کامیاب ہو گیا اور وہ خود سفید پوش پردہ نشیں خواتین کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ بن گئیں۔ اب نو سال بعد اورنگی میں سلائی کے کئی سو ایسے مرکز ہیں جن کو خواتین خود چلا رہی ہیں۔ زاہدہ بیگم کا پہلا مرکز اب کم از کم سَو سلائی کرنے والی خواتین کو روزگار فراہم کر رہا ہے۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت میں ہے۔ ان کا دوسرا لڑکا امجد اس مرکز کے انتظام میں شروع سے شریک ہے۔ طالبِ علمی کے دور ہی میں وہ کام کی نگرانی کرتا تھا۔ بی اے کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اپنا پورا وقت کارخانے کو دے گا۔ وہ کارخانے کا ہمہ وقت مینیجر ہے، ایک مہم جُو ماں کا مہم جُو بیٹا۔ زاہدہ بیگم کو شروع میں ۷۵۰۰۰ روپے کی مشینیں دی گئیں۔ وہ اس رقم میں سے اب تک ۲۳۰۰۰ روپے ادا کر چکی ہیں۔ ان کو مکان کی دوسری منزل بنانے کے لیے ۶۵۰۰۰ روپے قرض دیے گئے جس میں سے اب تک ۴۴۰۰۰ روپے ادا کیے ہیں۔

اب جیسے جیسے ہم اپنا کام دیہات میں لے جا رہے ہیں، ہم کو وہاں بھی گریجویٹ بیوپاری مل رہے ہیں۔ جوکھیو گوٹھ کے اسلم کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ عبدالغنی جوکھیو بھی ہیں۔ وہ کراچی کے کسی آفس میں تعلقات عامہ کے افسر ہیں لیکن اپنے گاؤں ہی میں رہتے ہیں۔ ستمبر ۱۹۹۱ء میں انھوں نے اورنگی وقف سے ۲۰ ہزار روپے قرض لیے۔ اس قرض میں اپنے ۲۵ ہزار روپے شامل کر کے انھوں نے اپنے کنویں کو گہرا کیا اور اس میں ٹیوب ویل لگایا۔ پہلے وہ اور ان کے پڑوسی پانی پینے کے لیے خریدتے تھے اب وہ ان کو اپنے کنویں سے مل جاتا ہے۔ اس پانی سے اب وہ تین ایکڑ زمین میں جنگلی اور پھل دار درخت لگا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ترکاری کی کاشت بھی کی ہے جس سے اچھا نفع ہے۔ جب ان کا باغ تیار ہو گا تو آمدنی اور زیادہ ہو جائے گی۔ وہ اب تک ہماری تمام رقم اصل ۲۰ ہزار روپے اور مارک اپ ۳۷۱۲ روپے ادا کر چکے ہیں۔

آخر میں جوکھیو فقیر گوٹھ کے مشہور سماجی کارکن پاندی فقیر کے دو بیٹوں کا ذکر ضروری ہے۔ یوسف کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے، لیکن یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ وہ صرف بی اے

پاس کر سکے، اس لیے اب وہ ہومیوپیتھ ہو گئے اور انھوں نے گاؤں میں دواؤں کی دکان کھول لی۔ انھوں نے مارچ ۱۹۹۱ء میں اور نگی وقف سے دکان کو وسعت دینے کے لیے ۱۰ ہزار روپے قرض لیے۔ وہ اب تک تمام قرض ۱۶۲۵ مارک اپ کے ساتھ ادا کر چکے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی رسول بخش بھی بی اے پاس ہیں۔ وہ گاؤں ہی میں رہتے ہیں، اس لیے چالیس ایکڑ زمین پر جنگلی اور پھل دار درخت کا باغ اور ترکاری اور پان کی کاشت کر رہے ہیں۔

زندگی کا بے رحم اسکول ہمارے مزدور پیشہ عوام کو محنت، سادگی اور مہم جُوئی سکھاتا ہے۔ بد قسمتی سے کالج کی تعلیم سے ہم لوگ نرم و نازک، آرام پسند آسانی کے رسیا اور مُفت خورے ہو جاتے ہیں۔ ہم گریجویٹ شہریوں کو بھی مزدور پیشہ عوام کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔ ہم کو بھی محنتی، سادہ اور مہم جُو ہونا چاہیے، یہی ہماری نجات کا راستہ ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ کچھ لوگ پہلے ہی اس راستے پر رواں دواں ہیں۔ ہم کو امید رکھنی چاہیے کہ ہم شہر کے رہنے والے ان سے بہت زیادہ بڑھ کر آگے قدم اٹھائیں گے۔

کراچی کے گوٹھوں میں آزمائشی منصوبہ

کافی عرصے سے میں آزمائشی منصوبوں کا سچا طالب علم رہا ہوں۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں، جب ایوب خاں کا عروج تھا، مجھے موقع دیا گیا کہ میں کومیلا کوتوالی تھانے کو ایک تجربہ گاہ بناؤں جہاں زیادہ تر دیہی ترقی کے منصوبوں کو پرکھا جائے۔ دس سال کے اندر اندر یہ پروگرام — دیہی تعمیرات، کاشت کاروں کی امدادِ باہمی کی انجمن اور تھانے کا تربیتی مرکز — پیداوار بڑھانے میں اچھا معاون ثابت ہوا۔ دیہات میں روزگار کے مواقع وجود میں آئے اور آپس کی محبت اور دوستی میں اضافہ ہوا۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں، کچھ کم موافق حالات میں، میں نے اورنگی میں سینی ٹیشن کو بہتر کرنے اور صحت، تعلیم اور روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے آزمائشی منصوبے شروع کیے۔ اپنا بگل بجا کر میں ماہروں کو دعوت دیتا ہوں کہ اورنگی کا ان چار بنیادی ضروریات کے سلسلے میں دوسری کچی آبادیوں سے موازنہ کریں۔

ورلڈ بینک کے ماہر یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ پچھلے پندرہ سال میں اورنگی کے غریب عوام نے اپنے سرمائے (۶ کروڑ ۲۲ لاکھ ۴۰ ہزار روپے) سے اپنی زیرِ نگرانی ۵۲۲۳ گلیوں میں زیرِ زمین نکاسی آب کی پائپ لائنیں بچھائی ہیں اور اپنے ۸۰۸۸ گھروں میں فلش لیٹرین تعمیر کیے ہیں۔ وہ بغیر کسی بیرونی مدد کے ۵۰۹ نجی اسکول اور ۶۴۶ شفاخانے چلا رہے ہیں، اور ۱۱ ہزار سے زیادہ گھریلو کاروباری یونٹ، جہاں تقریباً ۵۰ ہزار افراد کام میں مصروف ہیں، اور ان میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شامل ہیں۔ بیرونی ماہر مجھ سے دریافت کرتے ہیں، "کیا دوسری کچی آبادیاں یہ سب کر سکتی ہیں جو اورنگی میں ہو رہا ہے؟" میرا جواب ہوتا ہے، "ہاں، یقیناً وہ یہ سب کر سکتی ہیں، اگر ان کے رہنما ایسا کرنا چاہیں۔ اُن کو کیا چیز ایسا کرنے سے روک سکتی ہے؟"

تین سال ہوئے، اورنگی میں بارہ سال کام کرنے کے بعد میں نے آس پاس کے گوٹھوں کا دورہ کیا۔ مجھے پہلے آئی سی ایس افسر کی حیثیت سے، پھر کومیلا اکادمی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے، پھر شعیب سلطان کے مشیر کی حیثیت سے گلگت اور داؤدزئی میں دیہات کی تعمیرِ نو سے دلچسپی ہوئی۔ اب میں نے دوبارہ، گویا آخری بار، دیہات کی تعمیرِ نو کا آزمائشی منصوبہ شروع کیا ہے۔ مجھے حیرت سے وہ وسائل یاد آتے ہیں جو مجھے ایک آئی سی ایس افسر یا اکادمی کے ڈائریکٹر یا آغاخان کے پروگرام میں حاصل تھے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ افسوس، میں ایک تنہا بوڑھا ہوں۔ لیکن مہربان قسمت نے آج بھی میری بڑھی ہوئی عمر کے باوجود مجھ سے روبنسن کروسو کی طرح نئے وسائل کی تلاش کا جذبہ اور ڈان کیہوٹے کی خواب دیکھنے کی صلاحیت نہیں چھینی ہے۔

آزمائشی منصوبوں میں معالجوں کے سائنسی طریقے استعمال کیے جاتے ہیں: مرض کے اثرات کا بغور مطالعہ، پھر صحیح تشخیص، اور آخر میں علاج۔ ہمارے دیہات کے آزمائشی منصوبے نے پچھلے تین سال میں کراچی کے آس پاس کے دیہاتوں کی کم زور معیشت کا غور سے مطالعہ کیا، اُس کے زوال کے اسباب دریافت کیے اور اُس کے بعد مشوروں کا ایک مجموعہ تیار کیا جس پر اگر عمل ہو تو دیہاتوں کی پیداواری صلاحیت بڑھ جائے گی اور وہ کراچی کے بازار سے پوری طرح منسلک ہوجائیں گے۔ مجھے یہاں کم الفاظ میں وہ کچھ بیان کرنے دیجیے جو میں نے کراچی کے آس پاس واقع گوٹھوں کے جمود کے اسباب اور اُن کی بنیادی تعمیر کی صلاحیت اور وہاں زراعت اور مویشیوں کی افزائش کے بارے میں ان تین سالوں میں سیکھا ہے۔

ہمارے مشاہدے کی ابتدا اورنگی سے چند کلومیٹر دور واقع بلوچی گوٹھوں سے ہوئی اور پھر اس کا دائرہ چالیس کلومیٹر دور واقع سندھی گوٹھوں تک پھیلا۔ یہ تمام گوٹھ بنجر علاقے میں ہیں جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے اور نہری نظام نہیں ہے۔ لیکن کومیلا کے برخلاف (جہاں ۱۹۶۰ء میں زمین کی اوسط ملکیت ۱.۷ ایکڑ تھی) ان گوٹھوں میں کاشتکاروں کے پاس زمین کے بڑے بڑے قطعے ہیں۔ ان گوٹھوں میں ہم کو کہیں بھی وہ روایتی بڑا ظالم زمیں دار، قدامت پسند وڈیرا نہیں ملا اور نہ مظلوم ہاری۔ اُن کی جگہ ہم کو بہت سے چھوٹے کاشت کار، گلہ بان اور بیوپاری ملے۔

ہم کو معلوم ہوا کہ کراچی کے قرب کی وجہ سے بہت سے دیہاتی ہجرت پر مجبور ہوئے ہیں اور

بہت سے لوگ ایسے کام کرنے لگے ہیں جن کا تعلق زراعت سے نہیں ہے۔ اس وجہ سے زمین تقسیم در تقسیم سے بچ گئی اور گوٹھوں میں بے روزگار مزدور بھی نہیں رہے۔ ہم نے دیکھا کہ یہ سب دیہات کراچی کے بڑے بازار سے، جہاں بے حساب دودھ، گوشت، پھل، سبزی، چارہ، جلانے کی لکڑی وغیرہ، ہر چیز کی مانگ ہے، سڑکوں اور رسل و رسائل کے نظام کی وجہ سے جڑ گئے ہیں۔ ہم کو یہاں ایک اُلٹی بات نظر آئی۔ ہزاروں ایکڑ خالی زمین، اتنے سارے گلہ بان اور کسانوں کے باوجود یہ لوگ کراچی کے بازار کو بہت کم مقدار میں ضرورت کی اشیا فراہم کرتے ہیں، کیوں کہ کراچی اپنی ضرورت کی چیزیں یا تو اندرونِ سندھ یا پنجاب سے یا بیرونِ ملک ڈنمارک، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے منگاتا ہے۔ روایتی طور پر بنجر علاقے کے کسان بارانی فصلیں اُگاتے ہیں یا پھر گائیں اور بکریاں پالتے ہیں۔ کراچی کے گوٹھوں کی معیشت بھی نیم زراعتی اور نیم گلہ بانی والی تھی۔ پچھلے پچاس سال میں ان کی پیداوار گھٹ گئی کیوں کہ زیادہ تر درخت کٹ گئے اور چراگاہیں زیادہ مویشیوں کی وجہ سے گھاس کھو چکی تھیں۔ درختوں کی کمی سے علاقے میں بارش کم ہو گئی اور ہوا میں نمی بہت کم۔ زمین میں گلے سڑے پتے نہ ہونے کی وجہ سے اُس کی قوت نمو میں کمی واقع ہوئی۔ پیداوار برابر گھٹ رہی تھی، مویشی لاغر ہو رہے تھے، اُن کی تعداد بھی برابر کم ہو رہی تھی۔ اسی لیے نوجوان گاؤں سے ہجرت کرنے پر مجبور تھے۔ وہ شہر میں مزدوری کرنا چاہتے تھے۔

یہ رویّہ اتنا غلط نہیں ہے۔ روایتی بارانی تمدّن اب بوڑھا ہو کر تھک گیا ہے۔ بچے والدین کی طرح اپنی روزی گاؤں میں حاصل نہیں کر سکتے۔ ایک انقلاب آنے والا ہے۔ خوش قسمتی سے جدید زرعی تکنیک نے ایک نیا راستہ دریافت کر لیا ہے۔ ایسے علاقے جو کراچی سے زیادہ بنجر، تقریباً ریگستانی ہیں، دوبارہ زیادہ پیداوار دے سکتے ہیں اور وہاں زیادہ مویشی پالے جا سکتے ہیں۔ ہم نے اس نئی تکنیک کو قومی زرعی تحقیق کے مرکز اسلام آباد، اور زرعی یونیورسٹی فیصل آباد سے حاصل کیا اور پھر اس کو اپنے ایک ایکڑ کے باغیچے میں اور دوست بلوچوں اور سندھیوں کے کھیتوں میں آزمایا۔

مجھے معلوم تھا کہ دیہاتی ضدّی اور قدامت پسند ہوتے ہیں۔ وہ کسی نئے طریقے کو اُس وقت تک نہیں اپناتے جب تک خود اپنی آنکھوں سے اس کے فوائد نہیں دیکھ لیتے۔ اس لیے اس نئی

تکنیک کو، جو بنجر زمین کو دوبارہ قابلِ کاشت باغ میں تبدیل کر دے، تجربے کے طور پر کسی پہلے رہنما کے کھیت پر دکھانا ہو گا۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے کارکن ناتجربہ کار تھے اور اُن کو ایک تجربے کا کامیاب فارم تیار کرنے کے لیے اپنے آپ کو ایک مشکل عمل سے گزارنا تھا: عملی تعلیم کے عمل سے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ سوئس سفارت خانہ ہمارے عملی تجربے کے پروگرام کو مالی معاونت فراہم کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ علمی معلومات حاصل کرنے میں کئی ماہ لگے اور اب ہم اس قابل ہیں کہ عملی طور پر کسانوں کی اپنی زمین پر تجربے کے باغ اگائیں۔

اس نئی تکنیک کے، جو کراچی کے دیہاتوں کو زرخیز بنا سکتی ہے، کون سے اجزا ہیں؟ اس وقت دیہی آزمائشی منصوبے کے تحت زراعت میں تین اور مویشیوں کی افزائش میں تین نئے طریقے متعارف کرائے گئے ہیں:

(الف) زراعت

۱۔ کم لاگت پانی کے وسائل میں ترقی، اُس کا ہوشیاری سے ذخیرہ، اُس کا احتیاط سے، یا تو پائپ کے ذریعے یا چھڑکنے والے فوارے سے استعمال۔ حب دریا کی وادی اور گڈاپ میں زیرِزمین پانی تو ہے، لیکن کنویں میں دوبارہ پانی جمع ہونے کی رفتار بارش کی کمی کے باعث بے حد سست ہے، اس لیے گہرے کنویں کھود کر بڑے نالوں کے ذریعے پانی دینے کی خواہش کو لگام دینے کی ضرورت ہے۔ کنویں سے بہت زیادہ پانی حاصل کرنے کی کوشش میں بہت سے کامیاب فارم ملیر اور دوسرے علاقوں میں ناکام ہوئے ہیں لیکن اب بھی لوگ یہی چاہتے ہیں کہ ان کو کسی طرح جنّت کی نہروں جیسا بہتا ہوا شیریں پانی مل جائے۔

۲۔ زمین کو روایتی بارانی انداز کی جگہ نئے طریقے سے استعمال کرنا، اُس کو ہموار کر کے باڑھ سے محفوظ کرنا، پانی کی ذخیرے کے آس پاس اور پھر اس میں جنگلی اور پھل دار درختوں کی کاشت کرنا اور نئی، بنجر علاقے کی گھاس چارے کے لیے اگانا۔

۳۔ ہوائی ملیں لگانا، تاکہ اُن کے ذریعے سستی توانائی حاصل ہو اور انجنوں کے تیل اور مستری کی مزدوری کا خرچ بچ جائے۔

(ب) مویشیوں کی افزائش اور دیکھ بھال

۱۔ بجائے اس کے کہ مویشی بنجر چراگاہوں میں کوڑے کے ڈھیروں میں خوراک کھوجتے پھریں، اچھی نسل کے چنیدہ مویشی مناسب انداز سے تعمیر شدہ باڑوں میں، جہاں ہوا، روشنی اور صفائی کا بندوبست ہو، رکھے جائیں۔

۲۔ متوازن خشک غذا جس میں ہرا محفوظ چارا ملا ہوا ہو، اُن کو وقت پر کھلانا چاہیے تاکہ وہ زیادہ دودھ دیں اور اُن کی صحت بہتر ہو۔

۳۔ ایسے گندے پانی کے تالاب باڑے کے قریب کھودنے چاہییں جس میں گوبر اور پیشاب جمع ہو اور جس سے بایو گیس اور امراض سے پاک کھاد مل سکے۔

اورنگی کی گلیوں میں جدید سینی ٹیشن تیزی سے اس وقت مقبول ہوا جب او پی پی کے ماہروں نے کم لاگت سے زیرِزمین پائپ لائن، مین ہول اور گھروں میں فلش لیٹرین تعمیر کرنے کا طریقہ دریافت کر لیا۔ اُسی تجربے کی روشنی میں اب ہم ہوائی مِل، بوند بوند پانی کے ذریعے کھیتوں کی سیرابی، باڑے اور اس کی سینی ٹیشن، بایو گیس کے تالاب اور خشک چارے کی مل کی قیمت کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری اب تک کی تحقیق اور آزمائش کی بنیاد پر ہمارے موجودہ مفروضات یہ ہیں:

۱۔ یہ جدید طریقے چھوٹے کاشت کاروں کے لیے موزوں ہیں، یعنی ایسے کسانوں کے لیے جو پانچ سے دس ایکڑ زمین کے مالک ہیں۔ ایسے کاشتکار کراچی کے آس پاس ہزاروں کی تعداد میں آباد ہیں۔

۲۔ ان نئے طریقوں کو اپنا کر وہ اپنی پیداوار اور نفع میں خاصا اضافہ کر سکتے ہیں اور کراچی کو اس کی ضرورت کی زراعتی اشیا فراہم کر سکتے ہیں۔

۳۔ زیادہ پیداوار کم خرچ پر حاصل کرنے سے نئے طریقے اپنانے والے کاشتکار پانچ سال میں اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ اس سرمائے کو واپس کر دیں جو ابتدائی طور پر ان کی ترقی پر صرف ہوا ہے۔ ہم نے تھلوں کے سلسلے میں یہ بات دیکھی ہے کہ وہ رقم جو مشینی بلاک کی تعمیر میں لگائی

گئی، بہت جلد نفع کے ساتھ واپس آ گئی۔ ہمیں امید ہے کہ بہت جلد ہم اپنا یہ تجربہ پورا کر لیں گے اور ہم کو علم ہو جائے گا کہ ہمارا یہ مفروضہ درست ہے یا نہیں۔

گوٹھ کے کسانوں کو بارانی تمدّن سے جدید زراعت اور مویشی بانی کی طرف لانے کے لیے تکنیکی مشورے اور آسان قرضے کی ضرورت ہے۔ شروع میں صرف زبانی مشورے سے کام نہیں چلے گا، تربیت یافتہ کارکنوں کے ذریعے بوند بوند پانی سے سیرابی یا فوارے کا نظام قائم کرنا ہو گا۔ بعد میں یہ مہارت خود بخود علاقے میں پھیل جائے گی؛ ہمارے کاریگروں کی سیکھنے کی صلاحیت کسی معنی میں چینی اور جاپانی کاریگروں سے کم نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ کس آسانی سے اورنگی کے راج مزدوروں نے کم لاگت سینی ٹیشن، یا ٹھلے والوں نے مشینی بلاک بنانا سیکھ لیا۔

ہم اس بات کا اہتمام کر رہے ہیں کہ کاشتکاروں کو تکنیکی مشورے کے ساتھ ساتھ قرض بھی آسانی سے مل جائے۔ اورنگی ٹرسٹ اب اس لائق ہے کہ نئے طریقوں کو آزمانے کے لیے درمیانی مدّت کے قرضے فراہم کر سکے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہم توقع کرتے ہیں کہ آزمائشی منصوبہ، اس کی تحقیق، اس کے ابتدائی مہم جویانہ تجربے اور اس کے نفع بخش قرضے، بڑی لیزنگ کمپنیوں کی توجہ ان باصلاحیت نئے گاہکوں کی طرف دلانے میں کامیاب ہوں گے، یعنی ان چھوٹے کسانوں کی طرف جن کے پاس تھوڑی سی زمین ہے اور جو اپنی محنت، سادگی اور ہوشیاری کی وجہ سے کامیاب بیوپاری بن سکتے ہیں۔

آزمائشی منصوبے کو اندازہ ہوا کہ جمود کے شکار بارانی تمدن کی تجدید ایک طویل عمل ہے، اور اس کے لیے تحقیق، این اے آر سی سے بار بار رابطہ، بے حد مطالعہ، ماہروں سے مشورے اور اس تمام معلومات کا عملی تجربہ، منصوبے کی کارکنوں کی ٹیم کی باقاعدہ تربیت اور قرضے کی آسانی ضروری ہیں۔ ہم کو پورا بھروسا ہے کہ ہمارے کامیاب تجربوں کو دیکھ کر بہت سے چھوٹے کسان ہمارے گاہک بن جائیں گے۔ ابھی سے ہمارے پاس امیدواروں کی ایک نئی فہرست تیار ہے۔ یہ لوگ آگے چل کر اس بنجر علاقے میں زراعت اور مویشی بانی کے شعبے میں ہونے والی ترقی کی حقیقی بنیاد قائم کریں گے اور پڑھے لکھے دیہی جوانوں کے لیے، جو نااُمید ہو کر اپنے خاندانی پیشے

زراعت کو ترک کر رہے ہیں، اس نمونے کے پیش رو ثابت ہوں گے۔

مجھے اس بات کو صاف طور پر بیان کرنا ہے کہ آزمائشی منصوبہ زراعت اور گلہ بانی کو جدید بنانے کے ساتھ ساتھ دوسرے پیشوں کی بھی تربیت دیتا ہے جن کا تعلق زراعت سے نہیں ہے۔ ایسے پیشوں میں صرف قرض کی ضرورت ہے۔ ہم نے دریافت کیا کہ چھوٹے بیوپار یا گھریلو صنعت اور کاریگری میں ترقی کی گنجائش ہے، بشرطے کہ سرمائے کی فراہمی کی صورت میں آسانی ہو۔ اورنگی چیریٹیبل ٹرسٹ (او سی ٹی) کے پاس ان کاموں کے لیے درخواستیں آ رہی ہیں۔

ابراہیم حیدری کے مچھیروں کے لیے اورنگی ٹرسٹ کا قرضہ ان کا نجات دہندہ ثابت ہوا۔ نجی قرض دینے والے ان سے ۲۰۰ فیصد سالانہ سود وصول کرتے ہیں (چوں کہ وہ مسلمان ہیں، اس لیے سود کو "پتی" کہتے ہیں) اور اس کے ذریعے مقروض کے نفع میں ایک تہائی کے شریک بن گئے ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں مَیں یوسف شاہ کی بے غرضی سے بے حد متاثر ہوا اور میں نے وہی فیصلہ کیا جو ۳۰ سال پہلے کومیلا میں کیا تھا کہ مہاجن یا قرض دینے والوں کے اثرورسوخ کو ختم کر دیا جائے۔ فروری ۱۹۹۳ء اور مئی ۱۹۹۵ء کے درمیان ہم نے ۱۴۷ مچھیروں کو ۴۹ لاکھ ۷۰ ہزار روپے قرض دیے۔ جنوری ۱۹۹۵ء تک وہ ہم کو ۳۵ لاکھ ۹۰ ہزار روپے اصل اور ۴ لاکھ ۸۲ ہزار ۳۶۴ روپے مارک اپ ادا کر چکے ہیں۔ ۳۵ مقروض اپنا پورا قرض ۱۳ لاکھ ۱۰ ہزار روپے ادا کر چکے ہیں۔ ابھی تک کسی قرضے کو معاف کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ہے۔ وقت کے قرضے عام طور پر تین سال میں اقساط کی شکل میں ادا ہوتے ہیں اور ان پر سود کی شرح ۱۸ فیصد ہے، جس میں آہستہ آہستہ کمی بھی ہوتی ہے، نہ کہ ۲۰۰ فیصد پر جو مہاجن وصول کرتے تھے۔ ہم ابراہیم حیدری کے اعدادوشمار کے تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

۱۔ ماہی گیری ایک ترقی کرنے والا کاروبار ہے۔

۲۔ مچھیرے ایک پائیدار تنظیم اور ایمان دار لیڈر پیدا کر سکتے ہیں۔

۳۔ مچھیرے بہت آسانی سے اپنی جان قرضے دینے والوں سے چھڑا سکتے ہیں، جن میں او سی ٹی بھی شامل ہے۔ اور

۴۔ کسی بینک کو ابراہیم حیدری کی تنظیم سے بہتر گاہک نہیں مل سکتے۔

ہم اب ابراہیم حیدری کی تنظیم کو ایک نیا منصوبہ دے رہے ہیں کہ وہ اپنے علاقے میں سوکھے چارے کی مل لگائیں، مویشیوں کے لیے صاف ستھرے باڑے تعمیر کریں، بایو گیس کا تالاب، زیرِزمین سینی ٹیشن کی لائن پوری بستی کے لیے ہو، تاکہ بستی کے لوگوں کی صحت اچھی رہے۔

میں اپنی بات کو اعدادوشمار کے گوشوارے کو پیش کر کے، جس میں دیہی قرضوں کی تفصیل ہے، ختم کرتا ہوں۔

قسم	قرضہ لینے والے	رقم	واپسی اصل	واپسی مارک اَپ
مویشی والے	193	39,96,000	28,66,000	4,82,551
مچھیرے	153	47,82,000	23,25,540	4,38,960
چھوٹے بیوپاری	167	23,25,540	13,37,845	2,80,074
زمین کی ترقی	62	15,26,320	9,58,616	1,88,586
میزان	575	12629860	7555591	1390167

ہمارے دیہی قرضوں کی واپسی شہری قرضوں کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔ ابھی تک صرف ۲۳۰۰۰ روپے رائٹ آف کیے گئے ہیں۔ چھ نئے تجرباتی طریقے، ابھی تک او سی ٹی کے سرمائے سے چل رہے ہیں۔ جب وہ مکمل ہوں گے تو اُن کو قرضے میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

دلدار گوٹھ کی اچھی زمین

تیرہ سال پہلے میں نے اورنگی آزمائشی منصوبہ اس خیال سے شروع کیا کہ کراچی کی سب سے بڑی کچی آبادی میں سینی ٹیشن، صحت اور روزگار کے مسائل کا مطالعہ کروں۔ ہم نے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ عوام نے کس طرح اپنے ان مسائل کو خود حل کیا، اور ان کے طریقوں کے مطالعے کے بعد ہم نے ایسے ادارے قائم کیے جو ان کو ان کوششوں میں امداد دے سکیں۔ دس سال کی تجرباتی تحقیق نے ہم کو بہت سے معاشی اور معاشرتی راستے دکھائے اور ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنے کام کے دائرے کو آس پاس کے دیہات تک پھیلائیں، لیکن ہمارے محدود وسائل اس ارادے کی راہ میں حائل رہے۔

پھر اچانک بلوے اور آتش زنی نے ہم کو دلدار گوٹھ تک پہنچا دیا۔ ۱۹۹۰ء میں حیدرآباد میں پیش آنے والے ایک واقعے کے ایک بالکل دیوانگی کے رد عمل کے طور پر اورنگی کی ایک بلوچ کالونی پر حملہ ہوا اور اسی گھر جلا دیے گئے۔ بلوچوں نے بھاگ کر دلدار گوٹھ میں اپنے قبیلے کے پاس پناہ لی۔ او پی پی نے امن قائم کرنے والے کا وہی فرض اپنے ذمے لیا جو اس نے ۱۹۸۶ء میں پٹھان اور مہاجر فساد کے سلسلے میں لیا تھا۔ کراچی کے کمشنر کی مدد سے او پی پی نے بلوچوں کے جلے ہوئے مکان دوبارہ تعمیر کیے اور بلوچوں کو واپس لا کر ان کے گھروں میں بسایا۔ اس امدادی کام کے سلسلے میں ہم دلدار گوٹھ گئے اور وہاں میری دوستی وڈیرے اللہ بخش اور اس کے رشتے کے بھائی محمد حسین سے ہو گئی۔

وڈیرے اللہ بخش نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ اخبار نویس ہمیں سمجھاتے ہیں کہ وڈیرے دولت اور ظلم کے عفریت ہیں۔ مجھے اللہ بخش میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ اس کی خوش حالی اور انداز قبیلے کے دوسرے بزرگوں سے کسی طرح مختلف نہیں تھے۔ اس کو قبیلے کی روایت کے

مطابق وڈیرا چُنا گیا تھا۔ وہ اپنے قبیلے کے لوگوں کی فلاح کے لیے فکرمند تھا اور وہ بھی اس کا مشورہ خوشی سے قبول کرتے تھے۔ بعد کے تمام لین دین میں ہم نے اس کو قابلِ اعتماد پایا۔

میری زندگی دیہات سدھار میں گزری ہے۔ میں نے کومیلا، داؤدزئی اور گلگت کے دیہاتوں میں کام کیا ہے۔ میں جب دلدار گوٹھ گیا تو قدرتی طور پر میں نے اس پر ایک ماہرانہ نظر ڈالی۔ مجھے بتایا گیا کہ دو سو سال پہلے کچھ رِند بلوچ قدرتی پانی کے چشموں کے آس پاس آٹھ دیہاتوں میں آباد ہو گئے تھے۔ دلدار گوٹھ، جو اورنگی سے دس کلومیٹر دور واقع ہے، ان آٹھ دیہاتوں میں سے ایک ہے۔ علاقہ خشک، بہت کم بارش والا ہے اور وہاں بہت کم کاشت ہوتی ہے۔ صرف جَو اور باجرا، بکریاں اور مویشی رندوں کی آمدنی کا ذریعہ ہیں لیکن اب زمین بالکل بنجر ہو گئی ہے۔ درختوں کے کٹنے اور زیادہ چرائی کی وجہ سے گھاس کم ہو گئی ہے اور اکثر دیہاتی اورنگی میں دودھ اور چارا بیچ کر یا گدھا گاڑی چلا کر یا مزدوری سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ اس کام سے وہ فاقہ کشی سے تو بچ جاتے ہیں لیکن غریبی کے دائرے سے نہیں نکل پاتے۔ جب میں نے لوگوں سے پوچھا کہ ان کی حالت کیسے بدلی جا سکتی ہے تو وہ بولے کہ اچھی نوکریوں اور نہروں کے ذریعے۔ گویا وہ تارے توڑ لانے کی فرمائش کر رہے تھے۔ کوئی بھی ان کو تنخواہ والی نوکریاں نہیں دے سکتا اور نہ ہی نہر فراہم کر سکتا ہے۔ لیکن میری بوڑھی آنکھیں ان کی بنجر زمین میں ترقی کے بہت امکانات دیکھ رہی تھیں؛ وہ امکانات جو وہ نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے ترقی کے اپنے خواب کو محمد حسین اور اللہ بخش تک منتقل کرنے کی کوشش کی۔

"دیکھو، تمھارے ۷۰ خاندان ہیں۔ ان کے پاس سات سو ایکڑ زمین ہے۔ پاس ہی کراچی کا اتنا بڑا بازار ہے جہاں لکڑی، ترکاری، پھل اور دودھ کی بے حد مانگ ہے۔ تمھارے مرد اور عورتیں اپنی زمین سے یہ سب اشیا پیدا کر سکتے ہیں اور نفع کما کر امیر ہو سکتے ہیں۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے؟"

وہ بولے، "ہمارے پاس کاشت کے لیے پانی نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا، "یہ درست ہے کہ تمھارے پاس نہری پانی نہیں کہ تم نواب شاہ کی طرح گنّا اور چاول اگاؤ لیکن تمھارے پاس چشمے کا پانی وافر مقدار میں ہے جس کو اگر تم کفایت سے صَرف کرو تو تم درخت اور چارا اگا سکتے ہو۔"

"کفایت سے خرچ کرنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"چشمے سے نکال کر گدھا گاڑی کی مدد سے چھوٹے پودوں کو ایک ایک پیالہ پانی دو جیسے بچے کو دودھ پلایا جاتا ہے۔ کیوں کہ بوٹے کی جڑ کو نم رکھنے کے لیے بس تھوڑی سی تری درکار ہے، اور جب یہ درخت بن جائے گا تو وہ ہوا اور شبنم سے اپنی نمی حاصل کرنے کا خود انتظام کر لے گا۔ درخت تمھاری زمین کو بہتر کریں گے اور جانوروں کے چارے کے کام آئیں گے اور اس طرح تم امیر ہو جاؤ گے۔"

شروع میں اللہ بخش اور محمد حسین متعجب ہوئے لیکن کافی بات چیت کے بعد محمد حسین، گدھا گاڑی کی مدد سے بچوں کو دودھ پلانے کے انداز میں درخت لگانے پر راضی ہو گیا۔ پھر اس نے اعتراض کیا۔

"ٹھیک ہے، ہم چشمے کا پانی گدھا گاڑی سے پہنچائیں گے، لیکن جب تک زمین ہموار نہ ہو اور بکریوں سے حفاظت کے لیے چاروں طرف باڑھ نہ لگائی جائے، ہم ترکاری یا درخت کیسے لگائیں گے؟ ہمارے پاس باڑھ لگانے اور زمین کو ہموار کرنے کے لیے رقم نہیں ہے اور نہ اچھی گائیں خریدنے کے لیے سرمایہ۔"

اورنگی چیریٹیبل ٹرسٹ اس مسئلے کو حل کر سکتا تھا۔ وہ ایسا ہی کام اورنگی میں گھریلو بیوپاریوں کو قرض فراہم کر کے کر رہا تھا۔ میں نے کہا، "او سی ٹی تم کو باڑھ لگانے اور گایوں کی خریداری کے لیے رقم قرض دے گا، اگر تم ہر ماہ قسط وار ادائیگی پر آمادہ ہو۔"

کچھ بحث مباحثے کے بعد محمد حسین کا اس بات پر اطمینان ہو گیا کہ چارے، ترکاری اور دودھ کی آمدنی سے ماہوار قسط ادا کی جا سکتی ہے۔

"لیکن"، اس نے فیصلہ کن انداز سے کہا، "ہم اپنی زمین رہن نہیں رکھیں گے۔"

"او سی ٹی رہن کی شرط نہیں رکھتا اور نہ زر ضمانت طلب کرتا ہے۔ اگر اللہ بخش اور ایک دوسرا بزرگ تمھاری ضمانت دے تو تم قرض لے سکتے ہو۔"

میں نے محمد حسین کو دعوت دی کہ وہ اورنگی آ کر ہمارے باغیچے میں ۱۶ قسم کے جنگلی درختوں کے پودے، ۱۴ قسم کے پھل دار درخت، ۸ قسم کی بنجر زمین کی گھاس اور جھاڑیاں دیکھے

جو اس کی بنجر زمین کو سونے کی کان میں تبدیل کر سکتی ہیں۔ وہ آیا اور اس نے سب کچھ غور سے دیکھا۔ اس نے ہمارے معاشرتی کارکنوں، حفیظ آرائیں اور اکرام چوہان، سے کافی دیر تک دل بڑھانے والی باتیں سنیں۔

فروری ۱۹۹۱ء میں اس نے وقف سے ۲۵ ہزار روپے قرض لیے۔ خود اس کے الفاظ میں وہ کانٹے میں اٹک گیا۔ اس نے مجھ سے کہا، "تم نے مجھے ایک طرح کی افیون دے دی۔ میں رات اور دن میں اب صرف اپنے باغ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔"

اس کی بیوی نے حفیظ آرائیں سے شکایت کی، "تم نے میرے بوڑھے آدمی کو کیا کر دیا ہے۔ وہ گھر میں بہت کم رہتا ہے۔ اس نے اپنا بستر یہاں سے اٹھا کر اپنے درختوں کے پاس ڈال لیا ہے اور اب وہیں سوتا ہے۔"

اپنی ذاتی بچت اور قرضے کی رقم سے اس نے چار ایکڑ زمین کو گھیر کر باڑھ لگا لی اور وہاں درخت لگائے۔ چند گائیں بھی خرید لیں۔ شروع میں ننھے پودوں نے اس کی محبت کا جواب نہیں دیا؛ بہت سے مُرجھا کر سوکھ گئے۔ پھر ایک خاندانی جھگڑے نے تقریباً اس کا دیوالیہ نکال دیا، ایک بھتیجے نے دوسرے بھتیجے کو قتل کر دیا تھا اور محمد حسین کو خاصی بڑی رقم معاملے کو دبانے میں صرف کرنی پڑی۔

لیکن وہ کام میں لگا رہا۔ اب اس کا باغ سرسبز ہے۔ اس کے پاس ۸۰ صحت مند ناریل کے درخت، ۵۰ چیکو، ۴۰ کھجور، ۱۵ انار اور بہت سے جنگلی درخت ہیں۔ اس نے چارا بھی اگایا ہے اور ڈھائی من دودھ روزانہ بیچ رہا ہے۔ اپنی بدقسمتی کے باوجود ابھی تک ۱۵ ہزار روپے ادا کر چکا ہے۔ وہ چشمے پر ایک چھوٹا ٹیوب ویل لگانا چاہتا ہے لیکن او سی ٹی اُس وقت تک نیا قرض نہیں دیتا، جب تک پُرانا قرض ادا نہ ہو جائے۔

محمد حسین ایک ایسا پیش رو ہے جس کی مثال دیکھ کر دوسرے لوگ نقل کرتے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں دودا خان ہے۔ اس کے پاس پہلے بھی مویشی زیادہ تھے؛ اب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی درخت، چارا اور ترکاریاں اگائے گا۔ دودا خان اچھا منتظم ہے۔ اس نے چشمے میں گہری کھُدائی کی، ایک بڑا پائپ ڈالا اور یوں زیادہ پانی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے چار ایکڑ

زمین اپنے لیے اور چار ایکڑ اپنے بھائی کے لیے گھیر لی۔ وہ کام سلیقے سے کرتا ہے۔ اس نے جھاڑیوں کی باڑھ کی جگہ پتھروں کی دیواریں بنائیں، اور جانوروں کے لیے صاف ستھرے طویلے تعمیر کیے۔ دودا خان نے ٥٠ ہزار روپے مارچ ١٩٩١ء میں قرض لیے تھے۔ اس رقم میں اس نے اپنی بچت شامل کی اور اپنا باڑا اور باغ مکمل کیا۔ اس کی فطری چالاکی اور محنت نے اسے بہت جلد امیر بنا دیا۔ مئی ١٩٩٣ء تک، صرف چودہ ماہ میں، اس نے ٥١ ہزار روپے واپس کر دیے۔ اگلی قسط میں اس کے قرض کا تمام مارک اپ ادا ہو چکا ہو گا۔ اس کے باغ میں ١١٧ ناریل، ١٠٠ کھجور، ٥٠ چیکو، ١٢ انار، بہت سے کیکر، سفیدے، بیر اور املی کے درخت ہیں۔ وہ روزانہ پانچ من دودھ ١٤٠٠ روپے کا بازار میں بھیجتا ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پچھلی فصل میں اس نے اپنی مرچ کی فصل ١١ ہزار روپے میں فروخت کی۔

دوسرے دیہاتی بیوپاری بھی او سی ٹی کے دفتر میں آئے۔ رسول بخش اور عبدالغنی جوکھیو گوٹھ سے، رحیم بخش رئیس گوٹھ سے، اور ان کے علاوہ بہت سے۔ رسول بخش نے قرض کی رقم سے اپنے کنویں اور پمپ کی مرمت کی، چارا اور ترکاری اگائی اور چالیس ایکڑ میں جنگلی اور پھل دار درخت لگائے۔ اس نے پانوں کی کاشت کے لیے ایک پنواڑ تیار کی۔ وہ اپنے کاروبار کو بڑھانے میں اتنا مصروف رہا کہ قرضہ واپس کرنے میں سست ہو گیا۔

عبدالغنی لین دین میں صاف ہے۔ اپنے بچت کے ٢٥ ہزار روپے اور قرض کے ٢٠ ہزار روپے ملا کر اس نے ٢٠ ایکڑ کا ایک منافع بخش فارم تیار کیا ہے جس میں پھل دار اور جنگلی درخت ہیں۔ اس نے تمام قرض ٢٠ ماہ میں ادا کر دیا۔

رحیم بخش نے اکتوبر ١٩٩٢ء میں ٣٠ ہزار روپے قرض لیے اور مئی ١٩٩٣ء تک ١٥ ہزار روپے واپس کر دیے۔ وہ ترکاری بیچ کر اچھی آمدنی کر رہا ہے اور اب اس کے پاس ٢٠ ایکڑ کا چیکو کا باغ ہے جس میں دوسرے جنگلی درخت بھی ہیں۔

قرض کی آسانی سے دیہاتی بیوپاری اپنی پیداواری صلاحیت بڑھانے میں کامیاب ہوئے اور ان کا کاروبار بہتر ہوا۔ بقر عید کے موقع پر یہ لوگ اندرونِ سندھ سے مویشی خرید کر لاتے، ان کو چند ہفتے اپنے پاس کھلا پلا کر موٹا کرتے اور پھر عید بازار میں فروخت کرتے ہیں۔ یہ دیہاتی اپنا آدھا نفع

مہاجنوں کو سود کی شکل میں دے دیتے تھے۔ ۱۹۹۵ء میں بلوچ دیہات کے بیوپاریوں نے مئی کے پہلے ہفتے میں او سی ٹی سے ۵ لاکھ ۶۵ ہزار روپے قرض لیے اور جون کے پہلے ہفتے میں تمام رقم ۹۶۸۵ روپے مارک اپ کے ساتھ لوٹا دی۔ یہ مارک اپ کل رقم کا صرف ۱۰۷ فیصد ہے۔ وہ اپنے منافعے کی صحیح مقدار بتانے میں بے حد محتاط تھے، لیکن ہمارے خیال میں ان کا خالص نفع ۲۰ فیصد سے زیادہ تھا۔ کسی بینک کو ایسے اچھے گاہک نہیں ملے ہوں گے جیسے او سی ٹی کے یہ بلوچ گاہک ہیں۔

دو سال تک ہم نے دلدار گوٹھ کے بلوچوں اور جوکھیو گوٹھ کے سندھیوں کو کراچی کے بازار کی ضرورت پوری کرنے کے لیے دیہاتی بیوپاریوں کے زیرِ انتظام مویشیوں کی افزائش اور باغ بانی اور جنگل بانی کے سلسلے میں مشورے فراہم کیے۔ ہمیں متعدد کاشت کار اور دیہاتی بیوپاری ایسے ملے جو بے حد ہوشیار، محنتی اور کفایت شعار تھے۔ یہ لوگ ہمارے مشوروں پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ اسی درمیان میں دوسرے دیہاتوں میں اِسی قسم کے لوگ اس کام کو غور سے دیکھ رہے تھے تاکہ اگر ان کو کام کامیاب ہوتا ہوا نظر آئے تو اس کی نقل کریں۔ جون ۱۹۹۳ء میں ہم نے اپنے پروگرام کو وسعت دی اور مئی ۱۹۹۳ء تک اسے ۲۲ دیہاتوں میں پھیلا دیا۔ اب تک ۱۴۱ دیہاتیوں کو قرضے دیے گئے ہیں، جن کی کل رقم ۲۷ لاکھ ۲۰ ہزار روپے ہے۔ ان میں ۱۹ قرضے زمین اور پانی کی ترقی کے لیے اور ۳۵ چھوٹے کاروبار چلانے کے لیے دیے گئے۔ اس رقم سے اب تک ۱۶ لاکھ ۴۰ ہزار روپے اصل اور ایک لاکھ ۶۷ ہزار روپے مارک اپ واپس آئے ہیں۔ اِن دیہاتی ہوشیار بیوپاریوں نے تھوڑے ہی عرصے میں خاصا نفع حلال طریقے سے کمایا ہے، دھوکے اور حرام طریقوں سے نہیں۔

ہم کراچی کے بازار کی کھپت، اپنے ہوشیار اور محنتی اور جزرس کاشت کار بیوپاریوں کے کام، ان کے پیداوار بڑھانے کی صلاحیت اور لین دین میں سوجھ بوجھ دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ میں تین سال کے اس تجربے سے حسبِ ذیل نتائج اخذ کرتا ہوں:

۱۔ کراچی میں اشیا کا ایک بہت بڑا بازار ہے اور دیہات اس بازار سے سڑکوں، ٹرک اور دوسرے ذرائع سے منسلک ہیں۔

۲۔ دیہاتوں کی زمین میں جنگلی درخت، پھل دار درخت، مویشیوں کے لیے چارا اگانے کی بنیادی صلاحیت موجود ہے۔

۳۔ اس صلاحیت کو بروے کار لانے کے لیے وہاں ہوشیار اور محنتی بیوپاری موجود ہیں جو زمین کو ترقی دے کر نفع حاصل کر سکتے ہیں۔

۴۔ ان لوگوں کو تکنیکی اور معاشی مشوروں کی ضرورت ہے جس سے ان کی سمجھ میں آئے کہ ان کی بظاہر بنجر زمین کیا پیدا کر سکتی ہے اور یہ کہ کراچی کے بازار میں کس چیز کی کب ضرورت ہے۔

۵۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان دیہاتی بیوپاریوں کو، رشوت اور سرکاری فیتے کے بغیر، بینک کی شرح پر بلا کسی رکاوٹ کے قرضے کی فراہمی ہو۔

۶۔ مشورے اور قرض کے لیے کسی بیرونی امداد کی ضرورت نہیں اور نہ شرحِ سود کم کرنے کی، اور نہ ہی اس کام کے لیے افسروں کی نئی فوج چاہیے۔ مشورے دوطرفہ تعلیم کا ذریعہ ہیں اور قرض ایک خود کفیل عمل۔

اپنے دیہاتوں کی اچھی زمین دیکھ کر میں سمجھتا ہوں کوئی معاشی یا تکنیکی وجہ ایسی نہیں ہے کہ کراچی کو یورپ کے کسان دودھ اور مکھن فراہم کریں جب کہ ہماری اپنی زمین درخت اگا سکتی ہے اور ہزاروں ہوشیار اور محنتی دیہاتی بیوپاری اس بات پر آمادہ ہیں کہ تھوڑے سے مشورے اور قرض کی مدد سے کراچی کی ضروریات پوری کریں۔

کراچی کے آس پاس کے بنجر دیہی علاقے کے لیے خود دیہاتی بیوپاریوں کی زیرنگرانی جنگل اگانے اور مویشی پالنے کا کام دیہی ترقی کا ایک کم خرچ اور تیز رفتار نسخہ ہے۔ مویشیوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں ہم کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سات ہزار سال پہلے اسی دریاے سندھ کی وادی میں ہاتھی، بیل اور بھینس کو پالتو بنایا گیا، اور جنگل اگانے کے سلسلے میں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ بابر بادشاہ نے "تزکِ بابری" میں، اٹک کے قریب، گینڈے کے شکار کا ذکر کیا ہے۔

ایک عاشقانہ شکوہ

اپنی مشہور نظم "شکوہ" میں ہمارے عظیم شاعر علامہ اقبال نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہم خدا سے بھی شکوہ کر سکتے ہیں، اور ہمارے بزرگ صوفی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محبت کرنے والوں کی شکایت ناپسند نہیں کرتا۔ اپنے اتنے بڑے پیش رووں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے میں اپنے اخباروں سے شکایت کر رہا ہوں، اس توقع کے ساتھ کہ یا تو مجھے معافی مل جائے گی یا میری بات کو نظر انداز کر دیا جائے گا، کیوں کہ تمام پڑھے لکھے لوگوں کی طرح مجھے بھی اخبار پڑھنے کی لت ہے۔ اگر کسی صبح اپنی روزانہ خوراک "ڈان" اور "جنگ" نہ ملے تو میرے اندر نشے کے توڑ والی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ میں ان دونوں اخباروں کا ۱۹۵۱ء سے حلقہ بگوش ہوں، جب سے میں پاکستانی بنا۔

لیکن پاکستانی اخباروں کے علاوہ میں برطانوی اور امریکی اخباروں کا بھی رسیا ہوں۔ میرا اُس نسل سے تعلق ہے جس کے بڑے بڑے رہنما، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے، مختلف تہذیبی اجزا کا مرکب تیار کرنے والے تھے۔ انھوں نے مغربی اقدار — روشن خیالی، انسان دوستی، غیرمذہبی سیاست، فرقہ واریت سے دوری — کا خیر مقدم کیا۔ ان کے لیے انگریزی زبان پاؤں کی بیڑی نہیں تھی، بلکہ ایک کارآمد ہتھیار کی حیثیت رکھتی تھی۔ اپنی تہذیب سے پوری طرح وابستہ یہ لیڈر اور ان کے پیروکار، یعنی ہم لوگ، آج کل کی متعصبانہ، بندر کی سی نقالی سے پوری طرح آزاد تھے۔ میں نے طالبِ علمی ہی میں بدیشی اخبار پڑھنے شروع کیے اور خوش قسمتی سے اب تک پڑھ رہا ہوں۔ میری عالمی ادب کی یہ لت برطانوی اور امریکی یونیورسٹیوں میں تعلیم کی وجہ سے تقویت پاتی رہی۔

تقابل عام طور پر غیر پسندیدہ ہوتا ہے لیکن ایک بوڑھے کے لیے، جس کا میرا جیسا پس منظر ہو، یہ ایک مجبوری ہے۔ امریکی اور برطانوی اخبارات میں بہت سی خرابیاں ہیں لیکن اس کے

باوجود وہ اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں، یعنی تجزیے، معلومات اور علم کی فراہمی میں مخلص ہیں۔ اگر کوئی بڑا مسئلہ یا بحران سامنے آتا ہے تو وہ اس کو نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ مسئلے کو کریدتے ہیں، اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کے بارے میں مختلف نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ میں نے بڑے افسوس کے ساتھ یہ مشاہدہ کیا ہے کہ ہمارے اخبارات اپنا یہ فرض مناسب طور سے انجام نہیں دیتے۔

میں ایک مثال دیتا ہوں: ۱۹۶۴ء سے میں بار بار امریکہ گیا ہوں۔ مجھے احساس ہوا کہ اس وقت امریکی قوم کو دو اہم مسائل کا سامنا تھا، اور ان مسائل کا اخبارات، ٹیلی ویژن، یونیورسٹیوں کے لیکچر ہال، کتابوں اور رسالوں میں چرچا تھا۔ اس وجہ سے ان مسائل کو نظر انداز کرنا ناممکن تھا۔ پہلا مسئلہ کالے امریکیوں کے ساتھ امتیازی سلوک کا اور دوسرا مسئلہ امریکہ کی ویت نام میں جنگ کا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کس طرح ذرائع ابلاغ عوام کی رائے کو ہموار کرتے ہیں۔ اس شوروغل کا اثر یہ ہوا کہ غربت کے خاتمے کا پروگرام وجود میں آیا اور ویت نام سے فوج کو واپس لانے کی تحریک نے جنم لیا۔

اُسی زمانے میں، یعنی ۱۹۶۴ء میں، میرے ملک پاکستان کو ایک اہم مسئلے کا سامنا تھا: مشرقی پاکستان میں عمومی بےاطمینانی، بنگالیوں میں پھیلتی ہوئی اجنبیت، ان کا احساسِ محرومی، ان کی شکایات اور مطالبات۔ میں اس زمانے میں مشرقی پاکستان کے شہر کومیلا میں رہتا تھا۔ میں بنگالی اخبارات کا مطالعہ اور بنگالیوں سے بات چیت کرتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ ہم ایک بڑے قومی بحران سے دوچار ہیں جو امریکہ میں کالوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور ویت نام کی جنگ سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ لیکن اسی زمانے میں جب میں کراچی آتا تو یہاں کے اخبار پڑھ کر ایسا لگتا جیسے کسی بحران کا وجود ہی نہ ہو۔ مشرقی پاکستان میں پھیلی ہوئی بےاطمینانی محض مٹھی بھر "شرپسندوں" کی وجہ سے تھی جو ہمارے پرانے دشمن ہندوؤں کے بہکاوے میں آگئے تھے؛ اور ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ بنگالی مسلمانوں کو دوبارہ اسلام اور پاکستان کے نظریے سے آشنا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ہمارے اخبارات اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر رہے، اور یہ فرض تھا مسئلے کو سمجھنا، عوام کو اس کے پیچ و خم سے آگاہ کرنا، ان کی سیاسی اور معاشرتی تربیت

کرنا۔ انجام یہ ہوا کہ بحران ایک انتہائی ہولناک حد تک پہنچ کر ختم ہوا۔

ہمارے اخبارات کی ناکامی کا ذمے دار حکومتِ وقت کے جبر کو گردانا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات محض جُزوی طور پر درست ہے۔ کسی ملک کی سیاست کی طرح وہاں کے اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ بھی اس ملک کے اجتماعی کردار، جذبات، امنگوں، اور ذہنی اور روحانی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ عمرانی نقطۂ نظر سے کسی ملک کے حکمران یا اس ملک کے اخبار اور ذرائع ابلاغ قومی کردار کے خالق نہیں، بلکہ مخلوق ہیں۔

ہماری تاریخ کا کوئی طالبِ علم معقولیت کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ مسلم ممالک میں فوجی آمریت اس لیے پنپتی ہے کہ ہم اپنے گزرے ہوئے شاہی زمانے کی پرستش کرتے ہیں۔ فاتح جرنیل ہمارے ہیرو ہیں اور ہم فوجی پریڈ دیکھ کر خوشی سے پھول جاتے ہیں۔

کسی بھی معاشرے کے قومی کردار کو بیان کرنا خطرے سے خالی نہیں، لیکن تجزیاتی تفہیم کی خاطر محتاط انداز میں کچھ باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ محض ایک سوال اٹھانے کی غرض سے میں کہتا ہوں کہ ہمارے اخبارات اور ذرائع ابلاغ ہماری ان بنیادی خصوصیات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں اور وہ ان ہی بنیادی خصوصیات کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

ان بنیادی خصوصیات میں سب سے نمایاں قدامت پسندی ہے۔ قدامت پسندی کی بنیاد تقلید پر ہوتی ہے۔ قدامت پسندی ہمیں کافروں (ایمان نہ رکھنے والوں)، زندیقوں (رسم و رواج کی پیروی نہ کرنے والوں) اور رافضیوں (منحرفوں) سے نفرت کرنا سکھاتی ہے۔ قدامت پسندی کا سب سے زیادہ زور رسم و رواج، عبادات اور عقیدے پر ہوتا ہے۔ قدامت پسندی سے ہمارے شدید لگاؤ کی وجہ سے نہ صرف یہ رسوم اور عقائد متبرک ہو جاتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ بہت سے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حلقے بھی پاک اور متبرک بن جاتے ہیں۔ جس چیز کو متبرک قرار دے دیا جائے، اس کی صرف عقیدت کے ساتھ تائید کی جا سکتی ہے، اس پر دنیاوی انداز سے تنقید نہیں کی جا سکتی۔ عقل کو صرف اس متبرک چیز کی تائید کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، پرکھنے کے لیے نہیں۔

ہم نے اپنی تاریخ کو بھی مقدس اور متبرک بنا لیا ہے۔ اپنے اماموں اور اسلاف کی تنقید یا ان

پر اعتراض کرنا گویا ان کی بے حرمتی کرنا ہے۔ صرف رافضی یا خارجی ان کی برائی تبرّے کی شکل میں کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے شاہی دور سے بے حد مسحور ہیں۔ ہم کو بار بار جتایا جاتا ہے کہ ماضی میں ہم بہترین اور عظیم ترین تھے۔ لہذا منطق کی رو سے آج بھی ہم بہترین اور عظیم ترین ہیں۔ خواہ اب ہم بظاہر عظیم ترین نہ رہے ہوں لیکن بہترین ضرور ہیں۔ اور اگر ہم اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلیں تو دوبارہ عظیم ترین ہو سکتے ہیں۔ ہماری گزشتہ عظمت کے اس بار بار پیٹے جانے والے ڈنکے نے ہم کو بڑائی کے ناقابلِ اصلاح خبط میں مبتلا کر دیا ہے۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے زوال اور ہماری شکست کا سبب ہماری اپنی اندرونی کمزوری یا تضاد نہیں بلکہ دشمنوں کی ریشہ دوانی اور سازش تھی۔ ہم کو خبردار کیا جاتا ہے کہ آج بھی ہمارے پرانے دشمن ہمارے خلاف ریشہ دوانیوں اور سازشوں میں مصروف ہیں۔ ہم کو پیش آنے والے زوال کی اس آسان تشریح نے اور اس اطلاع نے کہ ہمارے دشمن آج بھی ہمارے خلاف سازش میں مصروف ہیں، ہم کو مالیخولیا کا مستقل مریض بنا دیا ہے۔

بڑائی کے خبط اور مالیخولیا کے اس آمیزے سے ہمارا ایمان تو پختہ ہو جاتا ہے لیکن اس کی وجہ سے ہم غیر جذباتی تجزیے، خود تنقیدی کے تکلیف دہ عمل اور ماضی و حال کے متوازن جائزے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے لیے مستقبل کی ایمان دارانہ منصوبہ بندی ممکن نہیں رہتی۔

ہمارے اخبارات اور ذرائع ابلاغ اسی دائرے میں مصروفِ عمل ہیں اور ہماری قدامت پسندی، بڑائی کے خبط اور مالیخولیا کو تقویت پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور مجموعی طور پر، کئی محدودات سے قطع نظر، وہ اپنا یہ کام حیران کن عمدگی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

ہر صبح میں پہلا کام یہی کرتا ہوں کہ "ڈان" اور "جنگ" اٹھا کر اپنی قوم اور دنیا کے بارے میں پاکستانی نقطۂ نظر کی ایک خوراک لیتا ہوں اور دوسری خوراک، "اکانومسٹ"، "گارجین" اور "نیوزویک" کی۔ پھر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھ پر اس قدر مہربانی کی۔

خوشی کی تلاش

جب میں کالج میں پڑھتا تھا، میرے یورپی تاریخ کے پروفیسر نے یہ حکایت بیان کی: ایک بوڑھی عورت بحرِ اوقیانوس کے کنارے ایک جھونپڑی میں رہتی تھی۔ روزانہ طغیانی کے سبب سمندر کا پانی جھونپڑی میں آ جاتا اور وہ جھاڑو سے اسے نکالنے کی کوشش کرتی۔ ہمارے پروفیسر اس حکایت کو انیسویں صدی میں یورپ کے شاہوں کی جمہوری قوتوں کے خلاف سعیِ ناکام کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

اب مجھے اب اس حکایت کا دوسرا استعمال سمجھ میں آ رہا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے دوست اور میں بھی اُس بوڑھی عورت کی طرح سمندر کی طغیانی کو جھاڑو سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ناموزوں ہیں۔ ہماری ناموزونی محض اس لیے نہیں کہ ہم بوڑھے ہو گئے ہیں، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ہم وقت کی غالب روش کو خوشی سے قبول نہیں کرتے۔

ہم اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ قدیم دانش مند — چینی، ہندی یا مسلم — صحیح کہتے ہیں۔ انسانی روحانی اقدار اور دائمی فلسفے کی تشریح کرتے ہوئے یہ بزرگ تعلیم دیتے ہیں کہ اگر ہم خوش رہنا چاہتے ہیں تو ہم کو نفس کی جبلی خواہشات کو سختی سے قابو میں رکھنا ہو گا اور اپنے لالچ، شہوت، زیادہ کھانے کی خواہش اور ضروریات کو کم کرنا ہو گا اور سادگی، توکل اور بے غرضی اپنانی ہو گی۔

اس کے برخلاف زمانے کی غالب روش کا اعلانِ عام ہے کہ خوشی کے حصول کے لیے جبلّی خواہشات کی تسکین کرنا، اپنی ضروریات میں بے حد اضافہ کرنا اور زیادہ سے زیادہ دولت اور قوت حاصل کرنا ضروری ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی یا حال کسی زمانے میں بھی ان روحانی بزرگوں کا مشورہ

اکثریت نے قبول نہیں کیا؛ لیکن ہمارے اسلاف، خواہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، گو اس مشورے پر پوری طرح عمل پیرا نہیں تھے پھر بھی وہ اس کی سچائی سے انکار نہیں کرتے تھے۔

ہمارے دور کی غالب روش اس دائمی فلسفے کو بے جوڑ اور محض فراریت سمجھ کر رد کرتی ہے۔ آر ایس ٹانی (R S Tawney) اپنی کلاسیکی کتاب "مذہب اور سرمایہ داری کا عروج" میں بیان کرتا ہے کہ یورپ میں عقائد میں تبدیلی کیسے آئی اور کس طرح ایک ظالم سماج وجود میں آیا جس کی بنیاد صنعت اور عسکریت پر تھی اور جس نے بڑی تیزی سے تمام دنیا کو فتح کر لیا۔

مالکوم مگریج (Malcolm Muggeridge) نے ۱۹۵۸ء میں لکھا:

> "دنیا کی یہ بڑھتی ہوئی یکسانی، جو خواہش کی ہم آہنگی سے وجود میں آئی ہے، بظاہر اس کے متضاد رجحانوں میں چھپی رہتی ہے۔ چناں چہ ایسا لگتا ہے گویا روس، اس کے حلقہ بگوش ملکوں اور چین کے باشندے اشتراکیت چاہتے ہیں، امریکہ اور ان کے حلقہ بگوش آزادی کے خواہش مند ہیں۔ ہم مغربی یورپ والوں کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ ہم اپنی عیسائی تہذیب کو بہت اہمیت دیتے ہیں... پنڈت نہرو اور ان کے ساتھی بمشکل اپنے آپ کو اس پر یقین دلا رہے ہیں کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں وہ دراصل انگریزی طرز کی فلاحی اور پارلیمانی جمہوریت ہے... (لیکن حقیقت یہ ہے کہ) بہت کم روسی، چینی اور ان کے حلقہ بگوش اشتراکیت چاہتے ہیں؛ بہت کم امریکی آزادی اور بہت تھوڑے یورپی عیسائی یا کسی اور تہذیب کے خواہش مند ہیں اور بہت کم ہندوستانی جمہوریت یا فلاحی ریاست چاہتے ہیں۔ یہ سب، اور ان کے علاوہ تمام دنیا کے لوگ جس شے کے خواہش مند ہیں وہ وہی ہے جو امریکہ میں لوگوں کو حاصل ہو چکی ہے: جگمگاتے ہوئے شہروں میں چھ رویہ سڑک پر آتی جاتی چمکدار کاریں، جلتی بجھتی اشتہاری روشنیاں، شور مچاتے ہوئے موسیقی کے بکس، بلند و بالا عمارتیں، منزل بہ منزل آسمان کی طرف بڑھتی ہوئی... میں جب رات

کے وقت امریکی ریاست اوہایو کے ایتھنز شہر (کل آبادی ۲۴۵۰۰) میں داخل ہوا تو اندھیرے میں مجھے چار روشن، رنگین، چمکدار نشان نظر آئے۔ ان پر تحریر تھا: گیس، ڈرگز، بیوٹی اور فوڈ۔ میں نے اس وقت سوچا کہ یہ ہمارے دور کا کلام ہے جو نہایت آسان انداز میں پیش کیا گیا ہے...

"اس دنیا میں اب حقیقت میں نہ کوئی اشتراکی ہے اور نہ سرمایہ پرست، نہ کیتھولک نہ پروٹسٹنٹ، نہ کالا، نہ ایشیائی، نہ یورپی، نہ داہنے بازو والا نہ بائیں والا، نہ درمیانی، یہاں صرف ہمیشہ قائم رہنے والی خواہش ہے: گیس، نشے، خوبصورت عورت اور کھانے کی۔"

یہ بات تیس سال پہلے لکھی گئی تھی۔ پھر ہر گزرتے عشرے کے ساتھ اشیا کے حصول کی خواہش میں برابر ترقی ہوتی گئی۔ امریکی بلاشبہ اس چمک دار سڑک پر بہت آگے نکل گئے، لیکن ہر بڑا چھوٹا ملک تندہی سے ان کے نقشِ قدم پر رواں دواں ہے۔

ماہر اشتہار نویس اشیا کے حصول کے مسلک کے بڑے پادری ہیں۔ ان لوگوں نے بڑی ہوشیاری سے نفسیات کے سائنسی اصول اپنا کر، مغالطہ آمیز لطیف انداز میں ہمارے ذہنوں کو متاثر کیا ہے۔ انھوں نے ہمارے شعوری مصلحت پسند ذہن کو نظر انداز کر کے ہمارے تحت الشعور تک رسائی حاصل کر لی ہے۔

اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم سگریٹ خریدیں تو وہ اپنا وقت اس بات پر ضائع نہیں کرتے کہ سگریٹ نوشی اچھی ہے یا بُری۔ اس بحث میں پڑنے کے بجاے وہ خوبصورت تصاویر اور مناظر کے ذریعے سگریٹ نوشی کو دوسرے ممالک کی سیر اور امیر لوگوں کی صحبت سے وابستہ کرتے ہیں۔ سگریٹ ہاتھ میں لے کر ہم اٹلی میں پیسا کے مینار کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں یا مصر میں گیزہ کے ہرم کے آگے، یا سگریٹ منہ میں دبا کر ہم تیز دوڑنے والی موٹر کار میں سفر کرتے یا پُرکشش عورتوں کو دیکھ کر مسکرا رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے تحت الشعور کو یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ ایک خاص قسم کے جوتے پہن لینے سے ہم جاوید میاں داد بن جائیں گے اور ایک خاص برانڈ کی چاے پینے سے عمران خان، اور ایک اور برانڈ کی چاے کوئی بے حد حسین خاتون ہمارے لیے پیالی میں ڈال کر

بصد انداز پیش کرے گی۔ ہماری بسیارخوری کی خواہش کو یوں تقویت دی جاتی ہے کہ ہم سے کہا جاتا ہے کہ اگر ہم ایک خاص نام کی باضمے کی ٹکیا استعمال کریں تو ہر قسم کے مرغن کھانے زیادہ مقدار میں کھا سکیں گے۔ نفسیات کے علم سے فائدہ اٹھا کر یہ عیار اشتہار نویس، ہمارے بچوں کو ببل گم، ٹافی، سپاری اور مشروبات کا عادی بنا رہے ہیں۔

اشتہار بازی کے ان ماہروں کی مدد سے، جو گاہکوں کے لالچ کے جذبے اور یکایک مالدار ہو جانے کے خواب کو تقویت دینا جانتے ہیں، بہت سے ٹھگ حال ہی میں ہزاروں بیواؤں اور پنشن پانے والوں کی بچت ہڑپ کر کے روپوش ہو گئے۔ اشیا کے حصول کی خواہش اس وقت پنپتی ہے جب لالچ، شہوت، اور بسیارخوری کی طلب کو ترغیب دی جائے۔ اشتہار کے ماہر اس کالے جادو کے سوداگر ہیں ــــ اس معاملے میں وہ شیطان پر برتری کا نہ سہی، اس کی ہمسری کا دعویٰ ضرور کر سکتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواہش، شہوت اور بسیارخوری کے مخالف دانش مند بزرگوں کو شکست ہو گئی۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ ان کی بات آج بھی درست ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ شہوت، لالچ اور بہت کھانے کی خواہش ہم کو خوشی یا سکون نہیں دے سکتی کیوں کہ ان نفسانی جذبوں کو تقویت ہمارے اندر بےاطمینانی نفرت، بددیانتی اور تضاد کو جنم دیتی ہے جس کا لازمی نتیجہ انسانی معاشرے میں فساد اور دکھ میں اضافے کی شکل میں نکلتا ہے۔

سوائے جادوگروں یا بوجھ بجھکڑوں کے کون یہ کہہ سکتا ہے کہ زیادہ خرچ کرنے کی خواہش، گیس، نشے، حُسن اور کھانے کے مسلک نے امریکیوں کو واقعی خوشی بخشی ہے یا ہم جیسے نقالوں کو خوشی دے گا۔

میں اس گفتگو کو ایک اور حکایت پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اگلے وقتوں میں ایک بوڑھا صوفی تھا، حقیقی مُرشد، سادہ اور مطمئن۔ ایک دن اس کے دنیادار مرید گوشت کی زیادہ قیمت کی شکایت کرنے لگے۔

"ہم نے اس کو سستا کر لیا ہے،" مرشد نے کہا۔

"حضور، یہ کیسے ممکن ہوا؟" مرید بولے۔

مرشد نے جواب دیا، "اس طرح کہ ہم اس کو نہ کھائیں گے اور نہ خریدیں گے۔"
شاید صارف معاشرے کے بڑھتے ہوئے طوفان کا مقابلہ اسی طرح ممکن ہے۔
"کوئی بھی تمہاری اشیا کے حصول کی خواہش کا علاج نہیں کر سکتا سوائے دانش مندوں کے۔ جاؤ، ان کو تلاش کرو۔" (المعرّی۔)

اتحاد اور اختلاف

عیسائیت ایک عالمی مذہب ہے اور ایک عالمی تہذیب کی بنیاد ہے۔ آج کی دنیا میں یہ مذہب اتحاد کی تصویر کی جگہ اختلاف کا مرقع ہے۔ بلاشبہ اس کی زیریں سطح میں اتحاد کی جھلک ہے لیکن ہوشیار ناظر نہ تو اس بات سے انکار کرتے ہیں اور نہ اسے نظر انداز کرتے ہیں کہ اس میں یک رنگی کی کمی ہے اور انواع واقسام کے رنگ ہیں۔

ہمیں اپنے زمانے کے عیسائیوں میں پائی جانے والی اس عدمِ یک رنگی کے تین اہم پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنا ہوگا:

۱۔ رسومات میں ہم آہنگی کا وجود نہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف بہت سے فرقے اور گروہ موجود ہیں۔

۲۔ کوئی متبرک عیسائی سلطنت نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس بہت سی آزاد خودمختار ریاستیں ہیں۔ دوسرے معنوں میں کسی قسم کی سیاسی ہم آہنگی کا وجود نہیں۔

۳۔ اِن آزاد ریاستوں میں، ایک مشترکہ کلیسا ہونے کے باوجود، متصادم معاشی، معاشرتی اور مقامی مفادات اور گروہ بندیاں ہیں۔

پادریوں اور آمروں نے ہمیشہ اختلاف اور عدمِ مطابقت کو قابلِ نفرت سمجھا ہے۔ اپنے تاریخی ادوار میں عیسائی پادریوں اور آمروں نے اپنی پوری قوت ہم رنگی کو بزور نافذ کرنے پر صرف کی ہے۔

۱۔ انھوں نے فرقوں کے اختلاف کو مذہبی عدالتوں کے ہاتھوں جبر اور قتلِ عام کے ذریعے ختم کرنا چاہا۔

۲۔ انھوں نے بار بار ایک متبرک عیسائی شہنشاہیت قائم کرنے، اس کو وسعت دینے اور

مقامی لوگوں کی آزادی کی خواہش کو طاقت سے کچلنے کی کوشش کی۔

۳۔ انھوں نے اپنے وقت اور زمانے کے معاشی اور معاشرتی نظام کو قائم رکھنے کے لیے اسے مقدس اور متبرک قرار دیا اور اس کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کو زور اور قوت سے دبایا۔

عیسائیت کی ایک لمبی تاریخ ہے جس نے عیسائیوں کو چند سودمند سبق سکھائے ہیں:

۱۔ ظلم، جبر اور قتلِ عام سے اختلاف اور فرقوں کا خاتمہ ممکن نہیں۔ اختلاف کو دبانے کے بجائے اس کو برداشت کرنا فرقہ واریت کا اصل حل ہے۔

۲۔ ایک متبرک عیسائی مملکت جس میں تمام عیسائی علاقے شامل ہوں، ایک ایسا خواب ہے جو اس ناقص دنیا میں ممکن نہیں۔ مقامی اور علاقائی مفادات جلد یا بدیر ہر مملکت کو کمزور کر دیتے ہیں اور اس کے زوال کا سبب بنتے ہیں۔ اس ناقص دنیا میں عیسائیوں کو الگ الگ آزاد ریاستوں میں زندگی گزارنے پر آمادہ ہونا پڑے گا اور ان میں سے بعض ریاستیں غیرعیسائی بھی ہوں گی جیسے چین، ہندوستان، مصر اور جاپان۔

۳۔ ایک آزاد ریاست میں اندرونی اختلافات ـــــ معاشرتی، معاشی اور علاقائی مفادات یا گروہوں کے اختلافات ـــــ کو مذہبی درس سے یا عبادات اور گرجے کی رسوم پر عمل کروا کے نہیں مٹایا جا سکتا۔ ان اختلافات کو سیاسی عمل یا عدالتی فیصلوں یا اصلاح کے ذریعے کم کیا جا سکتا ہے۔ گرجے کی متبرک مُہر پرانے فرسودہ معاشی اور معاشرتی طریقوں کو ان طبقوں کے لیے قابلِ قبول نہیں بنا سکتی جو ان کو ناانصافی پر مبنی اور ظالمانہ خیال کرتے ہیں اور نہ ہی یہ مُہر باغی گروہوں کو مطمئن کر سکتی ہے۔

اندرونی امن اور استحکام کی خاطر معاشی اور معاشرتی نظام کو خدائی انداز میں کامل نہیں سمجھنا چاہیے جیسا قرونِ وسطیٰ کے پادریوں کا خیال تھا، بلکہ اسے انسانی اور نامکمل، ہمیشہ بدلنے والا اور قابلِ اصلاح سمجھنا چاہیے۔

عیسائیت کی طرح اسلام بھی ایک عالمی مذہب ہے اور اس کے ذریعے بھی ایک عالمی تہذیب وجود میں آئی ہے۔ آج کل دنیا میں اسلام میں بھی عیسائیت کی طرح اتفاق کی جگہ اختلاف

نظر آتا ہے۔ بلاشبہ زیریں سطح پر اتحاد موجود ہے، لیکن یہ ایک رنگارنگ اتحاد ہے۔ کوئی بھی ہوش مند ناظر اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ ملتِ اسلامیہ میں اتفاق کم اور اختلافی مسائل زیادہ ہیں۔ نظریہ پرست مبلغوں کے سوا کوئی بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسلم معاشرے میں بھی عدمِ ہم رنگی کی وہی تین خصوصیات موجود ہیں:

۱۔ عبادت میں رسمی ہم آہنگی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف بہت سے فرقے ہیں۔ (ہمارے مذہبی لٹریچر میں ان کی تعداد ۷۲ بیان کی جاتی ہے جو غالباً مبالغہ آمیز ہے۔)

۲۔ کوئی متبرک اسلامی سلطنت یا "خلافت" نہیں ہے۔ بہت سی آزاد خود مختار ریاستیں ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد غیر اسلامی ریاستوں، مثلاً چین، ہندوستان، یورپ اور امریکہ میں رہ رہی ہے۔ دوسرے معنی میں ان کے اندر کوئی سیاسی ہم آہنگی نہیں ہے۔

۳۔ خود ان خود مختار ریاستوں میں ایک مذہب کے باوجود مختلف معاشرتی، معاشی، علاقائی اور گروہی مفادات موجود ہیں۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں تخیل پسند مسلمان علما اور آمروں نے ملت میں ایک ہی قسم کی عبادات یا سیاسی اور معاشرتی یک رنگی کو بزور نافذ کرنے کی جو کوششیں کیں ان کا وہی انجام ہوا جو عیسائیوں کے علاقوں میں ہوا تھا۔

۱۔ ارتداد اور فرقہ واریت نہ تو مفتی کے فتوے سے پوری طرح ختم ہوئی نہ سلطان کی تلوار سے۔

۲۔ مسلم ریاستوں کی عمر عیسائی ریاستوں سے زیادہ نہیں ہوئی۔ دونوں آخرکار اندرونی بغاوتوں اور آپس کی جنگوں کے باعث پارہ پارہ ہو گئیں۔

۳۔ فتووں کے ذریعے کسی نظام کو دائمی نہیں بنایا جا سکتا۔ نہ فتووں کے ذریعے معاشی اور معاشرتی تبدیلی کو روکا جا سکتا ہے اور نہ انقلاب کو۔

ہمارے عیسائی ہم عصروں نے تاریخ سے مفید سبق سیکھے ہیں، لیکن ہم مسلمان اپنی ماضی کی تاریخ سے اتنے متاثر ہیں کہ اس کو تنقیدی نظر سے نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم اس سے مسحور ہو گئے ہیں۔ ہمارے زیادہ تر خیال پرست رنگارنگی میں اتحاد کے تصور کو اپنانے کے لیے آمادہ نہیں۔ وہ

اپنے قرونِ وسطیٰ کے پیش رو رہنماؤں کی طرح ملت میں یک رنگی اور تقلید کو دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔

۱۔ آج بھی ہمارے درمیان ایسے قابلِ احترام علما موجود ہیں جو بحث اور فتوے کے زور سے، اور اگر ضرورت پڑے تو طاقت کے ذریعے، ملحدوں اور مخالف فرقے والوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ملحد اور مخالف فرقے والے بھی، قرونِ وسطیٰ کی طرح، جنگ پر آمادہ ہیں۔ وہ لوگ جو صدقِ دل سے صلح چاہتے ہیں، یا جو خوشی سے عبادات میں فروعی اختلاف برداشت کرتے ہیں، ابھی تک ہمارے معاشرے میں کمزور اقلیت ہیں، گو ان کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

۲۔ جمال الدین افغانی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہمارے مقبولِ عام خیال پرست اسلامی ملت کے تصور کے قائل ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ہم بیسویں صدی میں خلافتِ اسلامیہ کے قیام کی اسی طرح کوشش کریں جیسی کوشش صحابہ نے ساتویں صدی میں کی تھی۔ ملتِ اسلامیہ کے یہ داعی ہم سے توقع رکھتے ہیں کہ اس قومیت کے دور میں، ہم شہنشاہی جاہ و جلال سے محبت کا رشتہ قائم کریں گے۔

ملتِ اسلامیہ کے خدائی فوجدارانہ تصور کو اس وقت بے حد دھچکا لگا جب کمال اتاترک نے خلافتِ اسلامیہ کے خاتمے کا اعلان کیا، جب کہ ہمارے جوشیلے لیڈر محمد علی جوہر ہندوستانی مسلمانوں کو خلافت کے نام پر منظم کر رہے تھے اور عرب قومیں اس کے خلاف بغاوت کر رہی تھیں۔

میں خود اپنی نوجوانی میں علامہ مشرقی کے غلبۂ اسلام کے نظریے کا قائل تھا۔ اس نظریے میں ہندوستانی مسلمانوں کو محمود غزنوی اور بابر بادشاہ کے انداز سے بزور پورے ہندوستان پر قبضہ کر کے اسلامی مملکت قائم کرنے پر اکسایا جاتا تھا۔

اب، ایک بوڑھے احمق کی طرح، میں اس خوابِ پریشاں کی قوت پر غور کرتا ہوں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ میری مملکتِ اسلامیہ کے احیا کی خواہش اتنی ہی غیر منصفانہ تھی جیسی مسولینی کی قدیم رومن مملکت کو دوبارہ قائم کرنے کی خواہش۔ اپنے اس احمقانہ احساس میں یقیناً میں ایک تنہا شخص ہوں۔

ہماری اپنی پاکستانی ریاست، دوسری ریاستوں کی طرح، معاشی، معاشرتی اور صوبائی اختلافات سے دوچار ہے۔ ہم اس معاملے میں خوش نصیب ہیں کہ ہمارا ایک ہی مذہب ہے۔ یہ ایک قیمتی معاشرتی اور اخلاقی بندھن ہے، اور نہایت قیمتی ورثہ۔ لیکن ہم کو اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے کہ مشترک مذہب ہمارے معاشی، معاشرتی اور علاقائی نوعیت کے اختلافات کا سدباب یا خاتمہ کر سکتا ہے۔ ہم کو بنگالی مسلمانوں سے اپنے خراب تعلقات کی قریبی تاریخ سے سبق سیکھنا چاہیے۔ کوئی بھی انسانی ادارہ خاندان سے زیادہ قدیم یا پائیدار نہیں ہے، لیکن یہ ادارہ بھی، اگر اختلافات کا حل تلاش نہ کیا جائے تو پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

ہماری بیسویں صدی میں کسی بھی آزاد ملک میں پائے جانے والے معاشرتی، معاشی اور علاقائی اختلافات روایتی مذہب کے رسم و رواج سے حل نہیں ہوتے۔ یہ صرف ان اداروں کی سچی اور ایماندارانہ کوشش سے حل ہوتے ہیں جو اس جدید دور میں ان کے حل کے لیے وجود میں آئے ہیں، یعنی سیاسی جماعتیں، مخصوص مفاد رکھنے والے گروہ، انتخابات، قانون ساز مجالس، عدالتیں، اخبارات اور کھلے عام بحث اور مباحثے۔

ہم کو اس اتحاد کا ممنون ہونا چاہیے، گو یہ محدود ہے، جو روایتی مذہب نے ہم کو فراہم کیا ہے۔ ہم کو شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہمارے تمام اختلافات اور جھگڑوں کے باوجود، ہمارے متصادم مفادات کی موجودگی میں، ہم مساجد میں نماز پڑھنے کے لیے جمع ہوتے ہیں اور عید کے روز اپنے دشمنوں سے گلے ملتے ہیں۔ لیکن ہم کو اس مغالطے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ مسجد میں حاضری دینے اور عید کے دن دشمنوں سے گلے ملنے سے ہمارے بنیادی اختلافات، جن کی بنیاد ناجائز اختیارات، استحصال، ظلم، زیادتی اور دشمنی پر ہے، ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔ اس پسندیدہ حالت کے حصول کے لیے کسی اور چیز کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ یہ حالت صرف رسمی نماز، مسجد کی حاضری اور عید ملنے سے حاصل نہیں ہو گی۔

اورنگی کے کام کی نقل

کچھ شکی مزاج حضرات مجھ سے اکثر یہ سوال پوچھتے ہیں: "کیا اورنگی کے کام کی نقل دوسرے علاقوں میں ممکن ہے؟" پھر میرے جواب کو رد کرتے ہوئے خود ہی اعلان کرتے ہیں: "نہیں، یہ ناممکن ہے، کیوں کہ اورنگی ایک مثالی بستی ہے اور آپ خود ایک مثالی اور غیر معمولی شخصیت ہیں۔" اور یوں گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔ افسوس، یہ شکی مزاج افراد ہمارے خواص میں سے ہیں؛ وہ وی آئی پی ہیں، یعنی موجودہ دور میں ہمارے مقدر کے مالک۔

اس کے برخلاف، بہت سے غریب فعال کارکن دوسری بستیوں سے اورنگی یہ دیکھنے آتے ہیں کہ کس طرح غریب عام انسانوں نے، اپنے علاقے میں زیرِزمین نکاسی کی پائپ لائنیں ڈالیں، حفظانِ صحت کے اصول سیکھے اور خاندانی منصوبہ بندی کو اپنایا، اپنی برداری میں اسکول خود چلائے اور چھوٹے کاروبار منظم کیے۔ وہ بڑی توجہ سے او پی پی کے طریقے کا مطالعہ کرتے ہیں، کہ وہ کس طرح معاشرتی، تکنیکی تربیت اور قرض فراہم کرتی ہے۔ کافی تفتیش اور چھان بین کے بعد وہ مجھے بتاتے ہیں کہ ان کی بستیوں میں بھی یہی مسائل ہیں اور وہ ان کو اسی طرح حل کریں گے۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار شکی مزاجوں کے برخلاف یہ چھوٹے کارکن میری شخصیت کے سحر سے (جو بڑی حد تک فرضی ہے) پسپا نہیں ہوتے۔ ان کو میرے کام کا طریقہ واقعی اچھا لگتا ہے، وہ طریقہ جو ان کی بستی میں بھی کارآمد ہو سکتا ہے اور ان میں سے بعض نے اس کی نقل شروع کی ہے۔ یہ رُجحان تین چار سال سے شروع ہوا ہے اور اب آہستہ لیکن یقینی طور پر آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے دوسری بستیوں میں اورنگی کے پروگراموں، مثلاً کم لاگت سینی ٹیشن اور چھوٹے بیوپاریوں کو قرض کے پروگرام، کی نقل کی کچھ مثالیں دینی چاہییں۔

جب او پی پی نے ۱۹۸۰ء میں اورنگی میں اپنے تحقیقی پروگرام کی ابتدا کی، اُس وقت اچھے

سینی ٹیشن کے نظام، یعنی فضلے اور گندے پانی کے نکاس کے مناسب انتظام، کی کمی وہاں کا سب سے اہم اور پریشان کن مسئلہ تھا۔ لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے مکان تو تعمیر کر لیے تھے، لیکن گندگی گلیوں میں بہہ رہی تھی جس سے ان کی صحت اور مکان تباہ ہو رہے تھے۔ اپنے لیڈروں کے خوش کرنے والے وعدوں سے مسحور ہو کر لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ سینی ٹیشن کی لائنیں حکومت کے ادارے مفت فراہم کر دیں گے۔ ایک سال کی تحقیق کے بعد او پی پی ایک دوسرے نتیجے پر پہنچی، لہذا اس نے اورنگی کے باسیوں کو یہ مشکل پیغام دیا کہ تم اپنی گلیوں میں سینی ٹیشن لائنیں اپنے خرچ پر خود ڈالو، اور اس کی نگرانی بھی خود کرو؛ گلی کو اپنے مکان کا حصہ سمجھو اور اس کی اسی طرح دیکھ بھال کرو جیسے اپنے مکان کی کرتے ہو۔ اس صورت میں تم کو تھوڑا وقت اور روپیہ خرچ کرنا ہوگا، لیکن اس سے یہ نفع ہوگا کہ تمہاری صحت بہتر ہوگی اور مکانات محفوظ رہیں گے۔ دوسری صورت میں تم کو بہت دن حکومت کے مفت لنچ کا انتظار کرنا پڑے گا۔ بدقسمتی سے تمہارے افسران ظالم اور راشی ہیں؛ ان کے لیے اورنگی کی چھ ہزار گلیوں میں سینی ٹیشن لائن ڈالنا اور پھر ان کی دیکھ بھال کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ اور اس وقفے میں، جو انتظار میں گذرے گا، ناسور کی طرح پھیلتی ہوئی گندگی تمہارے علاقے میں بیماریاں اور سیم و تھور لائے گی۔ او پی پی نے گلیوں میں تنظیم قائم کرنے کے لیے معاشرتی رہنمائی اور کم لاگت سینی ٹیشن کے لیے تکنیکی مشورہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ شروع میں کچھ بڑبڑاہٹ سننے میں آئی، لیکن آخرکار اورنگی کے باسیوں نے مفت سینی ٹیشن کے موہوم خیال کو ترک کر دیا۔ وہ سہارے کے پھندے نکل آئے اور اپنی ترقی کی ذمے داری خود قبول کر لی۔ پندرہ سال میں، یعنی ۱۹۸۱ء سے مئی ۱۹۹۶ء تک، وہ ۵۶۱۰ گلیوں میں زیرزمین سینی ٹیشن لائنیں (۱۴۰۶۵۶۶ رننگ فٹ)، ۳۹۸ درمیانی نالے (۱۶۳،۵۴۳ رننگ فٹ) اور ۸۵ ہزار فلش لیٹرین اپنے مکانوں میں تعمیر کر چکے ہیں۔ انھوں نے اس کام پر اپنی جیب سے اب تک ۶ کروڑ ۷ لاکھ سات ہزار ۴۰۴ روپے خرچ کیے ہیں۔ اس کے عوض انھوں نے سیم و تھور پر قابو پایا ہے، اپنی صحت کو بہتر اور مکانوں کو محفوظ کیا ہے، مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت ابھاری اور اتحاد واتفاق پیدا کیا ہے، اور یوں اورنگی دوسری غریب بستیوں کے لیے نمونے کا تجرباتی مرکز بن گیا۔

سینی ٹیشن کے اچھے نظام کا نہ ہونا کچی آبادیوں کی تباہی کا ویسا ہی بڑا سبب ہے جس طرح یہ اورنگی کی تباہی کا سبب تھا۔ اور اس خطرناک تباہی کے سبب کو ختم کرنے کا آسان اور مستقل طریقہ وہی ہے جو اورنگی کے لوگوں نے اختیار کیا۔ دوسری بستیوں کے فعال کارکن جو اورنگی میں آئے، اس طریقے سے بے حد متاثر ہوے۔ انھوں نے گھنٹوں گلیوں کے منتظموں اور او پی پی کے معاشرتی کارکنوں اور تکنیکی معاونوں سے بات چیت کی۔ مئی ۱۹۹۶ء تک او پی پی کے تربیت یافتہ فعال کارکنوں نے حسبِ ذیل کچی آبادیوں میں اپنے خرچ پر کم لاگت سینی ٹیشن نظام شروع کیا ہے:

(الف) کراچی کی کچی آبادیاں (سندھ کچی آبادی اتھارٹی کی شراکت میں): (۱)چنیسر گوٹھ، (۲)منظور کالونی، (۳)اسلامیہ کالونی، (۴)بھٹائی کالونی، (۵)ویلفیئر کالونی، (۶)مجاہد کالونی، (۷)جمالی کالونی، (۸)مدینہ کالونی، (۹)عمر کالونی، (۱۰)برمی کالونی، (۱۱)بلوچ کالونی، (۱۲)عوامی کالونی، (۱۳)پیر آباد، (۱۴)واحد کالونی، (۱۵)ضیاء الحق کالونی، (۱۶)شاہ رسول کالونی، (۱۷)علی محمد گوٹھ، (۱۸)طیب آباد، (۱۹)کوثر نیازی کالونی، (۲۰)پاک پیپلز کالونی، (۲۱)سلطان آباد، (۲۲)راجپوت کالونی (۲۳)ٹکری اور (۲۴)ہزارہ کالونی۔

(ب) سکھر (یونیسیف کے اربن بیسک سروسز پروگرام کے تحت): تین کچی بستیاں۔

(ج) حیدر آباد (ورلڈ بینک شیلٹر پروجیکٹ کے تحت): چار کچی آبادیاں۔

(د) لاہور: پانچ کچی آبادیاں۔ یوتھ کمیشن فار ہیومن رائٹس (YCHR) نے وہاں ساؤتھ ایشین پارٹنر شپ اور سوئس سفارت خانے کی مدد سے ایک تکنیکی ادارے کی بنیاد رکھی ہے۔ ان کے پاس تکنیکی مشورے حاصل کرنے کی درخواستیں آ رہی ہیں۔ یوحنا آباد نامی ایک مسیحی کالونی کے لوگ بھی یہ کام کر رہے ہیں۔

(ر) گوجرانولہ: ایک کچی آبادی۔ آرگنائزیشن فار پارٹیسپیٹری ڈویلپمنٹ (OPD) نامی ایک غیر سرکاری تنظیم نے بھی بیرونی امداد سے ایک تکنیکی مرکز قائم کیا ہے۔

(س) فیصل آباد: تین کچی آبادیاں۔

(ش) سیالکوٹ: ایک کچی آبادی۔

(س) اوکاڑا: ایک کچی آبادی۔
اس کے علاوہ ہر مہینے دوسرے غیر سرکاری ادارے اورنگی میں تکنیکی اور معاشرتی تربیت حاصل کرنے کے لیے آرہے ہیں۔

کم لاگت سینی ٹیشن کے ساتھ ساتھ چھوٹے بیوپاریوں کو بلارہن قرض کا پروگرام بھی کمیونٹی تنظیموں میں مقبول ہورہا ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری کے دوہرے چیلنج کے مقابلے کے لیے غریب مزدور پیشے طبقے نے دوسری جگہوں کی طرح اورنگی میں بھی اپنے گھروں میں کاروبار شروع کیے ہیں۔ یہ لوگ اپنے گھروں کو کارخانوں میں تبدیل کررہے ہیں، جہاں ان کی عورتیں ان کے اوپر بوجھ بننے کی جگہ ان کے کام میں شریک ہو گئی ہیں، اور اب پورا خاندان مل کر کام کرتا ہے۔ ان گھریلو کارخانوں کا اوپری خرچ کم ہے اور مزدوری بھی، اس لیے یہ باقاعدہ کارخانوں سے بخوبی مقابلہ کرسکتے ہیں۔ ان کی مصنوعات کی بازار میں مانگ ہے۔ ان کا کام تیزی سے بڑھ سکتا ہے اگر ان کو قرض کم شرح سود پر اور آسانی سے مل جائے، لیکن یہ لوگ عام طور پر تسلیم شدہ بینک سے قرض اس وجہ سے نہیں لے سکتے کہ وہاں کا طریق کار دشوار ہے اور رہن کی شرط ہے، اس کے علاوہ اہلکاروں کو رشوت بھی دینی پڑتی ہے۔

ستمبر ۱۹۸۷ء میں اورنگی چیریٹیبل ٹرسٹ رجسٹر کروایا گیا تاکہ ان چھوٹے بیوپاریوں کی ضرورت کو پورا کیا جاسکے۔ او سی ٹی نے شروع میں بینکوں سے ان کی عام شرائط پر بلارعایت قرض لیا، اور پھر اس رقم کو اورنگی میں چھوٹے بیوپاریوں کو اسی مارک اپ پر رہن اور رشوت کے بغیر اور آسان شرائط پر قرض دے دیا۔ او سی ٹی زیادہ خطرات اس لیے برداشت کرسکتا ہے کیوں کہ وہ لوگوں کی رقم کا بینک کی طرح امانت دار نہیں ہے، وہ ان کی رقم جمع نہیں کرتا، نہ حق خدمت یا نفع کمانے والا ادارہ ہے۔ اس کے حصے دار بھی نہیں ہیں جن کو اس سے منافع کی توقع ہو۔ اس کے علاوہ اسے بینک آف کوآپریٹوز، سوئس سفارت خانے اور سب سے بڑھ کر بی سی سی آئی سے عطیات موصول ہوتے ہیں۔ اب ٹرسٹ نے اپنا ریوالونگ فنڈ قائم کرلیا ہے۔

او سی ٹی کو بلارہن رکھے قرض دینے میں جو خطرات تھے ان کا پوری طرح احساس تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ہمارے معاشرے کے امیروں اور غریبوں میں روپیہ واپس نہ کرنے کا عام رواج ہے،

یہی نہیں بلکہ دھونس اور دھمکی بھی عام ہے۔ اس کے باوجود او سی ٹی کو یہ یقین تھا کہ اگر وہ خود ایمان داری سے گاہکوں سے پیش آیا تو وہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ اس سے وہی برتاؤ کریں گے۔ مقامی بدمعاشوں، عیاروں اور دھونس اور دھاندلی کرنے والوں کے ہاتھوں پہنچنے والے نقصان کو (جن میں پنجاب کی عدالتوں میں دائر کیے گئے توہین مذہب کے مقدمے بھی شامل تھے) صبر سے برداشت کرنے کے بعد او سی ٹی نے سیکھ لیا کہ کس طرح صحیح گاہکوں کا انتخاب کیا جائے اور پھر ان سے اپنی رقم وصول کی جائے۔ اب اس نے اچھے ایمان دار، اپنے کام میں ماہر گاہکوں کا حلقہ بنا لیا ہے۔

ستمبر ۱۹۸۷ء سے جون ۱۹۹۶ء تک او سی ٹی نے ۴۳۱۹ قرضے دیے، جن کی کل مالیت ۶ کروڑ ۹۳ لاکھ ۰۷ ہزار روپے ہے۔ ۲۵۱۵ قرضے پوری طرح ادا ہو گئے، ۱۸۰۴ قرضے ابھی جاری ہیں اور ۲ کروڑ ۲۳ لاکھ ۰۲ ہزار روپے واجب الادا ہیں۔ اداشدہ قرضوں میں ۴ کروڑ ۰۷ لاکھ ۵۰ ہزار روپے اصل کی مد میں اور ایک کروڑ ۱۵ لاکھ ۰۴ ہزار روپے مارک اپ کی مد میں وصول ہوئے ہیں۔ ۵۲۴ قرضوں میں ۳۰ لاکھ ۰۴ ہزار روپے اصل (کل قرضوں کا ۴ء۳۸ فیصد) اور ۸۷ ہزار روپے مارک اَپ (کل مارک اپ کا ۵۵ء۷ فیصد) جزوی طور پر معاف کیا گیا۔ قرض لینے والے ۶۳ قسم کے پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ قرض کی سہولت سے وہ مشین، اوزار اور خام مال خریدتے ہیں اور اس طرح اپنے بیوپار کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں، اور اس کام سے زیادہ لوگ مزدوری حاصل کرتے ہیں۔ یہ کامیاب بیوپاری پڑوسیوں کے لیے نمونے کے کاروباری ثابت ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے اورنگی میں جگہ جگہ نئے کاروبار خودرو درختوں کی طرح اگ رہے ہیں۔ ایمان دار، باصلاحیت گاہکوں کا ایک بڑا حلقہ وجود میں آرہا ہے اور دھونس اور دھمکی دینے والے عیار اب ہماری پیٹھ سے اتر رہے ہیں۔

دوسرے علاقوں سے اورنگی آنے والے ہمارے گھریلو بیوپار کی ترقی اور پھیلاؤ سے متاثر ہوتے ہیں جس طرح پہلے سینی ٹیشن سے متاثر ہوئے تھے۔ ان کو پوری طرح احساس ہے کہ ایسے کام جن سے روزگار میں اضافہ ہو کس قدر اہم ہیں۔ یہ بیوپار کسی بھی برادری کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ ان کو یہ بھی احساس ہے کہ کام کی ترقی کے لیے آسان شرائط پر قرض کی کیا اہمیت ہے،

اور یہ کہ سرمایہ کس طرح بیوپار کی حیرت انگیز ترقی کا باعث بن جاتا ہے۔ پچھلے تین سال سے باہر کے فعال کارکن اورنگی میں تربیت پا کر اسی قسم کے پروگرام چلا رہے ہیں۔ حسبِ ذیل گروپ او سی ٹی سے منسلک ہوئے ہیں:

(الف) کراچی شہر: ۱۲ گروپ۔ ۱۹۵ قرضوں کی کل مالیت ۳۶ لاکھ ۹۰ ہزار روپے۔ اداشدہ رقم ۲۱ لاکھ روپے اصل اور ۶ لاکھ ۵۰ ہزار روپے مارک اَپ۔

(ب) کراچی کے گوٹھ: ۷ گروپ۔ ۳۳۹ قرضوں کی کل مالیت ۱ کروڑ ۷ لاکھ ۴۰ ہزار روپے۔ اداشدہ رقم ۶۲ لاکھ ۹۰ ہزار روپے اصل اور ۱۸ لاکھ ۷۰ ہزار روپے مارک اَپ۔

(ج) سندھ کے اضلاع: حیدر آباد، ۵ گروپ۔ ٹھٹھ ۳ گروپ۔ لاڑکانہ ۵ گروپ۔ دادو ایک گروپ۔ کل ۱۴ گروپ۔ ۳۰۶ قرضوں کی کل مالیت ۶۴ لاکھ ۶۰ ہزار روپے۔ ادائیگی ۲۴ لاکھ ۷۰ ہزار روپے اصل اور ۵ لاکھ ۷۰ ہزار روپے مارک اَپ۔

(د) پنجاب کے اضلاع: لاہور ۴ گروپ۔ گوجرانوالہ ایک گروپ۔ فیصل آباد ایک گروپ۔ سیالکوٹ ۲ گروپ۔ کل ۸ گروپ۔ ۵۴۷ قرضوں کی کل مالیت ۶۹ لاکھ ۱۰ ہزار روپے۔ ادائیگی ۲۹،۸۰،۰۰۰ ۲ لاکھ ۸۰ ہزار روپے اصل اور ۷ لاکھ ۱۰ ہزار روپے مارک اَپ۔

اورنگی سے باہر کے کل ۴۱ گروپ۔ ۱۳۸۷ قرضوں کی کل مالیت ۲ کروڑ ۶۰ لاکھ ۱۰ ہزار روپے۔ ادائیگی ۱ کروڑ ۳۸ لاکھ ۵۰ ہزار روپے اصل اور ۳۸ لاکھ ۳۰ ہزار روپے مارک اَپ۔

ہر ماہ دوسری کمیونٹی تنظیمیں او سی ٹی سے منسلک ہونے کی درخواستیں لے کر آرہے ہیں۔

میرے کچھ دوست اس کام کے سلسلے میں مجھے اور او پی پی کو ضرورت سے زیادہ نیک نامی دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہم لوگ جادوگر ہیں اور ہم نے اورنگی میں ترقی کی لہر اسی طرح دوڑائی ہے جیسے جادوگر ٹوپی میں سے خرگوش نکالتے ہیں۔ یہ ایک نہایت غلط اور احمقانہ رائے ہے۔ میں اس بارے میں درست صورتِ حال بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے جب ۱۹۸۰ء میں اپنی تحقیق کا کام شروع کیا تو اورنگی اس وقت بھی کراچی کی سب سے بڑی کچی آبادی تھی جس میں تقریباً دس لاکھ انسان آباد تھے، اور انھوں نے خود ہی اپنے مسائل کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ خود اپنے روپے سے اپنے مکان تعمیر کر رہے تھے۔ انھوں نے اسکول، دواخانے اور چھوٹے بیوپار قائم

کرنے شروع کر دیے تھے۔ میں نے ان کو یہ کام نہیں سکھایا۔

پھر او پی پی نے کیا کردار ادا کیا ہے؟ ہماری تحقیق سے پتا چلا کہ اگر اورنگی کے باشندوں کو موزوں معاون اداروں کے ذریعے مناسب اور معقول معاشرتی رہنمائی ملے تو ان کے ہاتھوں ہونے والے ترقیاتی کام کی رفتار بڑھائی اور بہتر کی جا سکتی ہے۔ او پی پی نے چار ایسے ہی فعال ادارے قائم کیے ہیں۔ (۱) تحقیق اور تربیت کا ادارہ (RTI) (۲) صحت اور معاشرتی ترقی کا ادارہ (KHASDA) (۳) اورنگی چیریٹیبل ٹرسٹ (OCT) اور (۴) دیہی ترقی کا ادارہ (RDT)۔

آر ٹی آئی کا کام جدید سینی ٹیشن، مکانوں کی بہتر تعمیر اور محلوں کی بہتری کے سلسلے میں معاشرتی اور تکنیکی مشورے فراہم کرنا اور راج مزدوری کی تربیت دینا ہے۔ صحت اور معاشرتی ترقی کا ادارہ حفظانِ صحت، بیماری سے بچاؤ کے ٹیکوں، خاندانی منصوبہ بندی، شفاخانوں کی بہتری اور دائی اور ٹیکے لگانے والوں کی تربیت کے سلسلے میں معاشرتی اور تکنیکی مدد فراہم کرتا ہے۔ او سی ٹی چھوٹے بیوپاریوں، اسکولوں، شفاخانوں وغیرہ کو آسان شرائط پر قرض فراہم کرتا ہے۔ دیہی ترقی کا ادارہ بنجر علاقے میں کاشتکاری، جنگل بانی، چارا اگانے اور مویشی پالنے کے طریقوں کو بہتر کرنے کے لیے مشورے دیتا اور قرضے فراہم کرتا ہے۔ ان اداروں کی موجودگی اور معاشی مشوروں اور قرض کی آسانی کی وجہ سے کام میں تیزی آئی ہے اور کارکردگی بہتر ہوئی ہے۔ لوگوں کا کام جو وہ خود کر رہے تھے اب پہلے سے بہتر ہو گیا ہے اور یہ بہتری مکانوں کی تعمیر، سینی ٹیشن، اسکولوں، دواخانوں اور چھوٹے کاروباری یونٹوں میں نظر آتی ہے۔ جو فعال کارکن باہر سے اورنگی میں آتے ہیں، وہ اس اچھے کام کو دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں۔

ان کی تربیت کے اختتام پر میں ان سے تین سوال کرتا ہوں: (۱) کیا تمھارے علاقے میں بھی وہی مسائل ہیں جو اورنگی میں ہیں؟ (۲) کیا تمھارے ساتھی ان مسائل کو اسی طرح حل کر رہے ہیں جیسے اورنگی کے باسی؟ (۳) اگر تم ان کی معاشی اور معاشرتی مشوروں اور قرض سے مدد کرو، جیسے ہم اورنگی میں کر رہے ہیں، تو کیا ان لوگوں کے کام کی رفتار اور اس کا معیار میں بہتری آئے گی؟ ان کا جواب ہمیشہ ہاں ہوتا ہے۔ ان میں سے اکثر درخواست کرتے ہیں کہ ہم ان کو مزید تربیت دیں اور ان کی مدد کریں تاکہ وہ اپنے علاقے میں معاون ادارے قائم کر سکیں۔ ہم اپنے امدادی

اداروں کے اس اعتماد کے شکر گزار ہیں جس کی وجہ سے ہم ان نیک کارکنوں کی مدد کرنے میں کامیاب ہیں۔

بیرونی ممالک کے ماہر مجھ سے پوچھتے ہیں: حکومتِ پاکستان اس طریقے کو کیوں نہیں اپناتی؟ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ حکومت کے منصوبے بنانے والے اس یوٹوپیا کے عادی ہیں جو اب سے پچاس سال پہلے نیم مثالی اشتراکی ریاست کا تھا، جس کو فلاحی ریاست بھی کہتے ہیں اور جس کو لارڈ بیورج اور نہرو نے مقبول کیا۔ ان کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں کہ نہ تو ان کے پاس وہ وسائل ہیں اور نہ وہ ہنر جو ایک فلاحی ریاست کے لیے ضروری ہیں۔ ان کو یہ بھی اندازہ نہیں کہ فلاحی ریاست بیرونی امداد سے قائم نہیں ہوتی۔ ایک ایسا معاشرہ جس کا دیوالہ نکل گیا ہو، وہ آسانیاں فراہم نہیں کر سکتا جو فلاحی ریاست کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ لیکن غریبوں کو اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ وعدوں اور کارگردگی میں کتنا فرق ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے مسائل خود حل کرنا سیکھ رہے ہیں۔

وقت آ گیا ہے کہ حکومت خدائی انداز میں لوگوں کی ضروریات ــــــ مثلاً غریبوں کے مکانوں کی تعمیر، ان کے اسکول، شفاخانے اور روزگار کی سہولتوں ــــــ کا کفیل ہونے کا خیال ترک کر دے۔ یہ کہیں زیادہ درست ہوگا اگر لوگوں کو اس بات کے لیے منظم کیا جائے کہ وہ خود اپنی زیرِ نگرانی اپنے خرچ پر یہ کام کریں اور ان کو اس کام میں معاشرتی، معاشی اور تکنیکی مشورے فراہم کیے جائیں، اور آسان شرائط پر قرض مہیا کیا جائے۔

انگلستان کے رسالے "نیو سائنٹسٹ" کی جون ۱۹۹۶ء کی اشاعت میں اورنگی کی بابت چار صفحے کا مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے: "شہری دیو کو کیسے قابو میں لایا جائے۔" میں اس کے آخری چار پیراگراف نقل کرتا ہوں:

> بڑے شہروں کی تکالیف کے بارے میں خاصی مبالغہ آرائی کی جاتی ہے، لیکن کراچی کے غریب شہریوں کی تکالیف واقعی اصلی ہیں۔ اور پاکستان کے علاوہ بھی بہت سے ممالک میں قومی حکومتیں اور بلدیاتی ادارے ان کی ضروریات فراہم کرنے کی جنگ میں پسپا ہو رہے ہیں۔

لندن کے عالمی ماحولیاتی ترقی کے ادارے کے ڈیوڈ سیٹر تھویٹ نے اس ماہ شہری مسائل کے بارے میں ہونے والی استنبول کی کانفرنس کے سب سے اچھے مضمون میں کہا: تیسری دنیا کے شہروں میں "حکومت کی ناکامی" ایک طےشدہ حقیقت ہے، اور "حکومتی اداروں سے باہر شہریوں کی اپنی منظم کوشش" اس زوال کو روکنے کا واحد طریقہ ہے۔

سیاست دان شور مچاتے ہیں کہ یہ اپنی مدد آپ کی بنیاد پر خود اپنے خرچ پر اپنے مسائل کا حل سرمایہ دارانہ نظام کا نروان ہے یا اشتراکی مثالی تصور؟ اورنگی میں یہ سیاسی نظریات بے معنی ہو گئے ہیں۔ لیکن اب چوں کہ یہ تصور کہ حکومت سب کام کر سکتی ہے، کینٹکی، کیٹرنگ اور کراچی، ہر جگہ ختم ہوتا جا رہا ہے، لہذا غریب ملکوں کے شہروں میں بھی کچی آبادی کے باشندوں کو اسی طرح زندہ رہنا سیکھنا چاہیے جیسے اورنگی کے کچی آبادی والے زندہ ہیں۔

کراچی کے پٹھان

کالج کی تعلیم کے زمانے ہی سے مجھے عمرانیات کا تجزیاتی انداز مسحور کرتا تھا۔ میرا علم حقیقت میں کبھی بھی عالمانہ نہیں ہوا؛ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر عالمانہ تقاریر نہیں کر سکا۔ لیکن میری محدود واقفیت میرے لیے ایک عملی رہبر ثابت ہوئی۔ اس کی مدد سے میں اہم عمرانی مسائل کو سمجھ سکتا ہوں۔

کراچی کی بڑی کچی آبادی اورنگی میں بہاری، مہاجر اور پٹھان الگ الگ محلوں میں رہتے ہیں۔ میں نے غور سے دیکھا کہ وہ کس طرح ایک بڑے شہر کے دباؤ اور عالمی شہری تمدن سے سمجھوتا کرتے ہیں۔ یہ سب کراچی میں باہر سے آئے ہیں۔ ان تینوں گروہوں کا تہذیبی پس منظر مختلف ہے۔ بہاریوں کا اجتماعی طرزِ احساس بنگالی ہے، کیوں کہ وہ مشرقی پاکستان میں پلے بڑھے ہیں۔ مجھے بنگالی نظام سے آگاہی ہے، کیوں کہ میں تیس سال وہاں رہا ہوں۔ میں اکثر اس بات کا مطالعہ کر کے مسرور ہوتا ہوں کہ بنگالی نظامِ زندگی، جسے بہاریوں نے اپنا لیا تھا، کراچی کے حالات میں کیسے گزارا کرتا ہے، اور اس میں یہاں کے انداز اور آب و ہوا سے کیا تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ چوں کہ میں خود آگرہ اور دہلی سے ہجرت کر کے آیا ہوں، اس لیے مجھے مہاجروں کے اجتماعی طرزِ احساس کا بھی پوری طرح اندازہ ہے: آگرے اور دہلی میں گم ہو جانے والے تمدن کی بھولی ہوئی یادوں اور پسپا ہونے والی حکمراں اقلیت کے حفاظتی احساسِ برتری کا نشہ آور آمیزہ۔ اردو بولنے والے مہاجروں کی کراچی کے جنگل میں بقا کی جنگ قابلِ رحم اور المناک ہے۔

پٹھان (ایک عمومی اصطلاح جو پختون کی ہم معنی نہیں ہے) ایک وسیع علاقے سے ہجرت کر کے کراچی میں آتے ہیں؛ یہ علاقہ بوچستان سے ہزارہ تک اور وہاں سے قبائلی علاقے، پشاور اور سوات تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ اپنے ساتھ پہاڑی علاقے میں رہنے والوں کا طرزِ احساس لاتے ہیں جس

کو ابنِ خلدون نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق اس طرزِ احساس کی تین خصوصیات ہیں: قبائلی عصبیت، جسمانی قوت اور ارادی استقامت۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں پہاڑی قوموں نے کامیاب نوآبادیاں قائم کی ہیں۔ کراچی میں ڈارون کے نظریے کے مطابق بقاے اصلح کی جدوجہد میں وہ سب سے کامیاب ہیں۔

میرے والد آگرے کے قریب فیروز آباد کی ایک پٹھان بستی کے رہنے والے تھے۔ انھیں اپنے اصلی خون پر فخر تھا۔ حقیقت میں وہ ہمارے خاندان کے پہلے اصلی پٹھان تھے جس نے ایک غیر پٹھان لڑکی سے شادی کی، جس کے لیے میں خدا کا شکر گزار ہوں کیوں کہ میری والدہ میں کسی قسم کا قبائلی تعصب نہیں تھا۔ انھوں نے مجھے قبیلہ پرستی کے بجاے انسان دوستی کی تعلیم دی۔ میرے والد نے مجھے اپنا پدری شجرہ یاد کرانے کی ناکام کوشش کی، یعنی اپنے بزرگوں کے نام جن کا تعلق متوزئی قبیلے سے تھا اور جو اٹھارویں صدی میں افغانستان سے ہندوستان آئے تھے۔ اپنے والد کے برخلاف میں کبھی اپنے پردادا مہتاب خاں کو پسند نہیں کر سکا جو امیر خاں پنڈاری سردار کے ساتھی تھے۔ جب نئے انگریز حکمرانوں نے پنڈاری گروہوں کا خاتمہ کیا تو اپنے رواج کے مطابق امیر خاں کو رام کرنے کے لیے ریاست ٹونک میں ایک بڑی جاگیر دے دی۔ مہتاب خاں کو خوش کرنے کے لیے فیروز آباد میں ایک چھوٹی سی جاگیر دی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے جان دار بزرگوں نے انگریزی راج کے امن و امان کو اسی طرح ہنسی خوشی قبول کر لیا جس طرح وہ مرہٹہ راج کے فتنہ و فساد سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ بڑی خوشی سے انگریزی فوج میں سپاہی، پولیس میں افسر اور سرکار کے دوسرے محکموں میں ملازم کے طور پر بھرتی ہونے لگے۔ ان کی متاثر کن شکل و صورت، تندرستی اور نظم و ضبط کی شہرت نے ان کو اچھی نوکریاں دلائیں۔ ان میں پُرامن کام کرنے کی بھی صلاحیت تھی، چناں چہ وہ بڑے باغ اگاتے، کھیتوں میں اچھی فصل پیدا کرتے اور کانچ کی چوڑیاں بناتے تھے۔ میرے دادا میر محمد خاں محکمۂ تعلیم میں اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ انھوں نے پڑھنے لکھنے میں دلچسپی لی، نوکری سے جلد پنشن لے لی اور اپنے قصبے کی دومنزلہ حویلی میں مطالعے اور مراقبے میں مشغول ہو کر صوفیانہ طرز پر بقیہ زندگی بسر کی۔ جب میں نے آئی سی ایس سے استعفیٰ دیا تو میرے والد نے افسوس کرتے ہوئے کہا کہ شاید میں نے یہ

عجیب و غریب خیالات اپنے دادا سے ورثے میں پائے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ''نواب'' مہتاب خاں کی طرح پنڈاری بننے کے بجاے میر محمد خاں کی طرح گوشہ نشین صوفی بننے کو اپنی خوش بختی سمجھوں گا۔

فیروز آباد کی طرح کی دوسری پٹھان بستیاں بھی تھیں جہاں پٹھان ملازمت اور زمینداری میں پُرامن زندگی گزارتے تھے، جس کا میرے والد خوش ہو کر ذکر کرتے تھے۔ وہ خوش حال اور باعزت تھے۔ ان کے آموں اور امرودوں کے باغ باغبانی کا شاہکار تھے۔ خورجہ کے پٹھان چینی کے ظروف کے لیے اور فیروز آباد کے پٹھان چوڑیوں کی وجہ سے مشہور تھے۔ آگرہ، بریلی، رام پور، شاہجہاں پور اور قائم گنج (ڈاکٹر ذاکر حسین خان کا وطن)، میرٹھ اور ملیح آباد (جوش کا وطن) کے پٹھانوں نے سید احمد خاں کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاحات بڑی خوشی سے قبول کرلیں اور زمینداروں اور ملازمت پیشہ خاندانوں کے چشم و چراغ بہت سے پٹھان نوجوان آگرے اور میرٹھ کالج میں میرے دوست تھے۔ ہم سب کو اپنے ہرے بھرے باغ، سنہرے کھیت، جنگل جن میں نیل گائیں اور کالے ہرن آسانی سے ملتے تھے اور تیتر بٹیر افراط سے تھے، پُرلطف برسات، اردو غزل اور ہندوستانی لڑکیاں بےحد پسند تھیں۔ ہم سے کوئی بھی اُس ویران پہاڑی علاقے کو یاد نہیں کرتا تھا جہاں سے ہمارے بزرگ آئے تھے۔ ہم میں سے کوئی وہ شکاری باز نہیں بننا چاہتا تھا جو ویران پہاڑوں کی چٹانوں میں گھونسلا بناتا ہے، اس کے باوجود کہ سب علامہ اقبال کا یہ مصرع جھوم جھوم کر پڑھتے تھے:

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

جب میں نے اپریل ۱۹۸۰ء میں اورنگی میں کام شروع کیا تو یہ بستی صرف دس بارہ سال پُرانی تھی۔ بہت سے نئے لوگ ہجرت کرکے آرہے تھے۔ نئے نئے سیکٹروں میں ترقیاتی کام ہو رہا تھا۔ نئی گلیوں میں نئے مکان تعمیر ہو رہے تھے اور پرانے مکانوں کو بہتر کیا جا رہا تھا۔ اس تمام کوشش میں مجھے پٹھانوں کا ایک اہم کردار نظر آیا۔ وہی سب سے بڑے زمین کھودنے والے اور تعمیری معمار تھے۔ فجر کے وقت چوراہوں پر اور بازاروں میں ان تنومند پہاڑیوں کی قطاریں نظر

آتی تھیں، اپنے سرخ و سفید چہروں، گندے پھٹے پرانے لباس اور چند اوزاروں کے ساتھ۔ بہت جلد ان کو مزدوری مل جاتی تھی۔ میں نے ان کو مٹی کھودتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کی تین آدمیوں اور ایک گدھے کی ٹیم حیران کن تیزی سے مٹی اور پتھر کھود کر اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی تھی۔ دنیا بھر میں سب سے کم معاوضے پر تیز کام کرنے والے انھی مزدوروں کی وجہ سے غریبوں کے لیے مکان بنانا ممکن ہوا، گلیوں میں نکاس کی لائنیں ڈالی گئیں اور فلش لیٹرین بنے۔ مہاجروں یا بہاریوں نے مزدوری کے لیے کبھی اس طرح قطاریں نہیں بنائیں اور نہ ہی زمین کھودی۔

مجھے پہاڑی لوگوں کی برداشت کی قوت کا مظہر ایک اور گروہ میں نظر آیا۔ یہ پٹھان پھیری والے ہیں جو اپنے تھیلوں کے ساتھ ہر جگہ ہر قسم کی ضرورت کی اشیا، ترکاری، پھل، جوتے، برتن فروخت کرتے یا پھر کباڑ جمع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے خوبصورت چھوٹے چھوٹے بچے کینوس کے تھیلے کندھوں پر لٹکائے ہر گھورے پر دکھائی دیتے ہیں جہاں سے وہ کباڑیوں کے لیے چیتھڑے، کاغذ، پلاسٹک اور ٹین کے ٹکڑے جمع کرتے ہیں اور پندرہ سے بیس روپے روز کماتے ہیں۔

اور پٹھان عورتیں، اپنے مردوں کی طرح طاقتور، بلاجھجک ہمارے عورتوں کے سلائی مراکز میں روزانہ آتی ہیں جہاں سے وہ بغیر سلے ہوئے کپڑے گٹھری بنا کر یا تو اپنی بغل میں دبا کر یا سر پر رکھ کر سلائی کے لیے اپنے گھر لے جاتی ہیں۔ ان کے برخلاف مہاجر خواتین پیسے لے کر سلائی کرنے میں شرم محسوس کرتی تھیں اور ہم کو نہایت رازداری سے سلائی کا سامان ان کے گھر بھیجنا پڑتا تھا۔ وہ اپنے نازک سروں پر بنڈل لاد کر بازار سے نہیں گزر سکتی تھیں۔ پٹھان اور بہاری عورتیں اس شرم سے بری تھیں، اس لیے وہ آگے نکل گئیں۔

ہمارے سینی ٹیشن کے پروگرام نے ہم کو قبائلی اتحاد سے روشناس کرایا۔ گندے پانی کا نکاس ۱۹۸۰ء میں اورنگی میں ایک بے حد تکلیف دہ مسئلہ تھا۔ ان بہاریوں، مہاجروں اور پٹھانوں نے مکان تو تعمیر کر لیے تھے، لیکن فضلے اور گندے پانی کی نکاسی کا کوئی مناسب انتظام نہیں کیا تھا۔ یہ گندگی گلیوں میں بہہ رہی تھی اور اس کی وجہ سے مکانوں کو اور وہاں رہنے والوں کی صحت کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ لوگوں کو توقع تھی کہ سرکاری ادارے ان کو جدید سینی ٹیشن کا نظام مفت

فراہم کریں گے، جب کہ او پی پی کا مشورہ تھا کہ وہ خود اپنی نگرانی میں اپنے خرچ پر کم لاگت سینی ٹیشن لائن ڈالیں، اور فلش لیٹرین بنائیں۔

یہ ایک مشکل پیغام تھا۔ اس کو لوگوں نے بہت آہستہ آہستہ قبول کیا۔ جب کچھ مکینوں کو یہ احساس ہوا کہ اگر انھوں نے اپنے خرچ پر سینی ٹیشن کا نظام تعمیر نہیں کیا تو ان کی صحت اور مکان تباہ ہو جائیں گے، تو رفتہ رفتہ بہاری، مہاجر اور پٹھان علاقوں میں سینی ٹیشن لائنیں ڈالی جانے لگیں۔ پھر ہم کو ان تینوں گروہوں کا فرق نظر آیا۔ عام جھگڑے اور کام کے رکنے یا رقم کی عدم ادائیگی کے واقعات پٹھان علاقوں میں بالکل نہیں ہوئے۔ وہاں شخصی باغیانہ اختلاف کی جگہ قبائلی اتحاد تھا۔ اسی وجہ سے منظم منصوبہ بندی بڑے پیمانے پر ہوئی اور سینی ٹیشن کا کام بہت جلد مکمل ہو گیا۔

ہم کو قبائلی اتحاد کی نمایاں مثالیں فقیر کالونی اور آفریدی کالونی میں ملیں۔ شروع میں انھوں نے بڑے غور سے بہاری کالونیوں میں گلیوں کی صفائی ستھرائی کو دیکھا جو نکاس کی لائنوں اور فلش لیٹرین پر مشتمل سینی ٹیشن کے نظام کا نتیجہ تھی۔ پھر جب ہمارے سماجی تنظیم کار فقیر کالونی اور آفریدی کالونی میں کام کا نقشہ اور تخمینہ تیار کرنے گئے تو بہاریوں کے برخلاف الگ الگ گلیوں میں ان محلوں کے مکینوں نے آمادگی کا اظہار نہیں کیا، لیکن جب جرگوں نے پورے علاقے کا نقشہ اور تخمینہ مانگا تو تھوڑے ہی عرصے میں دونوں کالونیوں میں، جن میں سے ایک بلوچوں کی اور دوسری پٹھانوں کی تھی، سینی ٹیشن کا نظام مکمل ہو گیا۔

حال ہی میں جب سے اپنی نگرانی میں اپنے خرچ پر سینی ٹیشن کا نظام قائم کرنے کا سلسلہ اورنگی سے باہر دوسری کچی آبادیوں میں پہنچا تو او پی پی کو پتا چلا کہ جن علاقوں میں کام بہترین اور منظم طور پر انجام پایا وہ پٹھان علاقے ـــــ اسلامیہ کالونی اور ویلفیئر کالونی ـــــ ہیں۔

قبائلی اتحاد و اتفاق اداروں یا معاہدوں کے ذریعے وجود میں نہیں آتا، بلکہ غیر رسمی انداز میں روایات اور رسم و رواج کے ذریعے کام کرتا ہے۔ یہ ایک دکھائی نہ دینے والی مگر مضبوط قوت ہے۔ جہاں روایت زندہ ہے وہاں سردار اور قبیلے کے افراد، استاد اور شاگردوں، بزرگوں اور خردوں کا کردار جبلّی انداز میں نشوونما پاتا ہے۔ روایت اور رسم و رواج ایک طرف سرداروں اور بزرگوں کو

مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے قبیلے کے نگراں اور محافظ ہوں، اور دوسری طرف شاگردوں اور چھوٹوں کو وفادار معاون بننے پر آمادہ کرتے ہیں۔ یہ قبائلی رشتہ کتنا موثر ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ کراچی میں پچھلے تیس سال میں اتنی ساری پٹھان بستیاں آباد ہو گئیں، اور ان لوگوں نے ٹرک اور ویگن کے کاروبار پر تقریباً قبضہ جما لیا۔

ہجرت کر کے آنے والے قبائلی غیر شادی شدہ جوان ڈیروں میں رہتے ہیں جو ان کے بڑوں نے ان کے لیے قائم کر رکھے ہیں۔ ان میں رہنا دشوار اور تکلیفوں سے پُر لیکن نہایت ارزاں ہوتا ہے۔ بنیادی ضروریات، مثلاً رہائش اور کھانے کی فراہمی کے بعد نئے آنے والے اپنی محنت سے اپنا مقام بناتے ہیں۔ ان کی جسمانی قوّت، محنت سے کام کرنے کی عادت، اور کسی بھی قسم کے کام کو خوشی سے کرنے کی خصوصیت ان کو بہت جلد کراچی کی معاشی زندگی کا حصّہ بنا دیتی ہے۔ چند ہی سال میں وہ لوگ جو جھگی میں رہتے تھے پکے گھر تعمیر کر لیتے ہیں۔ پٹھان کالونیوں پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہاں تھوڑے ہی عرصے میں کتنی ترقی ہوئی۔

قبائلی عصبیت اور جسمانی طاقت نے پٹھانوں کو ٹرکوں اور ویگنوں کا مالک اور کنڈکٹر بنا دیا ہے۔ ایک پٹھان ویگن والا قدرتی طور پر پٹھان لڑکے کو اپنی ویگن کا کنڈکٹر اور ایک پٹھان جوان کو ڈرائیور رکھتا ہے۔ وہ اپنی روایات اور رسوم کی وجہ سے زیادہ محنتی ہوتے ہیں۔ ان میں ابھی تک کراچی والی چوری اور کام چوری کی عادت نہیں آئی۔ مالک ان کا بزرگ ہوتا ہے، وہ شاگرد بچوں کی تربیت کا انتظام کرتا ہے۔ اس کے شاگرد اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاتے، وہ اس کی پیٹھ میں چھرا نہیں گھونپتے۔ اور پھر بزرگ اپنے فعال ترین ڈرائیور کو گاڑی کا مالک بننے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ وہ اس کو قرضے کی شرط پر گاڑی دیتا ہے۔ قرض کی شرح سود بہت زیادہ ہوتی ہے اور دوسری شرائط بھی دشوار ہوتی ہیں، لیکن عدم ادائیگی بہت کم ہے کیوں کہ قبائلی روایت میں مالک کا روپیہ لے کر بھاگنا ایسا ہی پُرخطر ہے جیسے مالک کی بیوی کو اغوا کرنا۔ جسمانی قوّت، مستقل مزاجی اور تکنیکی مہارت ڈرائیور کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ مالک کا قرضہ سود کے ساتھ ادا کر دے اور گاڑی کا مالک بن جائے۔ پھر وہ اپنے طور پر ایک بزرگ مالک بن جاتا ہے اور شاگردوں کی تربیت اور مدد کرنے لگتا ہے۔ اس طرح یہ طریقہ پھیلتا جاتا ہے اور اس کا اثر نہ صرف ٹرکوں اور ویگنوں کے

سلسلے میں بلکہ دوسرے کاموں، مثلاً گاڑیوں کی مرمّت کرنے والی ورکشاپ اور دوسرے چھوٹے بیوپار میں، بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اوپی پی جاتے ہوئے قصبہ کالونی کے راستے میں جب میں بنارس چوک سے گزرتا ہوں، جسے اب عدم تشدّد کے پیامبر خان عبدالغفار خاں کے نام پر باچا خان چوک کہا جاتا ہے، تو مجھے وہاں پٹھانوں کی تہذیب کی، اتحاد، اتفاق، قوتِ حیات اور مستقل مزاجی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ باہمی امداد اور مسلسل انتھک محنت سے یہ علاقہ مالدار ہو گیا ہے۔ یہاں بہت سی دکانیں اور چھوٹے ورکشاپ ہیں جہاں ہر شخص کام میں لگا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بنارس چوک کے پٹھانوں نے ہر شخص کو باروزگار بنانے کا معجزہ کر دکھایا ہے۔ اور جب مہاجروں کی دکانیں ہڑتال کی وجہ سے بند ہوتی ہیں تو بنارس چوک کی دکانوں کو اور زیادہ گاہک مل جاتے ہیں کیوں کہ یہ ہڑتال میں حصّہ نہیں لیتے۔

آپس کی امداد اور محنت کی وجہ سے پٹھان برادریاں ترقی کر رہی ہیں اور پھیل رہی ہیں۔ اللہ کی مہربانی سے وہ اب زیادہ پُرامن ہوتے جا رہے ہیں۔ اپنے پہاڑی علاقوں میں ان سے کتنی ہی خوں ریزی اور جنگ و جدل ہو، یہاں کراچی میں وہ آپس میں بھی پُرامن رہتے ہیں اور اپنے پڑوسیوں سے بھی نہیں لڑتے۔ ان کے بزرگ نہ تو اپنی بڑائی کا اظہار کرتے ہیں اور نہ ان کو مالیخولیا کی بیماری ہے۔ وہ اپنی نسل کشی کی شکایت نہیں کرتے، اور نہ نوکریاں مانگتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی خاص رعایت، اور نہ ہی ان کے نوجوان لوگوں کو قتل کرنے کے لیے گروہ بندی کرتے ہیں۔

میرے سسر علامہ مشرقی نے ڈارون کے نظریۂ بقاے اصلح کی بنیاد پر قرآن مجید کی تشریح کی تھی۔ وہ ان آیات کا بار بار ذکر کرتے تھے:

> اور ہم نے کتب سماوی میں، فہمائش کے بعد، تحریر کیا ہے کہ زمین کی وراثت اللہ کے اچھے نیک بندوں کو ملتی ہے۔ بے شک اس میں صلح بندوں کے لیے ایک اچھا نمونہ ہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ علامہ کراچی کے پٹھانوں کو خدا کے نیک اور صلح بندے سمجھتے یا نہیں، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ لوگ کراچی کی زمین کا ایک بڑا حصّہ وراثت میں پا رہے ہیں۔

بے ایمانی اور آدرش پسندوں کا کردار

اگر آپ بھی میری طرح قدیم اور جدید واعظوں کے وعظ پڑھتے ہیں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ انسان عام طور پر بری طرح عمل کرتے ہیں، انسانی آبادی میں گناہ بہت زیادہ ہیں اور ولی بہت کم۔ دیکھیے حافظ شیرازی (۱۳۲۶-۱۳۹۰ء) نے اب سے چھ سو سال پہلے اپنے ہم عصروں کا کیسا نقشہ کھینچا ہے:

این چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شَر می بینم
ہر کسے روزِبہی می طلبد از ایّام
مشکل آن است کہ ہر روز بتر می بینم
ابلہاں را ہمہ شربت ز گلاب و قند است
قوتِ داناں ہمہ از خونِ جگر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالان
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر می بینم
دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر
پسراں را ہمہ بدخواہِ پدر می بینم
ہیچ رحمے نہ برادر بہ برادر دارد
ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسر می بینم

یہ کیسا انقلاب ہے جو میں چاند کی گردش میں دیکھ رہا ہوں۔ تمام عالم فتنہ و فساد سے بھر گیا ہے۔ ہر شخص اچھے ایام کا متلاشی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر روز پہلے سے خراب ہے۔ جاہل شربتِ گلاب پی رہے ہیں اور عاقل اپنا خونِ جگر۔ عربی گھوڑے پر لکڑی کا پالان ہے اور گدھے سونے کا ہار

پھنے ہیں۔ بیٹیاں ماں سے لڑ رہی ہیں اور بیٹے باپ کو زخمی کر رہے ہیں۔
بھائی کو بھائی پر رحم نہیں آتا اور باپ کو بیٹے سے محبت نہیں رہی۔

لیکن اس بے ایمانی اور لوٹ مار نے جو خواجہ حافظ اپنے چاروں طرف دیکھ رہے تھے، ان کو قنوطی مزاج اور آدم بیزار نہیں بنایا۔ وہ یہ نہیں کہتے، جیسے ہمارے ہم عصر کہہ رہے ہیں، کہ بے ایمانی سے بچنا ناممکن ہے؛ ہر شخص بے ایمان ہے تو میں کیسے ایمان دار رہ سکتا ہوں، اس لیے میں کیوں ایمان دار رہوں۔ نہیں، بلکہ اس نظم کے آخری شعر میں خواجہ حافظ نے، جن کو ہمارے بزرگ لسان الغیب کہتے تھے، برائی سے بچنے کی ترکیب بھی بتائی ہے:

پندِ حافظ بشنو خواجہ برو نیکی کن
زاں کہ ایں پند بہ از دُرّ و گہر می بینم

دوست حافظ کا مشورہ سنو نیکی پر عمل کرو، کیوں کہ یہ مشورہ لعل اور موتی سے زیادہ قیمتی ہے۔

ہمارے لسان الغیب وہی مشورہ دے رہے تھے جس کو دنیا کے دانش مندوں نے شر کے دائرے کو اچھائی کے ذریعے ختم کرنا بتایا ہے۔ یہ ایسا مشورہ نہیں ہے جس پر کوئی پوری برادری یا اس کا بڑا حصہ فوراً عمل کر سکے۔ نہ یہ ایسا مشورہ ہے جسے کوئی مسیحا، یا نجات دہندہ یا آمر حکم کے ذریعے نافذ کر سکے۔ یہ ایک پیغام ہے خواص کے لیے، ایک دعوت ہے آدرش پسندوں کے لیے، ایسے لوگوں کے لیے جو اخلاقی اور معقول اقدار پر یقین رکھتے ہیں۔

آدرش پسند ایک خاص قسم کی مخلوق ہے۔ مادّہ پرست عام لوگ، جو اکثریت میں ہیں، آسائش پسند، دولت کے پجاری، شہوت اور قوت کے رسیا ہوتے ہیں جبکہ آدرش پسند افراد اپنی ضروریات کو کم کر کے خوش ہوتے ہیں، وہ نفس کی خواہشات کو دباتے اور کفایت شعاری، حیا اور انکسار کو اپناتے ہیں۔ ان کو حقیقی خوشی لوگوں کی خدمت میں ملتی ہے نہ کہ لالچ اور اپنی ترقی میں۔ وہ زیادہ کھانے اور شہوت، بسیار خوری اور آوارگی کو حیوانی خصوصیات سمجھتے ہیں جو بیلوں اور ریچھوں کے لیے تو مناسب ہیں، عاقلوں کے لیے نہیں۔ آدرش پسند اپنی توانائی حقیقت اعلیٰ سے، یعنی اس دائمی دنیا سے حاصل کرتے ہیں جہاں ان کو قائم رہنے والی خوشی ذہنی، اخلاقی اور

روحانی مشاغل سے حاصل ہوتی ہے، نفسیاتی خواہشات تسکین، دولت کے حصول اور قوت سے نہیں۔

تھوڑی سی آدرش پسندی عقلی اور اخلاقی نظم و ضبط، شخصی اور قومی صحت کے لیے بھی ضروری ہے۔ حضرت عیسیٰ کو جب شیطان نے دولت کا لالچ دیا تو انھوں نے کہا تھا: "انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا۔" خالص مادّہ پرستی، جس پر آدرش پسندی، عقلیت، اور اخلاقی اقدار کا بالکل اثر نہ ہو، تباہ کن ہوتی ہے۔ وہ بہت تیزرفتار شخصی تباہی کا باعث ہوتی ہے، اور آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر معاشرے کو بھی تباہ کر دیتی ہے۔ بسیارخوری، یعنی مرغن اور چٹ پٹے کھانے اور شراب و کباب، ہی کو لے لیجیے۔ اس کے نتیجے میں آپ بہت جلد بیمار ہو جائیں گے۔ ایک بسیار خور معاشرہ موٹا اور بیمار معاشرہ ہوتا ہے۔ یا پھر آوارگی کو لیجیے۔ ایک شہوت پسند ذہنی اور جسمانی طور پر بہت جلد پراگندہ ہو جاتا ہے، اور ایک شہوت پسند معاشرہ انسانیت کی بنیادی قدر یعنی خاندان کو ختم کر دیتا ہے جس سے بچے اور والدین پریشان رہتے ہیں۔ یہی بات بڑھتے ہوئے لالچ اور خواہش کے نتیجے میں پیش آتی ہے؛ یعنی اس سے ناانصافی، ظلم، استحصال اور غریبی میں اضافہ ہوتا ہے جس سے نفرت، لاقانونیت، ڈکیتی، غنڈہ گردی اور فساد جنم لیتے ہیں۔

آدرش پسندوں، یعنی معقول اخلاقی اصولوں پر ایمان رکھنے والوں کا معاشرے پر اچھا اثر شاہی اعلان، وعظ یا پُرجوش تقریروں کی طرح نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے عمل سے مثال قائم کرتے ہیں۔ ان کا اعتدال پسند، مطمئن اور دوستانہ طرزِزندگی اس بات کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ عقلی اور اخلاقی اقدار اُس طرزِزندگی سے کہیں زیادہ سودمند ہیں جس کی بنیاد لالچ، شہوت اور خواہش پر ہو۔ یہ آدرش پسند گویا طوفانی سمندر میں امن کے جزیرے ہیں یا گھپ اندھیرے میں روشنی کے چراغ۔ قرآن مجید میں اِن لوگوں کو اللہ کے دوست (اولیاء اللہ) کہا گیا ہے؛ یہ خوف اور پریشانی سے محفوظ ہیں، اور دنیاداروں کے اچھے راہ نما۔ انجیل مقدس میں ان کو خدا کے خادم، اور مادّہ پرستوں کو شیطانوں کے نوکر کہا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کو یقین تھا کہ کوئی بھی انسان ایک ہی وقت میں خدا اور شیطان کی خدمت نہیں کر سکتا۔

قوموں کی خوش قسمتی کے دور میں آدرش پسند اور باصلاحیت اقلیت پھولتی پھلتی ہے، ان کی عزت کی جاتی ہے اور ان کو تحفظ اور آسانیاں فراہم ہوتی ہیں۔ پھر بد قسمتی کا دور آتا ہے جب

یہ آدرش پسند زوال پذیر ہو جاتے ہیں، ان سے عام لوگ الگ ہو جاتے ہیں، ان پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں، اور ان کو اخلاقی طور پر خراب کیا جاتا ہے۔ اپنی اسّی سالہ زندگی میں مجھے ان آدرش پسندوں کی خوش حالی اور ان کا زوال دونوں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے؛ لیکن یہ آدرش پسند بالکل ختم نہیں ہوئے، وہ قدیم جانداروں کی طرح دنیا سے کبھی غائب نہیں ہوتے۔ قانون قدرت یہ ہے کہ وہ پھر واپس آئیں گے، ہما کی طرح وہ اپنی راکھ سے جنم لیتے ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دور میں آدرش پسندی کے نئے جنم کو دیکھ رہا ہوں۔

میری جوانی اور بچپن کا دور، بیسویں صدی کا نصف اوّل، ہندوستان کی تاریخ کا اچھا دور تھا۔ یہ آدرش پسندوں کے لیے ایک مبارک زمانہ تھا۔ وہ ہر جگہ ترقی کر رہے تھے اور لکھنے پڑھنے والوں، استادوں، وکیلوں، ڈاکٹروں، سرکاری ملازموں بلکہ سیاست دانوں تک میں نمایاں تھے۔ تعلیمی ادارے خاص طور پر ان آدرش پسندوں کی پناہ گاہیں تھیں۔ ان تخیل پسند اساتذہ نے میرے نوجوان دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ سادہ، مطمئن، اپنی کتابوں اور خوابوں میں مگن، شاگردوں سے محبت کرنے والے، بے حد وطن دوست لیکن اپنے خیالات میں وسیع المشرب، بڑائی کے مالیخولیا اور اجنبیوں سے نفرت کے مرض سے پاک۔ مقامی بلدیاتی ادارے بھی ان آدرش پسندوں کے کام کرنے کے مراکز تھے جہاں وہ اپنے ہم وطنوں کی خدمت کرتے تھے۔ امدادِ باہمی کی انجمنیں بھی اسکولوں اور بلدیاتی مجالس کی طرح خدمت خلق کے شوقین ان آدرش پسندوں کی آماجگاہیں تھیں۔ مجھے اپنے آئی سی ایس کے دور میں دور دراز دیہاتوں تک میں درجنوں محنتی اساتذہ، بلدیات کے ممبروں اور امدادِ باہمی کے کارکنوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ انقلابی آدرش پسندوں کا سب سے بڑا آسرا سیاسی جماعتیں تھیں۔ افسوس آج کل کے پُرکشش نظریہ باز میری جوانی کے ایمان دار تخیل پسندوں سے بہت مختلف ہیں۔ میں نے اپنی جوانی میں غور و فکر کرنے والے، مخیر اور انقلابی، ہر رنگ کے آدرش پسند دیکھے۔ یہ لوگ گاؤوں اور شہروں میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، ڈاکٹر وکیل، سرکاری ملازم، ہر قسم کے پیشوں سے منسلک تھے، اور قسم قسم کے اداروں، کالجوں، بلدیاتی مجالس، امدادِ باہمی کی انجمنوں اور سیاسی جماعتوں سے وابستہ تھے۔ ان لوگوں کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں ذائقہ تھا جیسے سالن میں نمک یا جیسے روٹی میں خمیر۔

آدرش پسندی کی لہر جس کا اثر میں نے جوانی میں محسوس کیا، انیسویں صدی میں شروع ہوئی تھی۔ یہ اس احساس سے شروع ہوئی کہ ہماری شکست اور غلامی ہماری اپنی اخلاقی کمزوریوں کی وجہ سے ہے، اور ہمیں اس اخلاقی برائی کو ذہنی روشن خیالی اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے دور کرنا چاہیے۔ ہمارا قدیم تعلیمی نظام اور ہمارے رسم و رواج ترقی میں رکاوٹ ہیں، ہم کو ان کی اصلاح کرنی چاہیے۔ ہم کو اپنے حاکموں سے سماجی، سیاسی، صنعتی اور فوجی طریقے سیکھنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ روشن خیالی اور اصلاح کی خاطر ہمیں حاکموں کی شاگردی قبول کرنی چاہیے تاکہ ہم بھی طاقتور اور آزاد ہو جائیں۔ ہمارے زوال کی اندھیری رات ایک دن ختم ہو جائے گی۔ اخلاقی اصلاح اور حاکموں کی شاگردی کا یہ تصوّر پہلے جاپان، چین اور مشرقِ قریب کے ملکوں نے سیکھا، پھر ہندوستان میں راجا رام موہن رائے اور سید احمد خاں نے اس کا چرچا کیا۔ ان کے اس خواب نے ملک کے سب سے زیادہ فعال آدرش پسندوں، سوچنے سمجھنے والے، مخیر اور انقلابی تخیل پسندوں کو متاثر کیا۔ یہ نہ صرف انتہائی متاثر کن خواب تھا، بلکہ ایک نہایت قابلِ عمل طریق کار بھی تھا۔ ایک سو سال میں اس خیال نے پس ماندہ ملکوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا، اور اگلے پچاس سال میں وہ آزاد ہو گئے۔

یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد آدرش پسندی کو زوال آیا۔ آزادی سے پہلے فعال تخیل پسندوں کو ذہنی تجدید، اخلاقی اصلاح اور روحانی ترقی کا شوق تھا۔ اس خواہش کو قوت اور دولت کے حصول سے دھچکا لگا۔ اصلاح رسوم کی جگہ عظمت کے خبط نے لے لی۔ پاکستان کے مسلمان اپنے آپ کو اس لیے عظیم خیال کرنے لگے کہ انھوں نے ایک ہی وقت میں انگریز اور ہندو کو شکست دی تھی۔ یہ بڑائی کا خبط پھر مالیخولیا اور غیروں سے نفرت کی شکل اختیار کر گیا۔ ہم کو ہر طرف دشمن ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کی سازشیں نظر آنے لگیں۔ بڑائی کے خبط نے ہمیں خود پسند بنا دیا: ہم عظیم ہیں، ہم مثالی قوم ہیں، ہم کو کسی قسم کی روشن خیالی کی ضرورت نہیں، ہمیں کسی اور سے کچھ نہیں سیکھنا بلکہ ہم اوروں کو سکھا سکتے ہیں۔ اسی طرح مالیخولیا سے ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہماری تمام خرابیاں ہماری وجہ سے نہیں بلکہ دشمنوں کی سازش کی وجہ سے ہیں۔ عظمت کا خبط مالیخولیا سے مل کر ہمارے اندر تبدیلی، تجدیدِ نو، اور اصلاح

کی خواہش کو دبانے کا سبب بنا اور ہماری فعال آدرش پسندی کی چنگاری بجھ گئی۔

یہ بات بھی عام طور پر معلوم ہے کہ متروکہ املاک کی تقسیم، پرمٹوں اور لائسنسوں، رہائشی پلاٹوں، نوکریوں کی سفارشوں اور قرضوں نے سیاسی کارکنوں کو بے ایمانی پر اکسایا، سرکاری ملازموں اور پیشہ ور لوگوں میں آدرش پسندی کو کم کیا، جس کے نتیجے میں لالچ کا جذبہ ابھرا اور شیطان کی پرستش عام ہوئی۔ یہی جذبہ ان اداروں میں بھی پہنچ گیا جہاں روایتاً آدرش پسند پائے جاتے تھے؛ سیاسی جماعتوں، بلدیاتی کاؤنسلوں، امدادِ باہمی کی انجمنوں، اسکولوں یہاں تک کہ ہسپتالوں میں بھی وہ تھوڑے بہت انقلاب پسند جن کو خریدنا ممکن نہیں تھا، بے رحمی سے کچل ڈالے گئے۔

ایک بوڑھے احمق کی سی مستقل مزاجی سے مجھے یقین ہے کہ میں آدرش پسندی کی تجدید کی علامات دیکھ رہا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کھلی مادّہ پرستی، بے شرمی سے لالچ کا اظہار اب صاف نظر آنے لگا ہے اور اصلاح حال کا تقاضا بڑھ گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں او پی پی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے بہت سے پیشہ ور ماہروں سے ملتا ہوں۔ وہ لوگ مجھے اپنی جوانی کے تخیل پسندوں سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں؛ ان میں دوسروں کی خدمت کا وہی یوٹوپیائی جذبہ ہے۔ وہ مسائل کا حل چاہتے ہیں تاکہ ایک بہتر، زیادہ ہم درد، زیادہ منصفانہ، زیادہ خوش حال دنیا تعمیر کریں۔ پرانے آدرش پسندوں کی طرح وہ پُرامید، بہادر اور محبت کرنے والے ہیں۔ قنوطی مزاج لوگ کہہ سکتے ہیں کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ غیر اہم ہے؛ کہ یہ محض بوڑھے دماغ کی خیال آرائی ہے۔ میں ان سے بحث نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے وہ صحیح کہتے ہوں۔ لیکن میں اس بات پر برابر یقین رکھوں گا کہ آئندہ سالوں میں آدرش پسند پیدا ہوں گے جو اپنی عملی مثال سے ثابت کریں گے کہ کس طرح اس نقصان کی تلافی کی جائے جو بلاروک ٹوک لالچ، خواہش اور شہوت نے معاشرے کو پہنچایا ہے، بے ایمانی، اقربا پروری اور رشوت کو کیسے ختم کیا جائے، اور کس طرح مستقل مزاجی سے ایک قائم رہنے والا نظام ترتیب دیا جائے جس میں معاشرتی انصاف اور معاشی خوش حالی ہو۔

حرفِ آخر

پچھلے پندرہ سال سے میں کراچی کی سب سے بڑی کچی آبادی اورنگی میں آزمائشی منصوبوں کی نگرانی کر رہا ہوں۔ ان پر بہت سے رسالے تحریر کیے گئے اور ۶۳ سہ ماہی رپورٹیں شائع ہوئیں۔ اور اب ان کی تفصیلات زیرِ نظر کتاب میں بیان کی گئی ہیں۔

مجھے اپنے گناہوں کی یہ سزا ملی ہے کہ لمبی عمر پاؤں اور ہولناک واقعات ہوتے ہوئے دیکھوں۔ ایک نوجوان آئی سی ایس افسر کی حیثیت سے میں نے بنگال کے خوفناک قحط اور انگریز سرکار کی انتظامیہ کے زوال کا مشاہدہ کیا۔ ۱۹۴۷ء میں جامعہ ملّیہ دہلی میں ایک استاد کی حیثیت سے مجھے مغل تہذیب کے وارث مسلمانوں کو شکست و ریخت سے دوچار ہوتے ہوئے دیکھنا پڑا۔ تقسیم کے نتیجے میں دہلی سے پانچ لاکھ مسلمانوں کو بھاگنا پڑا اور دس لاکھ ہندو اور سکھ شہر میں آ گئے اور شہر چند ہفتوں کے عرصے میں بالکل بدل کر رہ گیا۔ ۱۹۵۰ء میں میں ہجرت کر کے مشرقی پاکستان کے شہر کومیلا گیا اور وہاں بیس برس کے عرصے میں پاکستان کے شیدائیوں اور بانیوں کی اکثریت کو، یعنی بنگالی مسلمانوں کو، دشمنوں میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ پھر میں نے ۱۹۷۱ء کے تمام دہشت ناک واقعات، مشرقی پاکستان کے خاتمے اور "بہاریوں" کے قتلِ عام کا مشاہدہ کیا۔ کبھی کبھی میں شیخ سعدی کا شعر دوہراتا ہوں جنھوں نے سَو برس کی عمر پائی اور بہت سے المناک واقعات دیکھے جن میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی بھی شامل تھی:

بس نادیدنی با دیدہ ام من
مرا اے کاشکے مادر نہ زادے

"میں نے بہت کچھ ایسا دیکھا ہے جو نہیں دیکھنا چاہیے تھا کاش مجھے میری ماں نے نہ جنا ہوتا"

غم انگیز حادثوں نے شیخ سعدی کو نہ تو قنوطی بنایا اور نہ کلبی، بلکہ وہ ایک بےلوث اور بےغرض زندگی گزارنے والے معلّم بن گئے۔ مجھے امید ہے کہ میں نے ان سے یہی سبق سیکھا ہے۔ میرا یقین ہے کہ ہم ایک تبدیلی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ بہت سی قدیم اقدار کی موت واقع ہو رہی ہے، ہمارے چاروں طرح موت اور زوال کے آثار ہیں۔ لیکن نا امیدی کی کوئی وجہ نہیں کیوں کہ بہت سی نئی اقدار وجود میں آ رہی ہیں، زندگی اور نمو کے اشارے بہت نمایاں ہیں۔

اورنگی میں شہر آنے والے دس لاکھ افراد آباد ہیں، جن میں مہاجر، بہاری، پٹھان، پنجابی، بلوچی اور سندھی شامل ہیں۔ یہ بستی ۲۵ سال پہلے آباد ہونا شروع ہوئی اور یہاں ہر سال لوگ پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے دیہی علاقوں سے آ کر آباد ہو رہے ہیں۔ گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت پاکستان میں تبدیلی کا اسی طرح بڑا محرک ہے جیسا انیسویں صدی میں انگلستان میں ہوا تھا۔ اورنگی اور اس قسم کی دوسری کچی آبادیوں میں دیہاتی روایات ترک کی جا رہی ہیں۔ یہاں جاگیر دارانہ حسب مراتب کا وجود نہیں؛ نہ کوئی وڈیرا ہے اور نہ روایات کی پابندی۔

مجھے اورنگی میں آ کر بسنے والوں میں کام کرنے کی وہی تڑپ نظر آئی جو بہتر حالات کی تلاش میں نئے علاقوں میں آنے والے تمام دوسرے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے نہایت بہادری سے اپنی چار بنیادی ضروریات کا قابلِ عمل حل تلاش کر لیا: (۱) مکان کی تعمیر اور سینی ٹیشن (۲) صحت (۳) تعلیم اور (۴) روزگار۔ سرکاری مدد کے بغیر، انھوں نے ایک لاکھ مکانات تعمیر کیے، اور ۶۴ نجی شفاخانے، ۵۰۹ پرائمری اور سیکنڈری اسکول اور گیارہ ہزار سے زیادہ گھریلو کاروبار قائم کیے۔

غیر رسمی کاروباری سیکٹر کی یہ دھماکاخیز ترقی تبدیلی کا دوسرا محرک ہے۔ شہری مہاجرین اورنگی میں، دوسری جگہوں کی طرح، اپنے مکانوں کی تعمیر، صحت، تعلیم اور روزگار کی سہولتوں کے لیے سرکاری اداروں (کے ڈی اے، ایچ بی ایف سی، اور صحت و تعلیم کے سرکاری محکموں) کے بجائے نجی سرمایہ داروں پر بھروسا کرتے ہیں۔ اصل موضوع سے انحراف کرتے ہوئے میں یہ بھی بتادوں کہ اب کراچی میں متوسط طبقہ بھی، جو تیزی سے ترقی کر رہا ہے، اپنی ضروریات اِسی طرح پوری کرتا ہے۔ ان غریب انسانوں کی تکلیف کا تصور کیجیے جن کو زیادہ تر حکومتی اداروں، یعنی

مکان تعمیر کرنے والے سرکاری اداروں، حکومت کے اسپتالوں، اسکولوں یا سرکاری ملازمت کے دفتروں پر بھروسا کرنا پڑتا ہے۔

میں نے شہری مہاجرین کو نہ صرف مہم جُو پایا بلکہ ان کے پاس وسائل کی کمی بھی نہیں۔ ان کی سادہ زندگی، بچت کی عادت اور سرمائے کو صحیح استعمال کرنے کی صلاحیت ان کی حیرت انگیز ترقی کا باعث ہے۔ وہ ہر چیز ـــــ زمین، مکان اور دوسری سہولتیں ـــــ قیمت ادا کر کے خریدتے ہیں، اگرچہ جو قیمت وہ ادا کرتے ہیں، زیادہ تر رشوت اور دلالی کی نذر ہو کر افسروں، سیاسی وڈیروں، دلالوں اور ڈاکوؤں کی جیب میں پہنچ جاتی ہے۔ جو رقم اس طرح حاصل کی جاتی ہے اگر اس کا دس فیصد بھی حکومت کے خزانے میں جمع ہو تو ہماری حکومت کو آئی ایم ایف سے اتنے زیادہ قرضے نہ لینے پڑیں۔

بستی والوں میں انتظامی صلاحیت کی بھی کمی نہیں۔ جب سے او پی پی نے اورنگی میں تکنیکی مشورے فراہم کرنا شروع کیے تب سے تیرہ سال میں گلیوں میں زیرِزمین گندے پانی کی نکاسی کی ۵۲۳۶ پائپ لائن بچھائی گئیں اور ۸۱۳۷۷ گھروں میں فلش لیٹرین، خود ان کے خرچ پر، ان کی زیرِنگرانی تعمیر ہوئے۔ اس کام پر ان لوگوں نے ۶ کروڑ ۳ لاکھ ۹۰ ہزار روپے خرچ کیے۔ اس کے علاوہ ۵۰۹ اسکول ہیں جن میں ۸۰ ہزار لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ اسکول نجی سرمائے سے قائم ہوئے، فیس کی آمدنی سے چل رہے ہیں اور پائیدار ترقی کا حیرت انگیز نمونہ ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں گھریلو کاروباری یونٹوں کو قرض دینے کے لیے اورنگی چیریٹبل ٹرسٹ رجسٹر ہوا۔ ٹرسٹ نے اب تک ۳۵۶۰ چھوٹے گھریلو بیوپاریوں کو ۵ کروڑ ۶۶ لاکھ ۸۰ ہزار روپے قرض دیے ہیں۔ یہ لوگ ۶۳ قسم کے کام کرتے ہیں۔ اب تک اس رقم میں سے ۳ کروڑ ۰۷ لاکھ ۹۰ ہزار روپے اصل اور ۸۷ لاکھ ۳۰ ہزار روپے مارک اپ واپس آ چکے ہیں۔ جن قرضوں کی واپسی کی امید نہیں رہتی، ہر چھ ماہ بعد حساب سے خارج کر دیے جاتے ہیں۔ ان ڈوبے ہوئے قرضوں کا تناسب ۴ء۴ فیصد بنتا ہے۔ مہربان گاہکوں کی ایمانداری کی وجہ سے اب اسکولوں، شفاخانوں اور سینی ٹیشن کی طرح کاروباری قرضوں کا پروگرام بھی خود کفیل ہو چکا ہے۔ یہ گھریلو کاروبار کو تقویت پہنچا رہا ہے اور کاروبار میں اضافے کا سبب ہے۔ یہ گھریلو کاروباری

یونٹ اورنگی میں سب سے زیادہ روزگار فراہم کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ دیہات سے آکر نئی آبادیوں میں بسنے والے مہاجر، جو ایک نئے دور کی علامت ہیں، اکیسویں صدی کے شہری ہیں۔ وہ اپنے آپ کو تباہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ زندہ اور خوش حال رہنا چاہتے ہیں۔ وہ محنتی کارکن اور پیداوار کرنے والے ہیں، مفت خورے یا طفیلی نہیں۔ ان کو بھیک یا خیرات نہیں چاہیے، نہ آسان ملازمت اور نہ مفت مکان۔ جس چیز کی ان کو شدید ضرورت ہے وہ تکنیکی اور معاشرتی رہنمائی، رشوت اور بھتّے سے تحفظ اور امن و امان ہے۔

ایک سابق آئی سی ایس افسر ہونے کی وجہ سے میں شرمندگی اور افسوس سے معترف ہوں کہ میں نے سرکاری اداروں کو عام طور پر اپنی بنیادی ذمےداری یعنی بستی والوں کی مناسب خدمت، ان کی حفاظت اور ان کو مناسب مشورے دینے کے معاملے میں ناکام پایا۔

کچی آبادیوں میں سرکاری ادارے اپنی چوری اور کام چوری کے لیے مشہور ہیں لیکن وہاں بھی مجھے کالے بادلوں میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی۔ تسنیم احمد صدیقی سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے سربراہ ہیں۔ انھوں نے اپنے محکمے سے چوری اور کام چوری کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ سست اور دیوالیہ ادارہ چُست اور مالدار ہو گیا۔ اس ادارے نے کئی کروڑ روپے بستی والوں سے لیز کی مد میں وصول کیے اور پھر بڑے پیمانے پر، اپنے خرچ پر، اپنے زیرِانتظام، ترقی کا کام دسیوں نئی آبادیوں میں شروع کیا، جو بیرونی یا ورلڈ بینک کی امداد یا سرکاری بخشش کے بغیر چل رہا ہے۔

ایک سرکاری ادارے کی اس تجدید سے میری امید بندھتی ہے۔ مغل بادشاہت کا زوال اور خاتمہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج میری پسندیدہ تاریخ ہے۔ اپنے اردگرد جب میں نظر دوڑاتا ہوں تو ناامیدی کے عالم میں میرے سامنے مغل دورِزوال ہوتا ہے۔ سندھ کچی آبادی اتھارٹی کی تیزرفتار اصلاح سے مجھے ایسٹ انڈیا کمپنی کی اصلاح یاد آتی ہے۔ اس میں بھی شروع میں لوٹ کھسوٹ تھی لیکن لارڈ کارنوالس نے اس لُوٹ اور رشوت کو ختم کیا۔ مجھے توقع ہے کہ اِسی قسم کی اصلاح حکومتِ پاکستان میں بھی ممکن ہو گی، کیوں کہ حکومت کے فوجی، سیاسی، عدالتی اور تعلیمی اداروں کا ڈھانچا جو ہندوستان اور پاکستان کو ورثے میں ملا ہے، بےحد جاندار ہے۔ بنیادی طور پر یہ

ان نظاموں سے کسی طرح مختلف نہیں جو ترقی یافتہ ممالک، انگلستان، جرمنی یا جاپان میں رائج ہیں۔ اس کے باوجود کہ ہم نے نظام کو خراب کر دیا ہے، اس کی اصلاح اور تجدید ممکن ہے۔ میں نے کچی آبادی اتھارٹی کی مثال دی، حالاں کہ میں آغاخان میڈیکل یونیورسٹی کی مثال بھی دے سکتا تھا۔ چند سال کے عرصے میں پاکستان کے اندر ایک ایسے ادارے کا قیام ممکن ہوا جو ہر طرح عالمی معیار پر پورا اترتا ہے اور گڑبڑ اور نااہلی کے سمندر میں ایک اچھے نظام اور خوبی کے جزیرے کے طور پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس اور بھی مثالیں ہیں۔

میرا ایمان ہے کہ اصلاح اور تجدید ہی وہ اصل کام ہے جو ہم سب کو اپنے اپنے حلقۂ اثر میں کرنا چاہیے۔ ہم کو اپنی یونیورسٹیاں، آغاخان یونیورسٹی کی طرح، عالمی معیار پر منظم اور اپنے محکمے کچی آبادی اتھارٹی کی طرح چوری اور کام چوری سے پاک کرنے چاہییں۔ ہم کو کچی آبادیوں کے باشندوں کی امداد کرنی چاہیے تاکہ وہ خود اپنے مکانوں، اپنی صحت، اپنے اسکول اور روزگار کے مواقع کو بہتر کر سکیں۔ ہمیں ان کو رشوت سے پاک خدمات اور تحفظ، تکنیکی اور معاشرتی مشورے فراہم کر کے دعا کرنی چاہیے کہ وہ اپنی وافر قوت کو گھریلو کاروبار کو ترقی دینے میں صرف کریں گے نہ کہ ڈاکے ڈالنے میں۔

میری خواہش ہے کہ سوچنے سمجھنے والے پاکستانی اس قسم کے گھریلو کام کی اہمیت کا احساس کریں گے خواہ وہ ان کی نظر میں کتنا ہی غیر اہم اور چھوٹا ہو۔ ابتدا میں ان کو اپنے محلّے میں ایک تنظیم سے آغاز کرنا ہوگا، جیسا میرے دوست سمیع مصطفےٰ نے دوستی اور تحفظ کی خاطر فیروز آباد تھانے کے علاقے میں کیا ہے۔

ہم کو صدر اور وزیر اعظم پاکستان، اقوام متحدہ، یو ایس اے، ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کو مشورے دینے کے بڑھے ہوئے جذبے کو قابو میں رکھنا ہوگا، اور شیخ سعدی کے اس نیک مشورے پر عمل کرنا ہوگا:

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

"کیا تم نے اپنے زمینی گھروں کا سامان درست کر لیا ہے، کہ تم اڑ کر آسمانی اشیا کو درست کرنا چاہتے ہو؟"

ضمیمہ ۱

اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کا تجزیہ

از مشیرِ خاص، یو این سی ایچ ایس

بنام آغا حسن عابدی
نکولس باٹن کی طرف سے
مضمون: بی سی سی آئی کے اورنگی آزمائشی منصوبے نمبر ۲ کی کارکردگی
پاک/۸۲/ایف او ۱

اس خط میں حسبِ ذیل کاغذات آپ کے ملاحظے کے لیے ارسال ہیں:

(الف) اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کا تجزیہ مع منصوبے کی منظور شدہ دستاویز، نمبری این سی او پی پی سیکنڈ فیز، پاک/۸۲/ایف او۔

ان کاغذات میں منصوبے کے اس طریقِ کار کا تجزیہ کیا گیا ہے جو مشیرِ خاص کی آمد کے بعد پچھلے چار ماہ میں اختیار کیا گیا، اور جو مشیر کے خیال میں اصل منصوبے کے طریق کار سے مختلف ہے۔

(ب) تخمینے کے اخراجات اور اصل اخراجات ستمبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء (ڈالر میں)۔

ایک ایسی جدول بھی منسلک ہے جس میں جاری اخراجات کی تفصیل درج ہے جو بیرونی اخراجات کے تخمینے سے، جو منصوبے کے ابتدائی چار ماہ میں ہونے چاہییں تھے، اور جو اصل میں خرچ ہوئے ہیں، مختلف ہے۔

(ج) تخمینے کے اخراجات اور اصل اخراجات، ستمبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء (روپے میں)۔

ایک تقابلی چارٹ جس میں جاری روپے کا خرچ درج ہے، اور تخمینے کا خرچ۔

اورنگی پائلٹ پروجیکٹ اور اس کی منظور شدہ دستاویز کا تجزیہ:

۱۔ اورنگی پائلٹ پروجیکٹ ایک بہت زیادہ شخصی، تحقیقی اور توسیعی کوشش ہے جس کے ذریعے

کم آمدنی والے لوگوں کو کم لاگت تکنیک اور شہری معاشرتی خدمات فراہم کرنا مقصود ہے۔ یہ منصوبہ پوری طرح پابند ہے کہ ڈاکٹر اختر حمید خاں کے خیالات، تخیلاتی پرواز اور مرضی کے مطابق کام کرے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت قابل انسان ہیں اور ان کی شہرت ایک مخلص معاشرتی کارکن کی ہے۔

۲۔ اس منصوبے کی جو بھی تجویز یا طریقِ کار موجود ہے وہ منصوبے کے ڈائریکٹر کے ذہن میں ہے اور وہ اپنے افکار اور ذہنی سیر میں کسی دوسرے کو اس وقت تک شریک نہیں کرتے جب تک ان کے اپنے خیالات مجتمع نہ ہو جائیں۔ وہ ارتقائی انداز سے تلاش اور جستجو کے بعد اپنے فیصلے کرتے اور منصوبے کو نئے راستے پر ڈالتے ہیں، اس لیے یہ منصوبہ کم آمدنی والے علاقوں کی ترقی کے لیے ایک شخصی سفر ہے۔

۳۔ اسی لیے منصوبے میں نہ تو کوئی ہدف ہے اور نہ اس میں ایسے علاقے ہیں جن میں منصوبے کے پروگرام یا وقت کے تعین کے ساتھ ہدف کا فیصلہ کیا جائے۔ کام کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ زیادہ تر تلاش اور تحقیق پر مبنی ہے اور اس میں دوسری جگہوں پر شہری فلاح کا جو کام ہوا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ منصوبے کو اس طرح پر چلایا جا رہا ہے گویا یہ علاقے کے لوگوں سے تعلقات قائم کر کے ان کا ردِ عمل معلوم کرنا چاہتا ہو اور یہ نہ تو کوئی علاقہ چنتا ہے نہ کوئی ایسا ہدف جس کو ناپا جا سکے۔ یہ گویا بغیر کسی قاعدے قانون کے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کا مقصد خدمت ہے۔ اس کا محرک یہ یقین ہے کہ عام آدمیوں کی جبلی قوت کو متحرک کر کے ان میں خود اعتمادی پیدا کی جا سکتی ہے اور پھر وہ حکومتی اداروں کی رشوت، نااہلی اور ماہروں کی کم نظری، بے نیازی اور شیخی سے بے نیاز ہو کر خود اپنا فلاحی کام کر سکیں گے۔ اسی لیے یہ منصوبہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ عوام اپنے مسائل کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، ان میں کتنی صلاحیت ہے اور وہ کون کون سے کام پہلے کرنا چاہتے ہیں، اور پھر ان مسائل کے حل میں ان کی مدد کرتا ہے اور ان کو مشورے فراہم کرتا ہے۔ اگر منصوبے کا کوئی مشورہ یا کام عوام میں مقبول نہیں ہوتا تو اس کو بلا حیل و حجت یا تجزیے کے ختم کر دیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے منصوبہ صرف ان لوگوں کے ساتھ کام کرتا ہے جو منصوبے کے مشوروں پر عمل کرتے ہیں اور اسی وجہ سے کام کے لیے کوئی مخصوص علاقہ نہیں ہو سکتا۔ منصوبے کو توقع ہے کہ آخر میں اس طریقے سے ایک ہم خیال حلقہ کام کے لیے مل جائے گا جہاں لوگ اپنی مدد سے قابلِ تقلید نمونے پیش کریں گے۔ پھر وہی تکنیکی اور معلوماتی ترقی کے مشورے منصوبے میں شامل ہوں گے جو برادری کے لوگوں میں بھی مقبول ہوں۔

مفروضہ یہ ہے کہ ان مشوروں کی مقبولیت زیادہ ترقی اور خودانحصاری کا سبب ہوگی۔

۴۔ جس مفروضے پر منصوبے کی بنیاد ہے اس سے اختلاف ممکن ہے لیکن وہ طریقے جو منصوبے نے استعمال کیے ہیں، کسی تحقیقی ادارے کے لیے مناسب ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سا توسیعی کام جو اب تک ہوا ہے، دل چسپ ہے اور اس کے اچھے نتائج ظاہر ہورہے ہیں اور میرے خیال میں سرکاری فلاحی اداروں کو ان طریقوں پر عمل کرنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر اختر حمید خاں کا کام بے حد جاندار ہے اور اس کام میں ان کو ان کی اپنی قائم کی ہوئی حدود کے مطابق ہر قسم کی امداد ملنی چاہیے۔

۵۔ لیکن یہاں یہ بات بالکل صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ اِس وقت، یو این سی ایچ ایس کے مشیرِ خاص کی آمد کے چار ماہ بعد، یہ توقع کہ اورنگی میں مکمل قابلِ تقلید، شہری بحالی کا وہ منصوبہ وجود میں آئے گا جو منظور شدہ منصوبے کے دستاویز میں درج ہے اور جس میں حکومتِ پاکستان، بی سی سی آئی اور یو این سی ایچ ایس شریک ہیں، تکمیل کی منزل سے بہت دور ہے۔

۶۔ یو این سی ایچ ایس کی توقعات جو منصوبے کی منظور شدہ دستاویز میں درج ہیں، اب تک کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ مشیرِ خاص، جسے اصل میں ایک منتظم ہونا چاہیے، جس کا منصب منظور شدہ دستور العمل میں ڈائریکٹر کے ایک بااختیار مشیر کا ہے، موجودہ منصوبے میں بے اختیار اور بے حیثیت ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کی حیثیت ایک ایسے افسر کی ہے جو حکومت کے شہری محکموں اور منصوبے کے درمیان رابطے کا ایک ذریعہ ہو یا کبھی کبھی اس کو تکنیکی مشوروں میں شرکت کا موقع دیا جاتا ہے، ورنہ وہ صرف ایک دلچسپی لینے والا ناظر ہے۔ بہرحال، منصوبے کے فیصلوں میں اسے بالکل شریک نہیں کیا جاتا۔ ان حالات میں مشیرِ خاص اور ڈائریکٹر کے درمیان جو کچھ بھی طے ہوتا ہے وہ وقتی طور پر ہوتا ہے اور اکثر اس میں تبدیلی ہوجاتی ہے۔ میں یہ بات صاف طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے تعلقات بے حد مہذب اور اچھے ہیں لیکن میرے لیے تقریباً ناممکن ہوگیا ہے کہ کام کا کوئی دستور بناؤں یا زیادہ لیاقت والے مشیر اور ملازم رکھوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منظور شدہ منصوبہ ایک مُردہ دستاویز ہے۔

۷۔ منصوبے کی منظور شدہ دستاویز کا نفاذ ان مفروضوں پر قائم ہے:

* ایک قلیل ہمہ وقتی عملہ جو پاکستانی پیشہ ور ماہروں اور منتظموں اور ان کے مددگاروں پر مشتمل ہو۔ یہ لوگ پروجیکٹ ڈائریکٹر کی نگرانی میں کام کریں گے اور منصوبے کو تکنیکی مشورے فراہم کریں گے، تربیت کا انتظام کریں گے اور تجربوں کو تحریری شکل میں درج کریں گے۔ اس کے علاوہ بیرونی ماہروں کو

جمع کرنا، ان کو کسی خاص کام کے لیے دعوت دینا اور ان کے ساتھ ملکی ماہروں کو شریک کرنا بھی ان کی ذمے داری ہوگی۔

*منصوبے کا ڈھانچا تیار کرنا جس کے تحت چار بنیادی کام کیے جا سکیں:

۔ معاشرتی اور تکنیکی مشوروں کی فراہمی۔

۔ علاقے میں تجربے اور ان پر تجزیاتی رپورٹ۔

۔ تربیت۔

۔ تجزیہ اور کارکردگی کی رپورٹ۔

* ایک مربوط، شہری بحالی کا ترقیاتی منصوبہ اور اس کا قابلِ قبول خاکہ۔

* ایسے علاقے اور برادریوں کی دریافت جہاں کام کی ضرورت ہے۔

کام کا پھیلاؤ، کتنے وقت میں یہ کام ہوگا اور اس میں کیا دشواریاں ہوں گی، یہ سب باتیں، تھوڑی بہت ضروری ترمیم کی گنجائش کے ساتھ، اس دستاویز میں درج ہیں جسے معاہدے کے تمام فریقوں نے منظور کیا تھا۔ او پی پی نے، سوائے معاشرتی اور تکنیکی اعانت کی اُس سرگرمی کے جو وہ شروع سے کر رہی تھی، اوپر لکھے ہوئے کسی کام کو نہیں کیا۔

۸۔ یہ بات واضح ہے کہ کام کے سلسلے میں دو متضاد طریق کار موجود ہیں جن کے درمیان کوئی سمجھوتا بظاہر ناممکن ہے۔ ایک، تلاش اور جستجو پر مبنی جس میں معاشرتی خصوصیات پر زور دیا جاتا ہے اور وقت اور خرچ کی کوئی قید نہیں ہے۔ اور دوسرا، ہدف کے مطابق اور باقاعدہ، جس میں تکنیک اور مہارت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور وقت اور خرچ کا تعین ہوتا ہے۔

۹۔ اس منصوبے میں ابھی تک وہ بنیاد موجود ہے جس کی وجہ سے اس منصوبے کا خاکہ تیار ہوا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ڈاکٹر اختر حمید خاں یہ فیصلہ کریں کہ او پی پی اب آمادہ ہے کہ ایک بہتر تکنیکی منصوبے کو تسلیم کر لے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ بات ان کے طریقے کے مطابق نہیں ہے۔ اس وقت منصوبہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے اور اس نے اپنے راستے کھلے رکھے ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ یو این سی ایچ ایس کے مشیر سے کیا چاہتا ہے اور اس کا یو این سی ایچ ایس کے ساتھ تعاون کے بارے میں کیا فیصلہ ہے۔

۱۰۔ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ یو این سی ایچ ایس کے پاس وہ تمام ماہرانہ

وسائل ہیں جو کسی ایسے بڑے منصوبے کے لیے ضروری ہیں جو کم آمدنی والے شہری علاقے میں کام کرے اور یہ کہ وہ بی سی سی آئی فاؤنڈیشن کے ساتھ قائم رہنے والا اور سودمند رشتہ جوڑنے پر خوشی سے راضی ہے۔ اب چوں کہ بی سی سی آئی فاؤنڈیشن وجود میں آ گیا ہے اس لیے تمام فریق بہتر حالات میں ہیں کہ یہ فیصلہ کریں کہ یو این سی ایچ ایس کس طرح او پی پی کی مناسب مدد کر سکتا ہے اور کس طرح بی سی سی آئی اور یو این سی ایچ ایس، پاکستان میں کم آمدنی والے علاقوں کی حالت بہتر کر سکتے ہیں۔

ضمیمہ ۲

مشیرِ خاص کے تجزیے پر تبصرہ

از ڈائرکٹر او پی پی

۱۔ مسٹر نکولس باٹن اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ستمبر ۱۹۸۲ء سے، جب سے وہ پاکستان آئے ہیں، وہ او پی پی کے کسی کام نہیں آئے اور موجودہ حالت میں بھی وہ او پی پی کے کسی کام نہیں آسکتے۔ اس افسوس ناک نتیجے پر وہ اس لیے پہنچے کہ ان کے خیال میں ڈائریکٹر او پی پی کے کام کا طریقہ "آزاد تلاش اور جستجو پر مبنی ہے جس میں معاشرتی خصوصیات پر زور دیا جاتا ہے اور وقت اور خرچ کی کوئی قید نہیں،" اور مسٹر باٹن اس دوسرے طریقے کے قائل ہیں جس میں "ہدف کا تعین ہوتا ہے اور منصوبہ باقاعدہ ضابطوں کے دائرے میں رہ کر ماہرین کے مشورے سے چلایا جاتا ہے"۔ مسٹر باٹن کے خیال میں یہ دونوں طریقے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے اور چوں کہ ڈائریکٹر او پی پی اپنے طریقے کو تج کر مسٹر باٹن کے طریقے پر چلنے پر آمادہ نہیں، اس لیے مسٹر باٹن سمجھتے ہیں کہ او پی پی میں ان کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مسٹر باٹن کو اصرار ہے کہ دونوں طریقے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے، اور اگر ان کا مطالبہ یہ ہے کہ میں ان کے طریقے کو ایک اطاعت شعار طالب علم کی طرح تسلیم کر لوں، تو پھر میں مسٹر باٹن کے افسوس ناک نتیجے سے بالکل متفق ہوں۔

۲۔ پیرا دس میں مسٹر باٹن نے مشورہ دیا ہے کہ بی سی سی آئی، یو این سی ایچ ایس کے ساتھ ایک نیا معاہدہ کرے۔ گو وہ رحم کھا کر یہ نہیں کہتے کہ ڈائریکٹر او پی پی کو برخاست کر دیا جائے اور او پی پی کا دفتر بند کر دیا جائے بلکہ وہ ڈائریکٹر کو اپنے آزاد، بےقاعدہ اور مذبذب طریقے پر آزاد چھوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر آمادہ ہیں کہ وہ یو این سی ایچ ایس کی طرف سے کم آمدنی والے شہری علاقوں کے لیے ایک بڑا منصوبہ منظم کر سکتے ہیں۔ میں اس تجویز پر کوئی رائے نہیں دینا چاہتا کیوں کہ اس معاملے میں فیصلہ بی سی سی آئی کے صدر کو کرنا ہے۔

۳۔ لیکن میں مسٹر باٹن کے اس عجیب و غریب بیان پر، جو انھوں نے منصوبے کی دستاویز کے بارے میں دیا ہے، اپنی رائے ضرور پیش کروں گا۔ جب منصوبے کا خاکہ تیار ہو رہا تھا تو میں اس میں

شریک تھا اور میری راے اس سمجھوتے کے بارے میں، جو یو این سی ایچ ایس کے ساتھ ہوا، بالکل مختلف ہے۔

۴۔ او پی پی کو بی سی سی آئی نے ۱۹۸۰ء میں قائم کیا۔ جب یو این سی ایچ ایس کا وفد دسمبر ۱۹۸۱ء میں کراچی آیا تو او پی پی کی عمر ۲۱ ماہ ہو چکی تھی۔ اس وقت تک اس کی کارکردگی کی ۹ رپورٹیں شائع ہو چکی تھیں جن میں بار بار بتایا گیا تھا کہ او پی پی ایک تجرباتی، آزاد، تلاش اور جستجو پر مبنی طریقے پر کام کرنے والا ادارہ ہے۔ یہ باتیں ان رپورٹوں میں ہر بار کہی گئی ہیں:

(الف) کہ اس ادارے کا ترقیاتی خاکہ نہیں ہے، کوئی ماسٹر پلان بھی نہیں جسے نافذ کیا جانا ہو۔

(ب) کہ او پی پی ایک غیر سرکاری ادارہ ہے جس کے پاس نہ تو وہ وسائل ہیں اور نہ قوتِ نافذہ کہ وہ سرکاری اداروں کے انداز میں منصوبہ بندی کرے، یا وہ خدمات فراہم کرے جو کے ڈی اے، کے ایم سی یا محکمۂ تعلیم و صحت فراہم کرتے ہیں۔ ایک غیر سرکاری ادارہ حکومتی اداروں کا متوازی ادارہ نہیں بن سکتا، جیسا کہ گورنر سندھ نے فروری ۱۹۸۱ء میں کہا، جب ہم نے او پی پی کا ان سے تعارف کرایا۔

(ج) کہ او پی پی کا اصل کام خود غریبوں میں ایسے اداروں کی تشکیل ہے جو فلاحی اور خود کفیل ہوں۔

(د) کہ او پی پی کی متحرک تحقیق کا مقصد یہ ہے کہ ایسے تکنیکی، معاشرتی اور معاشی نمونے دریافت کیے جائیں جو محلّے کے لوگوں کی معاونت، تنظیم اور خرچ پر چلائے جا سکیں۔

۵۔ جب یو این سی ایچ ایس نے خود اپنی مرضی سے او پی پی کے ساتھ مل کر کام کرنے کا فیصلہ کیا تو ہم کو یقین ہو گیا کہ وفد نے ہماری تمام رپورٹیں پڑھنے اور ہمارے علاقے کا دورہ کرنے کے بعد ہمارے طریقے کو پسند کر لیا ہے۔ میں مسٹر باٹن کے اس خیال سے متفق نہیں ہو سکتا کہ جب ہم نے یو این سی ایچ ایس کے معاہدے پر دستخط کر دیے تو ہم نے ان کو قوتِ نافذہ تسلیم کر لیا؛ اور یہ کہ ہم نے اپنا منصوبہ بندی کا اختیار تج دیا اور اپنے پرانے طریقے کو چھوڑ کر متعین ہدف والے طریقے کو اپنا لیا اور مشیرِ خاص کو نگرانی کے فرائض سونپ دیے؛ اور یہ کہ ہم نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ او پی پی فیز دو غیر سرکاری، تجرباتی ادارہ نہیں رہے گا، بلکہ وہ اورنگی میں ایک شہری آبادکاری کے نمونے کا مربوط سرکاری منصوبہ ہو گا۔ گویا ان کے خیال میں ہم نے خود پرانی او پی پی کے موت کے پروانے پر دستخط کر دیے اور او پی پی کو ایک چھوٹا سا کے ایم سی بنا دیا۔ ہم یہ کیسے کر سکتے ہیں؟

۶۔ شہری آبادکاری کا متعین ہدف والا، مربوط طریق کار کسی سرکاری ادارے، مثلاً کے ڈی اے یا

کے ایم سی، کے لیے تو موزوں ہو سکتا ہے ــــ حالاں کہ کچی آبادیوں میں ان خطوط پر کی جانے والی پچھلی تمام کوششیں ناکام ہوئی ہیں۔ اس قسم کے منصوبوں کے لیے بہت زیادہ رقم کی ضرورت ہوتی ہے (صرف ۲۰ لاکھ ڈالر نہیں بلکہ کروڑوں ڈالر)، اور اس کے علاوہ قوتِ نافذہ بھی درکار ہوتی ہے، اور یہ دونوں باتیں کسی غیر سرکاری تنظیم کی استطاعت سے باہر ہیں۔

۷۔ مسٹر باٹن کا یہ دعویٰ کہ یو این سی ایچ ایس، او پی پی کی "انتظامی ایجنسی" ہے، اور وہ مشیرِ خاص، منتظم اور نگراں افسر ہیں، منظور شدہ منصوبے کی حیران کن تشریح ہے، کیوں کہ اس طرح وہ اپنے آپ کو مشیر کی جگہ شعوری طور پر سپر ڈائریکٹر سمجھ رہے ہیں۔ میرا ادراک اس معاہدے کا یہ ہے کہ او پی پی ایک انوکھا پاکستانی منصوبہ ہے جس کی نگرانی ایک بوڑھا تجربہ کار پاکستانی کر رہا ہے۔ یو این سی ایچ ایس کو اس غرض سے دعوت دی گئی ہے کہ وہ او پی پی کو وہ تکنیکی مہارت فراہم کر دے جس کی درخواست کی جائے اور جو ڈائریکٹر او پی پی قبول کرے۔ اس لیے اس بات کی کہیں گنجائش نہیں ہے کہ یو این سی ایچ ایس کو منتظم بنایا جائے یا مشیرِ خاص کو او پی پی کی نگرانی سونپ دی جائے۔

۸۔ مسٹر باٹن نے ان باتوں کی ایک بڑی فہرست پیش کی ہے جو پچھلے چار ماہ میں ٹالی گئیں، یا ان کاموں کی جو نہیں کیے گئے۔ وہ شکایت کرتے ہیں کہ منصوبے کا دفتر نہیں بنا، پاکستانی ماہر ملازم نہیں رکھے گئے، وہ علاقے جہاں کام کرنا ہے اور وہ برادریاں جن کی خدمت مقصود ہے، ان کا تعین نہیں ہوا اور کام کا کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ ان شکایات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستانی ڈائریکٹر کا اصل کام مسٹر باٹن کے کام میں رکاوٹ ڈالنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دفتر کے لیے ایک تین منزلہ عمارت اورنگی میں موجود ہے۔ یہ عمارت نسبتاً تنگ لیکن کار آمد ہے اور اورنگی کے لوگوں کے بالکل قریب واقع ہے جہاں وہ مشوروں، جلسوں اور تربیت کے لیے اکثر آتے ہیں۔ اس عمارت میں ایک کمرہ مشیرِ خاص کے لیے مخصوص ہے، جس میں وہ بہت کم بیٹھتے ہیں۔ زیادہ تر اسٹاف لے لیا گیا ہے اور اس کی تربیت ہو رہی ہے۔ پاکستانی مشیر جو اپنے کام کے ماہر ہیں، مشاورت کے لیے چُنے گئے ہیں۔ کام کا ایک باقاعدہ منصوبہ ہے جو بار بار پرکھ کر بدلا جاتا ہے جیسا کہ رپورٹ نمبر ۱۰، ۱۱، ۱۲ میں درج ہے کہ معاشرتی اور طبعی انجنیئرنگ کے شعبوں میں ایک قابلِ فہم اور قابلِ شمار ترقی ہو رہی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہی سال میں گلیوں میں کم لاگت سینی ٹیشن نظام قائم کرنے کا ایک قابلِ عمل طریقہ سامنے آیا ہے جس کو گلی والے اپنے خرچ پر اپنی زیرِ نگرانی اور او پی پی کے تکنیکی مشورے سے خود تعمیر کریں گے۔ یہ طریقہ ۲۵۰

گلیوں میں قابلِ قبول ہے اور اس کے علاوہ روزانہ او پی پی کے دفتر میں نئی درخواستیں اس کام کے لیے آ رہی ہیں۔ معاشرتی تعاون بڑھایا جا رہا ہے۔ مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کی صلاحیت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور ملاقاتوں کے ذریعے کام کے حلقے کو وسیع کیا جا رہا ہے۔ ایک کھلا ذہن رکھنے والے اور بااداراک بیرونی ناظر کے لیے یہ سارا کام ایک نادر موقع ہے جس میں وہ بہت قریب سے اتنی اہم تبدیلیوں کو بچشمِ خود دیکھ اور سمجھ سکے اور تبدیلی کے اس عمل سے اس کا قریبی رشتہ قائم ہو جائے کہ اورنگی میں معاشرتی اور طبعی مسائل کا حل کیا ہے۔ جیسے جیسے اس کے علم میں اضافہ ہو گا اس کی اپنی اہمیت بڑھے گی۔

۹۔ لیکن مسٹر باٹن کے ساتھ دقت یہ ہے کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہیں جو تیز مزاج بیرونی مشیروں میں پائی جانے والی عام کمزوری ہے۔ ان کا عام طور سے یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس ہر مسئلے کا حل موجود ہے اور یہ کہ ان کو مقامی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی وہ مقامی آدمیوں سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں، بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ منصوبے کا ایک بڑا سا دفتر ہو جہاں بڑی تنخواہ پانے والے بہت سے مقامی کارکن ان کے حکم کے پابند ہوں۔ کراچی میں آمد کے فوراً بعد مسٹر باٹن نے بڑے ٹھنڈے دل سے مجھے بتایا کہ او پی پی کا دفتر کسی بھی پروجیکٹ آفس کے شایان شان نہیں ہے اور نہ او پی پی کا عملہ پروجیکٹ اسٹاف ہے، بلکہ ان کو وہ دادا گیر کہتے ہیں اور یہ کہ ہمارے پاکستانی ماہر مشیر بے اصل ہیں۔ ہمارے کام کا منصوبہ کوئی منصوبہ نہیں اور یہ کہ ہمارا طریقِ کار من موجی پن ہے اور یہ بھی کہ اگر ہم نے غلامانہ انداز میں ان کی ہدایات پر عمل نہیں کیا تو او پی پی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

۱۰۔ اگر یو این سی ایچ ایس کے بھیجے ہوئے ماہر عمومی، متعینہ اور عام طور پر ناکام ہونے والی روایتی تکنیکوں سے پوری طرح مسحور ہیں، اگر وہ تبدیلی لانے والی اختراعی تحقیق اور توسیع کو اپنی کم سمجھی کی وجہ سے سمجھنے سے قاصر ہیں، اگر انھوں نے جان بوجھ کر مقامی ترقیاتی صورت حال سے آنکھیں چرا رکھی ہیں، اور اس سب کے باوجود ان کو انتظام پر قبضہ جمانے کا بھی شوق ہے، تو پھر میرا خیال ہے کہ اورنگی کے لوگوں کو ان سے بہت کم فائدہ ہو گا اور بی سی سی آئی کو اپنے دس لاکھ ڈالر کا بہت تھوڑا اور ناکافی بدل ملے گا۔

۲۰ جنوری ۱۹۸۳ء

کومیلا سے اورنگی تک

اختر حمید خاں کا شمار برصغیر جنوبی ایشیا کے ممتاز ترین سماجی مفکروں اور کارکنوں میں ہوتا ہے۔ ان کی شہرت کی بڑی وجہ ان کا وہ سماجی کام ہے جو سابق مشرقی پاکستان کے شہر کومیلا میں دیہی ترقی کے پروگرام اور کراچی کی سب سے بڑی کچی آبادی میں اورنگی پائلٹ پروجیکٹ جیسے کامیاب منصوبوں کی صورت میں سامنے آیا۔

اختر حمید خاں ۱۵ جولائی ۱۹۱۴ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد انڈین سول سروس میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۴۵ء میں اس سے مستعفی ہوگئے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ جامعہ ملیہ دہلی سے استاد کے طور پر وابستہ ہوئے اور تین سال پڑھاتے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ پاکستان چلے آئے اور کومیلا کے وکٹوریہ کالج کے پرنسپل ہوگئے۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے امریکہ کی مشیگن اسٹیٹ یونیورسٹی میں دیہی ترقی کے شعبے میں تربیت حاصل کی اور واپس آکر ۱۹۵۹ء میں کومیلا میں قائم دیہی ترقی کی اکیڈمی کے سربراہ کا عہدہ سنبھالا۔ اس حیثیت سے وہ ۱۹۷۱ء تک کام کرتے رہے جب انھیں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد کراچی آنا پڑا۔ پہلے دو سال وہ زرعی یونیورسٹی لائل پور اور شعبۂ اقتصادیات کراچی یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے اور ۱۹۷۳ء میں وزٹنگ پروفیسر کے طور پر مشیگن اسٹیٹ یونیورسٹی چلے گئے جہاں انھوں نے ۱۹۷۹ء تک پڑھایا۔ پاکستان واپس آکر ۱۹۸۰ء میں اختر حمید خاں نے بی سی سی آئی کے تعاون سے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کی بنیاد رکھی جس نے اب تک ان کی رہنمائی میں متعدد ترقیاتی پروگرام کامیابی سے چلائے ہیں۔ وہ دیہی اور کم آمدنی والے شہری علاقوں میں اپنے منفرد کام کے اعتراف کے طور پر متعدد اعزازات بھی حاصل کر چکے ہیں۔

یہ کتاب اختر حمید خاں کے ان مضامین اور خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنی فکر اور عملی کام کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کے لیے وقتاً فوقتاً تحریر کیے۔ ان تحریروں میں ایسی گہری بصیرت ملتی ہے جو بیسویں صدی میں برصغیر کی بدلتی ہوئی معاشرت اور موجودہ پاکستانی معاشرے کے رجحانات کو سمجھنے میں ہماری مدد کر سکتی ہے۔

Cover design: S M Shahid

ISBN 969-8380-13-2
Rs.120

CITY PRESS